

برگِ خزاں



ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

عرضِ مصنف

برگِ خزاں کی کہانی ایک چوکھی حالاتِ زدگان کا فسانہ ہے۔ یہ ان نادار اور سکتے ہوئے لوگوں کی کہانی ہے جن کی دادرسی کسی نے نہ کی..... جو اپنے ہی نامساعد حالات کا شکار ہو کراڑیاں لاگڑتے رہے۔

ان کے ٹانڈان کا شیرازہ بگڑ گیا۔

یہ ایک ایسے کاروانِ دشت کے بے منزل ہونے کی داستان ہے جس کا پُرساں حال کوئی نہ تھا۔

جابر اور اپنی ظالمانہ ہٹ پر قائم رہنے والوں کے بھیا تک چہرے..... جو معصوم مجبور اور بے کس لوگوں کو صرف اور صرف اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتے تھے۔

ظلم کی ان زنجیروں کو توڑنے والے دو مسیحاؤں کی کہانی..... جب انہوں نے ان کچلے ہوئے لوگوں کی دادرسی کرنا چاہی تو ان کے لئے عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔

مہم جوئی، سنسنی خیز اور پے در پے، پل بہ پل بدلتی یہ داستانِ دراز یقیناً اپنا آپ منوانے کی کوشش کرے گی۔

آخر میں میں اپنے قارئینِ کرام کا مشکور ہوں جنہوں نے علی میاں پہلی کیشنز سے چھپنے والی میری پہلی کتاب ”بے پتوار“ کو پسند کیا اور مجھے نئی کتاب لانے کی جسارت بخشی..... بہت شکریہ!

خیر اندیش

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

تپتی ہوئی ریت پر پڑے ایک اونٹ کے پنجر کے قریب مردار خور گدھ پھدک پھدک کر آپس میں لڑ رہے تھے، سورج آگ برسا رہا تھا، جلنے سورج کی پُریش روشنی سے ریت آتشیں ذرات کی مانند آنکھوں میں چھ رہی تھی۔ پینتالیس سالہ سائیں بخش آنکھوں پر اپنے ایک ہاتھ کا چھبنا بنائے حدنگاہ تک پھیلے ہوئے تھر کے لق ودق صحرا کو دیکھنے میں مصروف تھا، وہ شاید راستے کا تعین کرنا چاہتا تھا، اس کے عقب میں ایک عارضی پڑاؤ نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک بد حال کارواں تھا، یہ لوگ تھر کی اس سرزمین بھاگل پور کے باشندے تھے جو عمر کوٹ ہی کا ایک چھوٹا سا دیہات تھا، پچھلے کچھ عرصے سے اس خطے میں بڑا جان لیوا قحط پڑا تھا، جس کا سبب برسات کا نہ ہونا تھا اور جس سے پورا خطہ مسلسل خشک سالی کا شکار رہتا چلا آ رہا تھا۔ بھوک، پیاس نے مردار خور گدھوں کی طرح ڈیرے ڈال لئے تھے اور انسان کیا مرد، عورتیں اور بچے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر لب تر ساں وا کئے بڑے کرب ناک انداز میں موت کو گلے لگا رہے تھے کہ ان کی حالت دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے، انسان جانوروں کی طرح مر رہے تھے اور جانوروں کی اموات کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا، ریت پر جا بجا ایسے بھیاںک مناظر نکھرے ہوئے تھے، تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر جانوروں کے ادھڑے ہوئے پنجروں کے سچ کبھی کسی انسان کا ڈھانچہ بھی نظر آ جاتا۔ کسی نے درست ہی کہا ہے مصیبتیں زیادہ تر غریبوں کو بھگتنا پڑتی ہیں اور چاروں طرف سے حملہ آور ہوتی ہیں، خشک سالی اور قحط زدگی نے کیا ڈیرے ڈالے کہ وبائی امراض بھی پھوٹ پڑے گیسٹرو، ہیپاٹائٹس تو تھے ہی ان میں ایک اور بُرا سرا رہا بیماری بھی پھوٹ پڑی تھی جس کی اس صحرائی خطے میں بڑی دہشت پائی جاتی تھی، اس میں سکے برابر سر کی جلد پر سفیدی مائل دھبہ سا ابھرتا تھا جو کھوپڑی تک کو گھلا کر دماغ میں ایک خطرناک زخم کی صورت میں اتر جاتا تھا اور انسان مردے سے بھی بدتر زندگی گزارنے لگتا تھا۔

مکہ صحت اس ضمن میں اپنے مقدور بھراقتادات میں مصروف تھا اور کئی سرکاری وغیر

”نہیں چاچا!..... راستہ بھلا ہم کیسے بھول سکتے ہیں، میں تو امدادی ٹیموں کے خیمے کھوجنے کی کوشش کر رہا تھا۔“ سائیں بخش نے بے کیف لہجے میں اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

مٹھل کے جھریوں بھرے چہرے پر بے کسی اور پریشانی کے آثار تھے، وہ میر کاروں کے بیزار کن جواب پر واپس اپنے خیمے کی طرف بڑھا۔ تین سالخورہ سی چار پائیوں کو مثلث کے انداز میں آمنے سامنے کھڑا کر کے اس پر میلی چادریں اور رلیاں ڈال کر جھونپڑی نما خیمہ سا بنایا گیا تھا، وہ اس خیمے کے اندر آ گیا، گرم پتی ہوئی ریت پر پھٹی پرانی اور بوسیدہ سی دری بچھی ہوئی تھی جس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چار افراد بیٹھے تھے، ان میں ایک عمر رسیدہ عورت مائی عجیباں، مٹھل کی بیوی تھی، دوسرا ایک سانولی رنگت کا مگر پُر وجہہ نوجوان سارنگ تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک نوخیز دو شیزہ ملوکاں تھی جو سارنگ کی چھوٹی بہن تھی، ماں اور بیٹی نے خالصتاً مقامی لباس زیب تن کر رکھا تھا، میلا چیکٹ اور پوند زدہ رنگ دار لاچا اور آدھی تنگ آستنیوں والی پیلی کرتیاں..... سانولی کلائیوں سے کہنیوں تک سفید پلاسٹک کے کڑے چڑھے ہوئے تھے جو بادی النظر میں ہاتھی دانت کے پئے نظر آ رہے تھے۔ ناک میں ابلق اور کانوں کی دونوں کن پڑیاں (لوئیں) چھدی ہوئی تھیں جن میں چاندی کی چھوٹی چھوٹی بالیں جھنجھنا رہی تھیں، پیروں میں ریت سے اٹے ہوئے کھسے نما پرانے جوتے تھے، دونوں ماں بیٹیاں دبے دبے نقوش کی حامل تھیں البتہ نوجوان سارنگ نے گھیر دار شلوار اور اوپر صدری (واسکٹ) ڈال رکھی تھی، اس کے دونوں کانوں کی لوہوں سے چھلے نما بالیاں جھول رہی تھیں، اس کے نقوش اگرچہ موٹے تھے مگر ان میں ایک خاص قسم کی مردانہ جاذبیت تھی، اس کی عمر بمشکل چوبیس سال رہی ہوگی، ان لوگوں کے چہرے بری طرح ستے ہوئے تھے اور ہنوں پر سفید سفید خشک پیٹریاں جمی ہوئی تھیں۔

”کیا کہہ رہا ہے بابا!..... یہ اڑاں سائیں بخش..... کیا راستہ بھول گیا ہے؟“ نوجوان سارنگ نے اپنے بوڑھے باپ مٹھل کو منہ لٹکائے اندر داخل ہوتے دیکھ کر پوچھا۔ مٹھل ٹوٹے ٹوٹے انداز میں ایک کونے میں نڈھال سایہ بٹھا ہوا بولا۔

”راستہ تو نہیں بھولا پر کچھ پریشان نظر آتا ہے، کہہ رہا تھا کہ مدد کرنے والی ٹیموں کو ڈھونڈ رہا ہوں۔“

باپ کی بات سن کر نوجوان سارنگ کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری اور پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔

سرکاری طبی وغیر طبی تنظیمیں اور حقوق انسانی کی فلاحی تنظیمیں بھی مصروف عمل تھیں مگر باوجود ان سب کاوشوں کے حالات قابو میں نہیں آ رہے تھے، ادویات اور خوراک کی ترسیل آبادی کے لحاظ سے کم ہی نہیں بلکہ استہزائیہ حد تک ناکافی تھی۔ بہر طور ایک بھیانک مذاق کے طور پر ان نادار اور قحط زدگان کی امداد کے نام پر خانہ پُری کی جا رہی تھی۔

اس لئے بچے کارواں کا پینتالیس سالہ سالار سائیں بخش اپنی تربیت کے جلتے اہلے ذرات سے چند ہیائی آنکھوں پر اپنے ایک ہاتھ کا جھجکا بنائے حد نگاہ تک پھیلے ہوئے تھر کے جلتے سلگتے صحرا کو دیکھنے میں مصروف تھا، وہ شاید راستے کے تعین کے ساتھ کسی امدادی کیمپ یا موبائل کیڈر ایکپ کا بھی متلاشی تھا کیونکہ اس کے اندازے کے مطابق کل 9 گھرانوں پر مشتمل اس کارواں کے پاس امدادی ٹیموں یا ہیلی کاپٹروں سے پھینکا ہوا سامان ختم ہونے کو تھا اور ان کی منزل ہنوز دلی دور است کے مصداق ابھی بہت دور تھی، یہ لوگ پتھر کے راستے میر پور خاص پہنچنا چاہتے تھے، 9 گھرانوں پر مشتمل اس قافلے میں صرف عمر کوٹ کے دیہات سے تعلق رکھنے والے لوگ ہی شامل نہ تھے بلکہ ان میں چیلر اور مٹھی کے دو خاندان تھے جبکہ ایک خاندان جھڈو کا تھا، ان میں چار خاندان پتھر تک کے سفر کا ارادہ رکھتے تھے باقی میر پور خاص اور حیدر آباد، ٹنڈوالہ یار جانا چاہتے تھے۔ ادھر سالار کارواں سائیں بخش کی ذمہ داری ان قحط زدگان گھرانوں کو بخیر و عافیت منزل مقصود تک پہنچانا تھا۔ جبکہ موجودہ حالات کی سنگین صورت حال کا اندازہ لگاتے ہوئے اسے اپنا بے غم مصمم متزلزل سا ہوتا محسوس ہو رہا تھا لیکن ہمت اس نے بھی نہیں ہاری تھی، روٹی سے زیادہ اہم مسئلہ اس وقت پانی کا تھا، بوڑوں کو صرف منہ گیلا کرنے کی اجازت تھی جبکہ چھوٹے بچوں کو ایک خاص مقدار میں پانی پلایا جا رہا تھا، ان بچوں میں ایسے معصوم اور لخت جگر بھی تھے جو گیسٹرو (اسہال) جیسی مہلک بیماری کا شکار تھے، بوڑھیوں اور عورتوں کو البتہ چند گھونٹ پانی پینے کی اجازت تھی، سائیں بخش جانتا تھا کہ اس کے پاس راستہ بھٹکنے کی شکل میں صرف موت کا ہی راستہ باقی بچتا تھا، ایک اذیت ناک موت۔ تاہم وہ اپنے کام میں ماہر تھا، وہ تو دن میں اڑتی ریت اور رات میں آسمان پر ٹمٹماتے تاروں کی مدد سے منزل کا پتہ چلا لیتا تھا، وہ اپنے گوٹھ کا کھیا تھا جسے مقامی زبان میں ”چنگا مڑس“ کہا جاتا تھا۔

”سائیں! ہم راستہ تو نہیں بھٹک رہے.....؟“ اچانک سائیں بخش کے کانوں میں ایک نحیف سی آواز ابھری۔ یہ مٹھل تھا، ایک مدقوق سا بوڑھا، جھلسی ہوئی رنگت اور فاقہ زدہ چہرے پر جھریوں کا جال۔

میں دبائے لیے لیے کش لگا رہا تھا، نیسے کا جس زدہ ماحول کثیف ہو رہا تھا، یہ سارنگ کا بڑا شادی شدہ بھائی خالق داد خالق تھا، اس کی جوان العمر بیوی اللہ وسائی اس کے قریب ہی چوڑی مارے بیٹھی اپنی گود میں اپنے ڈیڑھ سالہ بچے منٹھار کو دودھ پلا رہی تھی، وہ خاصی قبول صورت تھی مگر قحط اور بھوک نے اس کے سلونے چہرے کی رعنائی چھین لی تھی۔

وہ بھی علاقائی طرز کا لباس پہنے تھی، اس نے دھیرے سے سر اٹھا کر اپنے دیور سارنگ کی طرف ایک نظر دیکھا پھر وہ اپنے گود کے بچے کو دودھ پلانے لگی۔ ”پانی لینے آیا ہے تو واپس لوٹ جا..... اب تو اپڑیں بالکے منٹھو کا گلیا کپڑا بھی میری زبان کی طرح سوکھ گیا ہے۔“ خالق نے ایک کش لگا کر کہا۔

سارنگ نے کھڑے کھڑے ایک افسردہ سی نظر اپنی بھابی اللہ وسائی اور پھر اس کے بچے پر ڈالی جواب مسلسل روئے جا رہا تھا، اس ننھی سی معصوم جان کو بھی شاید اس اذیت ناکی کا احساس ہو گیا تھا کہ اس کی ماں اپنی زبان کی طرح سوکھی چھاتی اس کے منہ سے لگائے بہلانے کی کوشش کر رہی ہے۔

”میں پانی لاتا ہوں ادا.....!“ سارنگ کا دل بچے اور ماں کی حالت دیکھ کر تڑپ اٹھا تھا، اس لئے بھی شاید وہ ماں اور بچے کی آس بندھا کر واپس جانے لگا تو خالق تو مسخرانہ انداز میں قہقہہ بلند کر کے بولا۔

”اڑے سارو.....! تو کدھر سے پانی لائے گاڑے..... کیا باہر سندھو دریا پھوٹ پڑا ہے یا اس نے سو سال بعد آ پڑا اس راستہ پھیر لیا ہے..... ہا..... ہا.....“

بھوک، افلاس اور ہلاکت آمیز فلاکت نے شاید خالق کو دماغی توازن بگاڑ دیا تھا، سارنگ خاموشی سے باہر آ گیا۔ اسے اپنے بڑے بھائی پر غصہ آ رہا تھا کہ یہ کیسا مرد تھا جو بے فکری سے اندر بیٹھا بیڑی سونت رہا ہے، اس کے سامنے اس کا بچہ دودھ اور پانی کے لیے بلک رہا تھا، سارنگ کو اپنی بھابی اللہ وسائی سے بہت محبت تھی، سارنگ اسے بھابی کی بجائے ادی جیجیل کہہ کر پکارتا تھا، وہ بھی اس کا بہنوں کی طرح خیال رکھتی تھی۔ جب وہ بیاہ کر آئی تھی تو سارنگ کو وہ ماں کے روپ میں محسوس ہوئی تھی، سارنگ کو کبھی اپنی ماں سے پیار نہیں ملا تھا، اسے حق کی شروع سے عادت تھی، یہ بھی اس کے شوہر مٹھل نے لگوائی تھی، سارنگ نے آنکھ کھولتے ہی اپنے ماں، باپ دونوں کو ہی خود سے دور پایا تھا، وہ اس طرح کہ مٹھل اور عجیباں اپنے گوپوں (تھر میں بنی سرکنڈوں کی جھونپڑیاں) سے بہت دور وڈیرے بشام خان کی زمینوں پر ”رہا کی“ (کھیت مزدوری) کرتے تھے اور رات گئے جب لوٹتے تھے تو

”بابا.....! یہ تمہیں ہماری کیا مدد کریں گی، یہ تو دکھاوا کر رہی ہیں، ہمارا پیٹ دکھا کر یہ لوگ چندہ بوز کر ہڑپ کر جاتے ہیں اور کسی ایک قافلے کو دیکھ کر کچے اناج کی ایک بوری پھینک دیتے ہیں، وہ بھی جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی..... ہونہہ.....!“ اس کے جوان مگر تلخ لہجے میں صدیوں کے تجربوں کی پیش تھی۔

”ہاٹ.....! تو صحیح کہتا ہے، پردعا کر ہم کھیریت سے میر پور پہنچ جائیں۔“ مٹھل نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

سارنگ اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر جانے لگا تو اس کی بوڑھی ماں عجیباں نے سوکھے منہ سے پوچھا۔ ”کدھر جا رہا ہے پٹ.....؟“

”ابھی آتا ہوں۔“ کہہ کر سارنگ باہر نکل گیا، اس کے خیمے سے باہر نکلتے ہی مٹھل خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ ”کدھر جائے گا، اپڑیں چاہے سکھو کی کھیریت پوچھنے اور کیا جیسے کھد بڑا مزے میں ہے..... سب جانتا ہوں یہ کیوں بار بار ہمیں چھوڑ کر سکھو کے پاس بھاگتا ہے۔“

”اڑے سارو کے بیو.....! کیوں اپڑیں پٹ سے ساڑ کرتا ہے ڈے بھا سکھو بھی تو آخر تیرا بھرا ہے۔“ مائی عجیباں نے کہا تو مٹھل منہ بسور کر رہ گیا۔

سارنگ اپنے خیمے سے نکل کر چند لمحے کے لیے کھڑا حدنگاہ پھیلے پتے ریگ زار کو دیکھتا رہا، بادِ موسوم کے چھیرٹوں سے اسے اپنا چہرہ جھلستا ہوا محسوس ہو رہا تھا مگر وہ اس کی پروا کئے بغیر آگے بڑھ گیا پھر ایک خیمے کے قریب پہنچ کر رک گیا، سورج آگ اگل رہا تھا، سارنگ کا چہرہ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا، اس نے پہلے اپنے کاندھے پر دھری میلی چیٹ اجڑک سے اپنے چہرہ پونچھا، اسی وقت اندر سے کسی نے کھرکھراتی آواز میں پوچھا۔ ”کون ہے ڈے باہر..... اندر کیوں نہیں آتا پڑا ہے نا.....؟“ اکھڑے سے لہجے میں اس آواز پر سارنگ نے غیر محسوس انداز میں تنہی سے اپنے سر کو ہولے سے جھٹکا اور وہیں کھڑے کھڑے با آواز بلند بولا۔ ”میں ہوں ادا سارنگ.....!“

”آ جاڑے پھر باہر کیوں کھڑا ہے عورتوں کی طرح..... کیا بابا نے بلایا ہے میکیوں (مجھے)۔“ وہی ہتھے سے اکھڑی ہوئی آواز دوبارہ ابھری۔ خیمے کے آگے پردے کے طور پر جھولتے رلی کے میلے ٹاٹ کے روزنوں سے شاید سارنگ کو اندر سے دیکھ لیا گیا تھا۔

سارنگ ٹاٹ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا، سامنے گرم ریت والے خیمے کے فرش پر ایک دبلا پتلا اور چھریا سانو جوان شخص آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا کہ بنی سوکھے پتے کی بیڑی مٹھی

خلاف جاتی تھی مگر پھر بھی وہ محکمہ صحت کی طرف سے ہنگامی بنیادوں پر تھر پار کر بھیجی جانے والی سرکاری طبی امدادی ٹیموں میں سے ایک کا انچارج یعنی میڈیکل آفیسر بن کر یہاں آ گیا تھا، اس پانچ رکنی ٹیم میں دو ڈاکٹر، ایک میڈیکل ٹیکنیشن، دو ڈسپنسر تھے، دوسری ایک لیڈی ڈاکٹر لئیٹھ فوہی تھی اور خود ڈاکٹر جواد احمد کے یہاں کام کرنے کی دوسری اہم وجہ یہی تھی۔ یہ دونوں کلاس فیلو تھے، ایک ساتھ ہاؤس جاب کیا تھا اور پھر ایک ہی ساتھ دونوں نے سندھ پبلک سروس کمیشن کے امتحانات پاس کئے، مقابلے کا یہ امتحان پاس کرنے کے بعد ڈاکٹر جواد احمد ایم او اور ڈاکٹر لئیٹھ فوہی نے ڈبلیو ایم او کی حیثیت سے شہر کے ایک بڑے سرکاری ہسپتال میں ڈیوٹی جو ان کی تھی، ڈاکٹر جواد احمد نے اسکن کا دو سالہ کورس بھی کیا تھا، یہ لوگ تھر میں وبائی امراض کے انسداد کے لیے آئے تھے جو یہاں قحط اور خشک سالی کی وجہ سے پھوٹے تھے تاہم ان میں ایک پُر اسرار بیماری کا بھی بہت چرچا تھا، اسہال اور الٹیاں تو یہاں کا معمول تھا ہی مگر ایک پُر اسرار جلدی مرض بھی یہاں پھوٹا تھا جس کی میڈیکل سائنس ہنوز کوئی توجیہ پیش کرنے سے قاصر تھی، اب تک آنے والی طبی ٹیموں نے اس پُر اسرار بیماری کی وجہ کا پتہ چلا لیا تھا جو ان کے خیال کے مطابق گندے جوہر میں نہانے سے لگتی تھی، اس پُر اسرار مرض میں سب سے پہلے سر کی جلد میں زخم کی طرح کا نشان ابھرتا تھا پھر یہی زخم سر کی جلد پھار کر اندر دماغ میں داخل ہو جاتا تھا۔ اگرچہ اس پُر اسرار بیماری کو ہنوز کوئی نام نہیں دیا جاسکا تھا لیکن اسے نینٹس سے ملتے جلتے وائرس کا غیر معروف نام ضرور دیا گیا تھا، ان کے میڈیکل کیمپ کو یہاں لگے آج تیسرا دن تھا اور مریضوں کی کافی اور دوائیوں کی ناکافی تعداد نے اسے ہی نہیں بلکہ پورے امدادی اسٹاف کو خاصا پریشان کر دیا تھا، اکثر پیچیدہ کیمرز شہر کے ہسپتالوں میں بھیج دیئے جاتے تھے، لوگ مر بھی رہے تھے اور مرکز جی بھی رہے تھے اور جو مرکز جی رہے تھے وہ نہ زندوں میں تھے نہ مردوں میں..... بس وہ تھے اور موت کی پروانہ دار جھپٹ تھی۔

یہ میڈیکل کیمپ عمر کوٹ اور جیس آباد کے درمیانی صحرائی گوشوں میں واقع تھا اور ایک کیمپ کے تین حصے کئے گئے تھے۔ دو تو رہائشی حصے تھے جبکہ ایک خاصا بڑا حصہ علاج معالجے کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر لئیٹھ فوہی نے اپنے ساتھ اپنی ایک ہریلو ملازمہ کو بھی ساتھ لائی تھی۔

ڈاکٹر جواد احمد پچیس چھیس سالہ ایک خوب روٹو جوان تھا، وہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا، ڈاکٹر لئیٹھ سرو قد اور خوبصورت لڑکی تھی

تھک کر نڈھال ہو جاتے تھے، ایسے میں اللہ وسائی کی ماں مائی خیر ملل جو عجیباں کی چھوٹی بہن اور سارنگ کی خالہ تھی، سارنگ اور ملوکاں کا بڑی بہنوں کی طرح خیال رکھتی تھی، وہ ان کے ساتھ کھیلا کرتی تھی، سارنگ کی اپنی بھابی اللہ وسائی سے انیسیت کی وجہ یہی تھی اور پھر جب اللہ وسائی اس کی بھابی بن کر گھر آ گئی تو سارنگ اور ملوکاں بہت خوش ہوتے تھے، خیراں اس دوران مرچکی تھی، اللہ وسائی نہ صرف بہت اچھی بیوی اور بہو ہی نہیں تھی بلکہ بھابی بھی تھی مگر خالقو گرم طبیعت کا مالک تھا، خواہ مخواہ ہی اللہ وسائی سے بات بے بات پر جھگڑتا رہتا تھا، مٹھل اور عجیباں نے ساری عمر اپنی بڑیاں لگا کر خود کمایا اور بچوں کو کھلایا تھا، وہ غریب بے چارے یہی سمجھتے تھے کہ شاید ہم بڑھوں کی وجہ سے ان میں روز جھگڑا ہوتا ہے لہذا ان کی خودداری نے یہ گوارا نہ کیا اور خالقو کو الگ گوپہ بنا کر رہنے کا فیصلہ سنا دیا۔ خالقو نے اس کا الٹا مطلب لیا۔ وہ یہ سمجھا تھا کہ ماں باپ اس سے بیزار ہو چکے تھے، ویسے بھی خالقو ایک ہڈ حرام اور نکھو شخص تھا، وہ غصے میں آ کر الگ تو ہو گیا مگر کھانے کے لالے پڑ گئے مجبوراً اس نے مزدوری شروع کی تو اگلے ہی دن ہانپتا ہوا ایک ریتیلے بھٹ پر اوندھے منہ پایا گیا پھر تب سے سارنگ اور ملوکاں تھوڑا بہت اناج اس کے گوپے میں ڈال آتے تھے مگر خالقو بھی ہٹ کا لپکا تھا، اس کی حالت دیکھ کر سارنگ اور ملوکاں کی منت سماجت کرتا پھر مٹھل اور عجیباں اپنے نکھو بیٹے خالقو اور بہو اللہ وسائی کو واپس اپنے گوپے میں لانے کے لیے ان کے پاس گئے بھی تھے مگر خالقو بھی ایک بیلا تھا، وہ نہ گیا تاہم پھر آہستہ آہستہ خالقو بھی کام پر جانے لگا پھر بھی وہ اتنا کام نہیں کرتا تھا جتنا اسے کرنا چاہئے تھا۔

یہی سبب تھا کہ سارنگ کو آج اپنی بھابی بلکہ ادی نیچل کو اس حالت میں اس کے بیٹے سمیت دیکھ کر سخت دکھ ہو رہا تھا، وہ جب خیمے سے نکلا تو اللہ وسائی نے پڑمرہ چہرہ اٹھا کر ایک آس بھری نگاہ اس پر ڈالی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ ”ادا سارنگ.....! تیرا بھائی خالقو تو پہلے ہی کسی کام کا نہیں رہا تو ہی کچھ کر۔“

سارنگ کو ایک خیال سوچھا، وہ جلدی سے دو خیمے چھوڑ کر ایک میں داخل ہو گیا، اسے پوری امید تھی کہ یہاں اسے پانی کے چند گھونٹ نہیں تو گیلہا کپڑا ضرور مل جائے گا۔

☆=====☆=====☆

کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس جلتے سلگتے اور آگ برساتے لق و دق صحرا میں ایک پل بھی نہ بٹھرتا بلکہ بٹھرتا تو درکنار وہ ادھر کا رخ ہی نہیں کرتا حالانکہ یہ بات اس کے پیشے کے

تاہم اس کے دل میں ڈاکٹر جواد سے کچھ زیادہ ہی نادار مریضوں کی خدمت کا جذبہ موجزن تھا اور وہ تین دن گزر جانے کے باوجود ہنوز بڑی تندہی کے ساتھ مریضوں کی خدمت میں مصروف تھی البتہ ڈاکٹر جواد سخت بیزار نظر آنے لگا تھا۔

”جواد.....! تم تو ہر دوسرا مریض شہر بھیج دیتے ہو، آخر تمہیں مریض کے اندر ایسی کون سی پیچیدگی نظر آتی ہے؟“ ڈاکٹر لئیقہ نے ایک مریض کی میڈیکل سلف پر دستخط اور تاریخ ڈالتے ہوئے قریب کھڑے ڈاکٹر جواد سے کہا۔

جواد نے اپنے ہاتھ میں پکڑے اسٹیتھو اسکوپ کو گلے میں ڈال کر کہا۔ ”اوہو بھی..... اس مریض کے گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے، اسے ایک قیمتی اینٹی بائیونک دوا کی ضرورت ہے جو تمہیں معلوم ہے کہ سرکاری ہسپتالوں میں عنقا ہے البتہ شہر کے میڈیکل اسٹوروں سے کوئی فلاجی تنظیم دوا دے تو ٹھیک ہے، اس لیے میں نے اسے شہر کے بڑے ہسپتال روانہ کرنے کا ارادہ کیا ہے۔“

”مگر جواد.....! یہ غریب تو راستے میں ہی دم توڑ دے گا، اس کی حالت تو دیکھو۔“ ڈاکٹر لئیقہ اپنا سفید اپرن درست کرتے ہوئے سامنے پرانے اسٹریچر پر دراز ایک انتہائی خستہ حال مریض کی نبض ٹٹولنے لگی۔ اس مریض کا ایک تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ وہ ایک نوجوان لڑکا تھا، اس کی تو ابھی میس بھی نہیں بھیگی تھیں پھر وہ اپنے ماں، باپ کا اکلوتا بیٹا تھا، اس کے بورھے ماں باپ اور دو جوان بہنیں قریب کھڑے سسک رہے تھے، ڈاکٹر فوزیہ جو فطرتاً نرم اور ہمدرد دل کی تھی، اس نوجوان کو خطرناک حالت میں دیکھ کر کڑھ رہی تھی، اس نے اگرچہ ڈاکٹر جواد کے ایماء پر فائسل ریمارکس میڈیکل سلف میں درج کر دیئے تھے مگر وہ پھر بھی اس نوجوان مریض کو شہر بھیجنے کے حق میں نہیں تھی، اس کے خیال کے مطابق شہر پہنچتے پہنچتے یہ مریض ملک عدم سدھار جائے گا۔

ڈاکٹر لئیقہ فوزیہ اور ڈاکٹر جواد احمد کی گفتگو قریب کھڑے جان بہ لب مریض کے ماں باپ نے بھی سن لی تھی لہذا مریض کی بوڑھی ماں ہاتھ جوڑتے ہوئے ڈاکٹر لئیقہ فوزیہ کے قریب آئی اور پھر اپنی میلی چیکٹ اور دیدہ اجرک کی چادر کو اس کے سامنے پھیلاتے ہوئے گڑگڑا کر بولی۔ ”ڈاکٹر لی صاحبہ.....! میرے بچوے کو بچالو، ہم اسے کدھر شہر لے جائیں، تیرے کو اللہ سائیں کا واسطہ.....!“

اس کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو آگئے، ڈاکٹر لئیقہ فوزیہ کا دل پسج گیا، ڈاکٹر جواد احمد بھی اس کی گریہ و زاری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

”اماں! آپ دعا کرو، اللہ سائیں بہتر کرے گا، ہم کوشش کر رہے ہیں، شفاء اللہ کے ہاتھ میں ہے۔“ ڈاکٹر فوزیہ کو اپنے ہی الفاظ روایتی اور جس زدہ سے لگے لیکن اس نے یہ جملے پورے خلوص کے ساتھ ادا کئے تھے، عورت کو قدرے تسلی ہوئی۔

فوزیہ نے فوراً ڈپنسرا شرف علی کو دواؤں کے بارے میں تفصیلی ہدایت دی۔

”جی بہتر میڈم..... میں ابھی یہ سب چیزیں تیار کرتا ہوں۔“ اشرف نے جواب میں مستعدی سے کہا۔

کیپ قاتوں اور شامیانوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا، صبح ہی سے مریضوں کا رش لگ جاتا تھا، سورج غروب ہونے تک اس میں کوئی کمی نہ آتی، رات گئے تک مریضوں کی چیخ و پکار جاری رہتی تھی، ڈاکٹر جواد کا تو ان تین دنوں میں دماغ جھنجھکا گیا تھا، کچھ مریض ”ان“ بھی کرنے پڑے تھے، ڈاکٹر فوزیہ اور ڈاکٹر جواد تھوڑی دیر کے لیے کیپ کے ایک مختصر سے اندرونی گوشے میں آگئے جو بوقت ضرورت ریٹ روم کے طور مستعمل تھا۔

”جواد.....! تم اس قد بیزار سے کیوں نظر آ رہے ہو، لگتا ہے تمہارے دل و دماغ پر کچھ زیادہ ہی بوجھ سوار ہو رہا ہے۔“ ریٹ روم میں ایک جانب رکھی المونیم کی فولڈنگ چیئر پر بیٹھے ہوئے ڈاکٹر فوزیہ نے ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

جواد بھی ایک کرسی سنبھالتے ہوئے بولا۔ ”ایسی بات نہیں فوزی.....! ہمارا تو پروفیشن ہی ایسا ہے کہ ہمیں ہر دم خدمت انسانیت انجام دینی ہے اور یہ ہمارا فرض بھی ہے لیکن مجھے صرف اس وقت پریشانی ہوتی ہے جب بعض مریضوں کے جذباتی رشتے دار ہماری مجبوری سے شیر نہیں کرتے اور بدتمیزی پر اتر آتے ہیں، کیا تم کل والا واقعہ بھول گئیں فوزی..... کس طرح لعل بخش نامی لڑکا اسماٹ بننے کی کوشش کر رہا تھا، دل تو میرا چاہا تھا کہ اس کمینے کو.....“

”ریلیکس جواد.....! یہ بے چارے لوگ حالات کے ستائے ہوئے ہیں، ان کی دادری بھی نہیں کی جا رہی، ہم تو انہیں خیرات بھی صحیح طریقے سے نہیں دے رہے۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے اسے سمجھایا، جواد بدستور بھنائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ٹھیک ہے یہ تو خدائی آفات ہیں، اب اس میں بھلا ہمارا کیا قصور، ان لوگوں کو ہماری مجبوریاں بھی سمجھنی چاہئیں، اگر ہمارے پاس دواؤں کی ذرا بھی کمی ہو جاتی ہے تو یہی حالات کے ستائے ہوئے مریض کس طرح گلے کو آنے لگتے ہیں اور ہمیں آنکھیں دکھاتے ہیں، یہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ ہم اتنی دور شہر سے گھربار چھوڑ کر ادھر ان کے دکھوں میں شریک ان کی دادری کے

لے آئے ہیں۔“

”اچھا بابا! بحث چھوڑو، یہ بتاؤ پٹنٹ Stable تو ہو جائے گا ناں.....؟“

ڈاکٹر جواد نے فوزیہ کی بات سن کر ایک گہری ہنکاری بھری پھر بولا۔ ”ہاں.....! کچھ امید ہو چلی ہے، میں پھر جا کر دیکھتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ آلمہ سنبھالے باہر چلا گیا اور ڈاکٹر فوزیہ کے نرم لبوں پر محبت بھری مسکراہٹ رقصاں ہو گئی، یوں لگتا تھا جیسے وہ جواد کی فطرت سے واقف ہو، وہ زبان کا کڑوا ضرور تھا مگر دل کا شیریں تھا بس بعض لوگوں کے تلخ رویے کے رد عمل پر وہ بھڑک جایا کرتا تھا معاشرے کو ڈھونڈتا ہوا آیا، ڈاکٹر فوزیہ اسے دیکھ کر ٹھٹکی۔

”مم..... میڈم! جلدی چلیں کیسٹر والے نوجوان مریض کی حالت بہت نازک ہے۔“

ڈاکٹر فوزیہ جلدی سے اپنا اسٹیٹھو اسکوپ سنبھالے ادھر دوڑی۔

☆=====☆=====☆

اندر داخل ہوتے ہی سارنگ کی سب سے پہلے میراں پر نظر پڑی، وہ اپنی اجرک کی چادر کے گیلے کوٹنے کو منہ میں ڈالے چوس رہی تھی۔

اس سے اس کا سلوٹنا حسن کم لایا ہوا تھا، اس کے نفوٹ بڑے معصوم اور صبیح تھے، ایک عجیب سا حسن تھا، سترہ سالہ میراں کے تلخ چہرے پر جو بہر حال سارنگ کے لئے اجنبی نہ تھا۔

”میراں.....! چاچا، چاچی کدھر ہیں؟“ سارنگ نے اس کے ستے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا اور اس سے میراں کی خستہ حالی دیکھ کر اس کا دل کڑھنے لگا۔

”وہ ابھی ابھی باہر گئے ہیں شاید پپ..... پانی لینے۔“ میراں نے پڑمردہ سی آواز میں کہا تو سارنگ کے دل کو گھونسا لگا۔ وہ خود پانی کی آس لئے یہاں آیا تھا، اب کیا کہتا لہذا جب وہ خاموشی سے واپس لوٹنے لگا تو میراں نے اسے جاتے دیکھ کر پکارا۔ ”سس..... سارنگ.....!“

”ہاں! بول.....“ سارنگ ٹھہرا۔

”تنت..... تیرے کو پانی چاہئے، یہ لے میری چادر کا دوسرا کونا بھیگا ہوا ہے۔“

میراں نے اپنی اجرک کا دوسرا کونا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

سارنگ کا جگر چھلنی ہونے لگا، پڑمردگی سے بولا۔ ”نہیں.....! میں ویسے ہی آیا تھا،

چلتا ہوں۔“ وہ باہر آ گیا۔

دھوپ کی شدت اور گرمی سے روزِ محشر کا سا گماں ہو رہا تھا، میراں اس کی چچا زاد تھی، سکھو، سارنگ کا چاچا چاچا لگتا تھا جو میراں کا باپ تھا، نجانے وہ کس خیمے سے پانی کا بندوبست کرنے گیا تھا، یہاں تو سب ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ سارنگ نے وہیں کھڑے کھڑے سوچا کہ وہ کس خیمے کا رخ کرے، اتنے میں اسے اپنا چاچا سکھو آتا نظر آیا، وہ بھی خاصا مضطرب الحال دکھائی دے رہا تھا، اس کے ہاتھ میں ایک بوسیدہ سے کپڑے کا ٹکڑا تھا جو گیلیا تھا، جانے وہ کہاں سے اپنے کپڑے کا کونا گیا کر کے لایا تھا، وہ اسے ہی چوس رہا تھا۔

”اڑے یہ سائیں بخش کدھر ہے چھوڑا.....! ذرا پوچھو تو اب کتنی دور ہے ہماری منزل.....؟“ سکھو نے سارنگ کو دیکھ کر پوچھا۔

سارنگ جواباً بولا۔ ”میں اور بابا، سائیں بخش کے پاس گئے تھے، وہ کہہ رہا تھا منزل زیادہ دور نہیں اب.....“ سارنگ نے نشی کی خاطر دردِ غ گوئی سے کام لیا پھر یکدم پوچھا۔

”چاچا سائیں.....! چاچی کدھر ہے نظر نہیں آ رہی؟“

”اڑے کدھر ہوگی وہ گریب، گئی ہوگی کسی کے پاس اپنی قمیض کا کونا گیلیا کرنے..... اللہ سائیں رحم کرے..... لگتا ہے ادھر ہی ہماری لاشوں کو گدھو نوچ رہے ہوں گے۔“

”نہیں چاچا.....! اللہ سائیں بہتر کرے گا، کیوں ایسی مایوسیوں والی باتیں کرتا ہے، اچھا یہ بتاؤ کس کے خیمے سے کپڑا گیلیا کر کے لایا ہے، وہ میری بھالی کا بچہ ہے ناں منٹھار..... وہ رورہا ہے۔“ سارنگ نے کہا۔

”وہ ہے ناں اپڑاں کریم دادو خیمے چھوڑ کر..... وہاں چلا جا، اس کے پاس تھوڑا بہت پانی ہے..... جا۔“ یہ کہہ کر سائیں سکھو اپنے کپڑے کا گیلیا کونا چوستا ہوا آگے بڑھ گیا۔

سارنگ، کریم دادو کے خیمے کے قریب پہنچ کر زور سے پکارا۔ ”چاچا کریم! تھوڑا پانی تو دے دے..... ایک گود کے بچے کا منہ گیلیا کرنا ہے۔“

”آ جا خود چھو کر اندر..... لے لے پانی.....!“ اندر سے ایک کھردری آواز ابھری۔ سارنگ خوش ہو گیا۔ وہ اندر داخل ہوا تو بے چارہ کریم دادو ایک بڑا سا آب خورا کپڑے اس کا منتظر تھا..... اندر کچھ عورتیں اور بچے بھی تھے۔

سارنگ نے جھکی جھکی نظروں سے قدرے شرمسار لہجے میں کہا۔ ”چاچا.....! رہنے دے، تیرے اپنے بھی تو بیٹا ہے ہوں گے۔“

اس کی بات سن کر پچاسی سالہ بوڑھا کریم دادو فراخ دلی سے بولا۔ ”اڑے کوئی بات

بالوں کی خشکی ہی سمجھی تھی، یہ خارش متواتر محسوس ہوتی رہی تھی بلکہ ایک دن تو وہ بیٹھی مسلسل اپنا سر کھجاری تھی کہ قریب بیٹھے اس کے شوہر خالقو نے قدرے خونخوار لہجے میں تنگ آ کر اس سے کہا تھا۔ ”اڑی.....! تیرے کو یہ سر میں اتنی کھجلی کیوں ہو رہی ہے، کیا ”پین بلا“ تو نہیں چٹ گئی ہے تیرے کو..... یاد رکھنا، اگر یہ بیماری تیرے کو لگی تو میں تجھے گھر سے باہر نکال دوں گا۔“

خالقو کے یہ تنبیہی الفاظ بے چاری اللہ وسائی کے دماغ میں چکرانے لگے اور وہ اس روح فرسا خیال سے ہی لرز اٹھی تھی کہ اگر اسے یہ بیماری ہو گئی تو..... تو کیا اسے قافلے سے نکال دیا جائے گا اور کیا اس کا شوہر خالقو بھی اسے صحرا میں تنہا چھوڑ دے گا، اس کا بچہ منٹھار بھی اس سے چھین لیا جائے گا..... کہاں جائے گی..... اس کا تو دنیا میں خدا اور مجازی خدا کے سوا اور کوئی بھی نہیں ہے۔

”نہیں..... نہیں.....! ایسا نہیں ہوگا۔“ عالم سرا سیمگی میں پریشان کن خیالوں میں گم غیر ارادی طور پر اللہ وسائی کے کپکپاتے لبوں سے نکلا اور اس کے پیچھے کھڑی عورتوں نے بیزاری سے اسے گھورتے ہوئے جھڑکا۔

”اڑی کیا ہوا..... پاگل ہو گئی ہے کیا.....؟“ اور اللہ وسائی چپ ہو کر کھڑی ہو گئی۔ قافلے کے ایک ایک فرد کا بغور معائنہ کرنے والے وہ دونوں مرد اور عورت یعنی حضور بخش اور مائی حنیفاں تجربہ کار تھے، وہ نصف سے زیادہ لوگوں کو جھکا جھکا کر ان کے سر اور بالوں کا معائنہ کر چکے تھے مگر ابھی تک ”پین بلا“ جیسا مرض انہیں کسی کے سر میں نہیں نظر آیا تھا معاً جب مائی حنیفاں گھبرائی گھبرائی اللہ وسائی کو جھکا کر اس کا سر جوئیں دیکھنے کے انداز میں بال ادھر ادھر ہٹا کر دیکھنے لگی تو اچانک مائی حنیفاں سیدھی ہو کر زور سے چلائی۔ ”اس چھو کر ”پین بلا“ ہے۔“

☆=====☆

جونو جوان مریض شدید قسم کے اسہال کا شکار تھا، اس کا نام رموتھا۔ اشرف نے جیسے ہی ڈاکٹر فوزیہ کو مریض کی بگڑتی ہوئی طبیعت کے بارے میں بتایا تو ڈاکٹر فوزیہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی، ڈاکٹر جواد، مریض رمو کو مصنوعی تنفس دینے کی کوشش کر رہا تھا، رمو کے بوڑھے ماں، باپ اور دیگر عزیز دھائیں مار مار کر رو رہے تھے، رمو بالکل باتمہ، پیر چھوڑ چکا تھا، ڈاکٹر فوزیہ بھی ڈاکٹر جواد کی مدد کو پہنچی، اس نے ایک معالج کی حیثیت سے اپنے چہرے

ہے بلکہ یہ خطرناک بیماری ہے، جس سے تم سب لوگ اچھی طرح واقف ہو..... یہ بیماری کیونکہ فوری طور پر ایک سے دوسرے کو لگ جاتی ہے اسی لئے میں ہی نہیں بلکہ تم لوگ بھی چاہو گے کہ جس عورت یا مرد کو یہ بیماری ہو، اس کے ہمارے قافلے سے جدا ہونے میں ہی سب کی بہتری ہے..... یہ بیماری سر کی جلد کا وہ ناسور ہے، جو رفتہ رفتہ دماغ میں اتر کر انسان کو مفلوج کر کے رکھ دیتی ہے..... اس بیماری کو ہم نے مقامی زبان میں ”پین بلا“ کا نام دیا ہے۔“ میر کارواں سائیں بخش کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ اچانک لوگوں میں کھلبلی سی مچ گئی اور وہ حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ایک دوسرے کا منہ تکتے لگے۔

”میرے اپنے بیوی، بچے بھی اسی قافلے میں شامل ہیں اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر خدا نخواستہ ان میں سے کسی کو بھی یہ بیماری ہوئی تو میں اسے بھی قافلے سے نکال باہر کروں گا۔“ سائیں بخش کی آواز میں عجیب سا ارتعاش پیدا ہونے لگا تھا۔ ”بھائیو اور بہنو.....! تم لوگ یقیناً میرا ساتھ دو گے اور اپنی بھلائی چاہو گے لہذا اب براہ منہ بانی تم لوگ اپنی اپنی جگہوں پر خاموش کھڑے رہو تا کہ سب لوگوں کا ایک بار پھر معائنہ ہو سکے۔“ اتنا کہہ کر میر کارواں نے اپنے ساتھ کھڑے ایک ہم عمر شخص اور ایک عورت کو اشارہ کیا پھر مرد نے مردوں کی قطار کا رخ کیا اور عورت، عورتوں اور بچوں والی قطاروں کی طرف بڑھ گئی..... قافلے کے لوگ دم بخود ہو کر کھڑے تھے۔ معائنہ کرنے والے مرد کا نام حضور بخش اور عورت کا نام مائی حنیفاں تھا..... یہ لوگ قطار میں کھڑے ایک ایک شخص کو جھکا کر اس کے سر اور بالوں کا معائنہ کرنے لگے۔ ماحول پر ایک عجیب سا سناٹا چھا گیا..... ہر کوئی اپنی جگہ خوف زدہ تھا کہ کہیں اس کے خاندان کے کسی فرد کو یہ منحوس بیماری نہ ہو ورنہ سب کو اس کے ساتھ ہی قافلے سے خارج ہونا پڑتا۔ ظاہر ہے اس بد نصیب کو تنہا تو اس جلتے سگلتے صحرا میں نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ معائنہ جاری تھا، دونوں عمر رسیدہ بھائیوں مٹھل اور سکھیو کا خاندان بھی قطار میں شامل تھا، مٹھل کا بڑا بیٹا خالقو، اس کی بیوی اللہ وسائی بھی کھڑی تھی، اس کی گود میں دودھ پیتا ننھا منٹھار ہمک رہا تھا، سارنگ بھی موجود تھا، میراں بھی عورتوں والی قطار میں کھڑی تھی۔ وہ مرد بالخصوص عورتیں سخت خوف زدہ تھیں، جنہیں ذرا بھی اپنے سر میں خارش محسوس ہو رہی تھی مگر انہوں نے اس خارش کو مٹی، گرد یا جوں وغیرہ کی کارستانی سے زیادہ اہمیت نہ دی تھی مگر اب انہیں اس دہشت ناک اندیشے نے آیا تھا کہ کہیں وہ اس پُر اسرار مرض ”پین بلا“ کا شکار تو نہیں ہیں۔ سب سے زیادہ حالت اللہ وسائی کی غیر ہو رہی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پچھلے کافی روز سے اپنے سر کی جلد میں خارش محسوس کر رہی تھی مگر وہ اسے

ڈاکٹر جو اپنے دل کے پیچھو لے پھوڑ رہا تھا۔ پھر وہ حتیٰ لچے میں بولا۔ ”میں اب میڈیکل کیمپ کو اسٹنڈ اپ کروادوں گا اور سیکرٹری بیسٹ کو ایک لیٹر لکھوں گا کہ وہ اگر ہمیں ان دور دراز علاقوں میں بھیج رہے ہیں تو ہماری سیکورٹی کا بھی بندوبست کرے۔“ اس کی بات سن کر فوزیہ چپ رہی۔

پھر خاصی دیر بعد شور شرابہ تھا اور ڈپنٹر اشرف نے آکر بتایا کہ صورت حال قابو میں ہے اور باہر دوسرے لوگوں نے متونی مریض کے لواحقین کو سمجھا بھگا کر لاش انہیں دفنانے کے لئے آمادہ کر لیا ہے۔ اس اطلاع پر ڈاکٹر جواد احمد اور ڈاکٹر فوزیہ نے بے اختیار گہری اور طمانیت بھری سانس لی۔

پھر خیمے درست کئے گئے، جو سامان اور طبی آلات اس طوفان بدتمیزی کا شکار ہو گئے تھے، انہیں درست جگہوں پر سیٹ کیا گیا، مریض دیکھنے کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوا مگر اب ڈاکٹر جواد نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا اور فوزیہ کو بھی ذرا تھکن اتارنے کی غرض سے ریٹ روم میں ہی اپنے ساتھ بیٹھ رہنے دیا۔ اس تلخ اور ناخوشگوار واقعہ نے دونوں کو اعصابی طور پر سخت مضطرب کر دیا تھا، اب باہر کیمپ میں مریض دیکھنے کا فریضہ پیرامیڈیکل اسٹاف ہی انجام دے رہا تھا اور ڈاکٹر جواد کی طرف سے حتیٰ سے ہدایت کی گئی تھی کہ کوئی بھی سیریس کیس ڈیل کرنے کی بجائے اسے موبائل امدادی ٹیم کی طرف بھیج دیا جائے۔

رفتہ رفتہ مریضوں کا رش کم ہونے لگا، صحرا میں شام اترنے لگی، حدنگاہ تک ریتیلے ٹیلے نظر آرہے تھے، ڈاکٹر فوزیہ لطیف مزاج کی لڑکی تھی، ڈاکٹر جواد کی طرح وہ بیزار بیزار سی نہیں رہتی تھی بلکہ وہ کھٹن سے کھٹن لمحات میں بھی خوشی کا کوئی لمحہ ضرور نکال لیتی تھی۔

ڈاکٹر فوزیہ کا یہ روز کا معمول تھا، صحرا میں شام اترتے ہی وہ دور صحرائی ٹیلوں کے عقب میں سورج کے گولے کو لڑھکتا ہوا دیکھنا نہیں بھولتی تھی، ریت کے سمندر میں غروب آفتاب کا منظر اسے بڑا بھاتا تھا مگر آج کے ناخوشگوار واقعے نے ڈاکٹر جواد کا موڈ بالکل خراب کر دیا تھا، اس لئے وہ کیمپ کے عقب میں بنے ریٹ روم میں آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گیا جبکہ ڈاکٹر فوزیہ حسب معمول کیمپ کے چھپرے تلے ریت پر فولڈنگ چیر ڈالے بیٹھ گئی۔ دور مغرب میں سورج کا آتشیں گولہ ریتیلے ٹیلوں کے پیچھے دھیرے دھیرے لڑھکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، فضا میں اب گرمی اور جس کی شدت بتدریج کم ہونے لگی تھی، ڈاکٹر فوزیہ کو تھرا کا یہ ریگستانی علاقہ بہت اچل کرتا تھا جو دن بھر باپ کی شفقت کی طرح گرم جوش اور رات میں ماں کی طرح ٹھنڈی آغوش میں بدل جاتا تھا، فضا میں اب بادِ سموم کی جگہ ہلکی ہلکی

کے تاثرات پر قابو پار کھا تھا اور متعلقین کو خاموش رہنے کی تلقین کر رہی تھی مگر وہاں تو جاں بہ لب مریض کے گرد دوسرے لوگوں کا بھی جھوم جمع ہو گیا تھا۔

ایسی صورت حال اچھے بھلے ڈاکٹروں کو بھی گھبرا کر رکھ دیتی تھی۔ یہی حال فوزیہ اور جواد کا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اگر یہ مریض چل بسا تو انہیں ایک بار پھر ایک تلخ تجربے سے گزرنا پڑے گا بلکہ ڈاکٹر فوزیہ اب یچھٹانے لگی تھی کہ کاش وہ اس مریض کو شہر میں روانہ کر دیتی، اسے ڈاکٹر جواد کی بات رد نہیں کرنی چاہئے لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ فوزیہ نے اسے بچانے کی ایک آخری کوشش کے طور پر ہی شہر نہیں روانہ کیا تھا کیونکہ اس بات کا صاف مطلب موت تھا..... شہر کا ہسپتال یہاں سے میلوں دور تھا۔ بہر طور ان لوگوں نے اپنے تئیں رمو کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود..... مریض کے دن پورے ہو چکے تھے، وہ اپنی زندگی کی گھڑیاں گن چکا تھا۔

رمو کی جواں مرگ پروہاں کبرام مچ گیا، ماں اپنا سینہ پیٹی غش کھا کر گر گئی، ڈاکٹر جواد اور ڈاکٹر فوزیہ کے چہروں پر دکھ سے زیادہ پریشانی کے تاثرات ابھر آئے تھے، مریض کے لواحقین نے اچھا خاص ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

”تم..... تم لوگوں نے رمو گرہیب کو شہر کیوں نہیں بھیجے کا بندوبست کیا۔“

”تم لوگ قاتل ہو، مدد کے نام پر امداد کی رقم ہڑپ کرتے ہو۔“ غرض ہر کوئی اپنی اپنی بولی بول رہا تھا۔ پیرامیڈیکل اسٹاف سے بھی لوگ الجھ گئے، لوگوں نے مشتعل ہو کر کیمپ کے تنبو گرا دیئے تھے، ڈاکٹر جواد ان سے الجھ گیا مگر ڈاکٹر فوزیہ اسے گھٹیت کر پرے لے گئی تھی پھر مریضوں ہی میں سے دوسرے ذرا سلجھے ہوئے لوگوں نے مشتعل لوگوں کو سمجھایا بھجایا، وہ خاموش تو ہو گئے تھے مگر لاش اٹھانے کے لیے تیار نہ تھے، وہ اب مطالبہ کر رہے تھے کہ اس کے کفن دفن کا بھی کیمپ والوں کو بندوبست کرنا پڑے گا۔

”بھگت لیاناں تم نے انسانی ہمدردی کا نتیجہ.....!“ ڈاکٹر جواد نے زچ ہو کر ڈاکٹر فوزیہ سے کہا۔

وہ کمزور سی آوازی میں بولی۔ ”میں نے تو اسے بچانے کے لیے ایسا کیا تھا۔“

”محترمہ مدلیقہ فوزیہ صاحبہ.....! جس کی موت خدا نے لکھ دی ہو، اسے ڈاکٹروں کی پوری ٹیم بھی نہیں بچا سکتی، تم نے بلاوجہ مصیبت اپنے گلے میں ڈال لی، مجھے دور دراز کے دیہاتوں کی سرکاری ڈپنٹریوں کا خاصا تجربہ ہے، ان کا کوئی مریض اگر مر جاتا ہے تو یہ لوگ ڈاکٹر کو ڈرا دھکا کر اس سے ایک خفیہ رقم کی صورت میں ہر جانہ تک طلب کر لیتے ہیں۔“

فرحت بخش ہوانے لے لی تھی۔

موسیٰ نے کھانا بنادیا تھا اور اب لیموں کے شربت کے دو گلاس لئے ایک ڈاکٹر فوزیہ کو دوسرا اپنے ہاتھ میں لے کر برابر کی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

”موسیٰ! تم یہاں آکر پریشان تو ہو گئی ہو گی؟“ ڈاکٹر فوزیہ نے لیموں کے شربت کے چند فرخت بخش گھونٹ لے کر اپنی ذاتی ملازمہ سے پوچھا تو موسیٰ مہربان لہجے میں بولی۔

”نہیں بیٹی..... میں تو یہاں بہت خوش ہوں۔“

”مگر موسیٰ..... تمہیں یہاں اضافی کام جو کرنا پڑ رہا ہے۔“

”کوئی بات نہیں..... یہ بھی ثواب ہی کا کام ہے، مجھے تو بس تمہارے مئی، ڈیڈی کی فکر ستر رہی ہے، وہ ضرور تمہاری وجہ سے پریشان ہو رہے ہوں گے۔“ موسیٰ نے کہا پھر پوچھا۔ ”ویسے بیٹی! ہمیں اور کتنے روز یہاں مزید رکنا پڑے گا؟“

”بس بیٹھے کا ٹور تھا، دو دن بعد نیکلز اوین یا ایمبولینس لے جائے گی ہمیں یہاں سے۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے جواب دیا۔ ابھی ڈاکٹر فوزیہ نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک اسے سامنے دو دریت سی اڑتی ہوئی نظر آئی پھر ذرا ہی دیر بعد ریت کے گولوں سے ایک لینڈ کروزر نمودار ہوئی اور کیمپ کے بالکل قریب آکر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ڈاکٹر فوزیہ قدرے ٹھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ لینڈ کروزر سفید رنگ کی تھی، جس میں سے چار پانچ لمبے تزنگے اور گھٹی موٹھوں والے اجرک پوش افراد اترے، ان میں ایک منحنی سی جسامت کا شخص بھی تھا، اس کی رنگت جھلسی ہوئی تھی، وہ جلدی سے ڈاکٹر فوزیہ کی طرف بڑھا اور بہ غلٹ پوچھا۔ ”کیا آپ لیڈی ڈاکٹر ہیں.....؟“

”ہاں.....!“ ڈاکٹر فوزیہ نے مختصر کہا۔

”تو پھر جلدی چلو..... حویلی میں ایک عورت کی طبیعت بہت خراب ہے، اس کے ہاں ولادت ہونے والی ہے۔“ خاکستری رنگت والے نے بہ غلٹ کہا۔

ڈاکٹر فوزیہ اس کی بات سن کر چونکی..... اس نے بغور اس آدمی کا جائزہ لیا۔ اس نے بے داغ کڑکڑاتی ہوئی سفید شلوار میض پہن رکھی تھی اور پیروں میں اس کے پشوری چپل تھیں۔

”ڈاکٹر فی صلابہ..... جلدی چلو..... مریضہ کی حالت بہت نازک ہے..... سوچنے کا وقت نہیں۔“ اس منحنی شخص نے اس بار قدرے متجانبانہ لہجے میں کہا۔ ڈاکٹر فوزیہ کو وہ کسی وڈیرے کا منشی محسوس ہوتا تھا ہم اس نے شانستہ لہجے میں کہا۔

”دیکھئے.....! ہمیں کسی کے ساتھ جا کر مریض کو دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔“

آپ کے پاس گاڑی ہے، آپ مریضہ کو ادھر لے آئیں۔“

اس کی بات سن کر وہ منشی ٹائپ شخص اس بار قدرے بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔

”ڈاکٹر فی صلابہ.....! ہم قریب کے ایک گوٹھ کی حویلی سے آئے ہیں، وڈیرے سونا روخان نے ہمیں بھیجا ہے، مریضہ کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اسے ادھر لایا جائے۔“

بے شک ایک مریضہ کا معاملہ تھا مگر ڈاکٹر فوزیہ بہر حال ایک عورت تھی وہ اس کے ساتھ جانے سے ہچکچاہتی رہی تھی پھر وہ لمحہ بھر سوچ کر بولی۔ ”اچھا ذرا ٹھہرو.....“ یہ کہہ کر اس نے اپنے قریب پریشان سی کھڑی موسیٰ سے کہا۔ ”موسیٰ! تم ذرا ڈاکٹر جواد احمد کو بلا لاؤ۔“

موسیٰ ”جی اچھا بی بی۔“ کہہ کر کیمپ کے اندر چلی گئی، اس نے اندر جا کر ڈاکٹر جواد کے علاوہ دیگر عملے کو بھی اس بات کی خبر کر دی۔ ڈاکٹر جواد سب سے پہلے وہاں پہنچا پھر خاکستری صورت والے آدمی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا معاملہ ہے بیٹی.....!“

”اڑے بابا.....! معاملہ بڑا نازک ہے، ہمیں وڈیرے سامیں سونا روخان نے بھیجا ہے، ادھر حویلی میں ایک عورت کو بچے کو ولادت ہونے والی ہے، اس کی حالت بہت خراب ہے۔“ وہ جھٹکے دار لہجے میں بولا۔

”تو اسے ادھر کیوں نہیں لے آئے؟“

”اڑے بابا.....! ادھر کیسے لاتے، وہ تو ہاتھ نہیں لگانے دے رہی، تم لوگوں کی وڈی مہربانی ہو گی..... جلدی ہمارے ساتھ چلو۔“

”مگر ہمیں تو کہیں جا کر مریض دیکھنے کی اجازت نہیں ہے وہ بھی ایک لیڈی ڈاکٹر.....!“ جواد نے کہا۔

”میں نے بھی ان سے یہی کہا تھا۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے اچانک کسی خیال کے تحت جواد سے کہا۔

”بابا.....! یہ تو کوئی بات نہیں ہو گی، مریضہ کی حالت نازک ہے، تم لوگ ڈاکٹر ہو، سرکار نے تمہیں ہماری خدمت کے لیے ادھر بھیجا ہے، تم لوگ پگھار (تنخواہ) کس بات کی لے رہے ہو، تم لوگوں کو ہر حالت میں چننا ہو گا ہمارے ساتھ۔“ اس بار اس کا لہجہ دباؤ ڈالنے والا تھا مگر ڈاکٹر جواد بغیر دباؤ میں آئے بولا۔

”سرکار ہمیں کسی کے گھر جہاز روڈ پر نہیں بھیجتی، ہم لوگ تمہارے ساتھ نہیں

مریضہ کو ادھر ہی لانا ہو گا۔“

ماحول یکدم ہی کشیدہ ہو گیا تھا، اگرچہ ڈاکٹر فوزیہ کی خواہش تھی کہ اس درد سے تڑپتی ہوئی مریضہ کو تکلیف سے نجات دلادے مگر اب وہ بیچ میں بول کر ڈاکٹر جواد کی تنقید کا نشانہ نہیں بننا چاہتی تھی، رمونامی مریض والا ناخوشگوار واقعہ ابھی تازہ ہی تھا مگر یہاں معاملہ دوسرا تھا۔

”بابا.....! یہ تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی، ہمارے وڈے سائیں نے ہمیں ہر صورت میں کسی نہ کسی لیڈی ڈاکٹر کو لانے کا حکم دیا ہے، ہرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ اپنے ہی گوٹھ کی کوئی دائی وغیرہ کو دیکھ لیں، سب گوٹھ سے جا چکے ہیں۔“ اس بار اس شخص کے لہجے میں تنبیہ تھی۔ ڈاکٹر جواد کسی سے ڈرنے والا نہیں مگر وہ دریا میں رہ کر مگر مچھوں سے پیر نہیں لینا چاہتا تھا، وہ جانتا تھا کہ یہ صحرا بھی ایک طرح کا دریا ہے جہاں کینہ پرور اونٹوں کی کمی نہیں، ذرا بھی خلاف مرضی کی کوئی بات ہوئی، یہ لوگ کینہ پرور اونٹوں کی طرح چڑھ دوڑتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ دیدہ و دانستہ اوکھلی میں سردے دیا جائے۔

”ڈاکٹر صاحب! کیا سوچتے پڑے ہو پھر آپ ہماری دھرتی پر مہمان ہو، بالکل فکر مت کرو، تم کو عزت اور احترام کے ساتھ دوبارہ ادھر چھوڑ دیا جائے گا۔“ اس بار اس مٹی قسم کے شخص نے انتہائی خاکسارانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر جواد نے چند لمبے کچھ سوچ کر دھیرے سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ اس کے بعد اس نے اشرف اور موسیٰ کو میڈیکل بیگ تیار کرنے کو کہا اور ڈاکٹر فوزیہ نے چند مخصوص دوائیں لیں، اس کے بعد یہ چاروں لینڈ کروزر میں سوار ہو گئے، لینڈ کروزر ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

☆=====☆

مائی حنیفاں کی سنسناتی ہوئی آواز دم بخود فضا میں پٹانے کی طرح گونجی اور قافلے کے لوگوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ بے چاری اللہ وسائی تو پوری جان سے لرز اٹھی، سب کی آسمان تک دانتیں حواس باختہ اللہ وسائی پر جم کر رہ گئیں، قریب مردوں کی قطار میں کھڑے سارنگ کے دل پر جیسے گھونسا لگا، اللہ وسائی کی تو جان ہی نکل چکی تھی، اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا دبوہر ہو گیا، مائی حنیفاں نے اللہ وسائی کو بازو سے پکڑ کر یوں عورتوں کی قطار سے کھینچا جیسے تالاب سے کسی گندی مچھلی کو نکال رہی ہو، وہ اسے میر کارواں سائیں بخش کے

پاس لے آئی۔

ایک بار پھر تحقیق کا عمل شروع ہو گیا، مردوں کی قطار میں سے ایک پختہ العمر شخص کو بھی باہر نکالا گیا، یہ جھانی تھا، اس کی بیوی کچھ روز پہلے ہی دست، الٹیوں کا شکار ہو کر انتقال کر چکی تھی، اس وقت اس کا نو، دس سالہ اکلوتا بیٹا فرید واس کے ساتھ تھا۔

ان دونوں کا میر کارواں سائیں بخش نے خود معائنہ کیا، سائیں بخش ایک تجربہ کار انسان تھا، تھر کے نامی گرامی سالار کاروانوں میں اس کا بھی نام شامل تھا، اس نے اللہ وسائی اور جھانی کے سر کے بالوں کا اچھی طرح سے معائنہ کیا اور اس بات کی تصدیق کر دی کہ یہ دونوں ”پین بلا“ نامی بیمار کا شکار ہیں۔ بس پھر کیا تھا، ان دونوں کو قافلے سے علیحدہ کر دیا گیا، جھانی تو بے چارہ خاموشی سے ہٹ گیا مگر اللہ وسائی نے رونا، پیٹنا شروع کر دیا، اس بے چاری پر مزید ستم یہ ہوا کہ اس کے شوہر خالقو نے اس سے بچہ چھین کر اپنے قبضے میں کر لیا اور صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی بیمار بیوی کے ساتھ نہیں رہ سکتا مگر میر کارواں اتنا بے رحم نہ تھا۔ اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ ان دونوں بد نصیبوں کی دادرسی کے لیے کچھ کرے لیکن وہ صرف اس حد تک ہی ذمہ داری نبھا سکتا تھا کہ جھانی کے نو سالہ بیٹے فرید واور بے سہارا اللہ وسائی کا تحفظ کرتا لہذا جھانی سے اس کے کسی عزیز رشتے دار کے بارے میں پوچھا گیا تاکہ اس کے بیٹے فرید و کو حوالے کیا جائے جبکہ اللہ وسائی کے تحفظ کے لئے اس کے شوہر خالقو کو بھی قافلے سے علیحدہ ہو جانے۔ نم دیا مگر خالقو اڑ گیا، اس نے میر کارواں سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اب اپنی بیماری بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا، وہ اسی وقت اسے طلاق دے رہا ہے۔ اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ بے چاری اللہ وسائی یکدم چیخ اٹھی اور اپنے شوہر کے پیروں پر گر گئی۔

”سائیں.....! تیرے کو اللہ کا واسطہ، بھلے میرے ساتھ نہ رہے پر طلاق کا داغ تو میری پیشانی پر نہ لگا۔“ وہ زار و زار روتے ہوئے بولی مگر خالقو پتھر بنا کھڑا تھا، میر کارواں خاموش تھا، سارنگ سخت تذبذب کا شکار نظر آ رہا تھا۔

”میں تیرے ساتھ کیسے رہ سکتا ہوں؟ تو کیا چاہتی ہے کہ میں اور منٹھار بھی پین بلا کا شکار ہو جائیں، بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تجھے.....!“

”صہر وادا خالق داد.....!“ اچانک سارنگ مردوں کی قطار سے نکل کر سامنے آیا۔ ”اس بے چاری کے ساتھ یہ ظلم کیوں کر رہا ہے ادا.....! تو اسے طلاق نہ دے اور اس کے ساتھ رہ بھی نہیں، میں بھابی اللہ وسائی کے ساتھ ہوں، میں اس کا علاج کرواؤں گا۔“

تعلقات تھے۔ سارنگ نے ذرا دیر بعد جھانی سے کہا۔ ”چاچا.....! تم ادھر ٹھہرو، میں آس پاس دیکھتا ہوں..... مجھے امید ہے کوئی امدادی ٹیم نظر آ ہی جائے گی۔“

”اڑے نا چھوڑا.....! یہ ریت کا سمندر بڑا بے رحم ہوتا ہے کہیں بھٹک گیا تو یہ سس کی طرح تیرے کو نگل لے گا۔“ جھانی نے کہا۔

سارنگ پھکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”چاچا.....! تو پھر یہاں رہ کر کون سا ہم زندہ بچیں گے..... پیاس کے ویسے ہی مارے ہوئے ہیں ہم..... کھانے کے لیے ایک لقمہ تک ہمارے پاس نہیں، ایک معصوم، ماں کے سوکھے سینے سے چمٹا بلک رہا ہے، ہم سے ہی یہ جان لیوا قحط برداشت نہیں ہو رہا یہ تو پھر معصوم ننھی جان ہے۔“ سارنگ کا اشارہ سمجھتے ہوئے اس نے ”اچھا بابا جیسی تیری مرضی“ کہہ کر اپنا سر جھکا دیا۔

ادھر اللہ وسائی سے چمٹا ننھا منٹھار آ کر کب تک بہلتا، اس نے رونا شروع کر دیا بلکہ اب تو اس بے چارے میں رونے کی بھی سکت نہیں رہی تھی، اللہ وسائی کو اپنے بچے کی طرف سے تشویش ہونے لگی، اس نے جلدی سے اپنے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت سے اپنی پیشانی پر آیا ہوا پسینہ سمیٹا اور اپنے لخت جگر کے آب ترساں لبوں کو بھگونے لگی۔

یہ جگر خراش منظر سارنگ سے نہیں دیکھا گیا، وہ باہر نکل آیا، وہ جانتا تھا اللہ وسائی کے دل میں کیا قیامتیں ٹوٹ رہی ہوں گی مگر نوک زبان پر اپنی کسی تکلیف کا اظہار نہ لائی تھی، وہ بہت ہی چپ چاپ اور انتہائی سادہ لوح تھی، سارنگ اپنی بھابی اللہ وسائی کے بارے میں سوچتا ہوا انداز سے گرم ریت پر چلنے لگا، اگرچہ اس کی اپنی حالت بھوک کے باعث غیر ہو رہی تھی لیکن اس کے اندر عزم کی طاقت تابندہ تھی وہ تپتی سلگتی دھوپ میں آگے بڑھا چلا جا رہا تھا، اس کے دل میں میراں کی محبت اور دماغ میں اس کے پیکر جمال کا تصور روشن تھا، اس سے یوں جدا ہونے کا اسے بہت غم تھا اور وہ خوب جانتا تھا، میراں بھی بے چین ہوگی، پریشان ہوگی اس کے لیے لیکن سارنگ نے قافلے سے جدا ہوتے وقت میراں کو تسلی دینے کی غرض سے اپنے ماں، باپ مٹھل اور عجیباں سے کہا تھا کہ وہ اس کی فکر نہ کریں، وہ بہت جلد ان سے دوبارہ ملے گا۔

میر پور یہاں سے دور تو نہیں تھا کیونکہ میراں کے ماں، باپ اور سارنگ کے ماں، باپ کی منزل میر پور ہی کا ایک گاؤں تھا جو کوٹ میرو کے نام سے موسوم تھا، وہاں ان کے دور کے عزیز رشتے دار رہتے تھے اور وہیں ”رہا کی“ (کھیت مزدوری) کرتے تھے۔ بہر طور سارنگ انہی خیالوں میں چلتا جا رہا تھا، اسے فضا میں ایک امدادی ہیلی کاپٹر کی گڑ گڑاہٹ

سارنگ نے پر عزم لہجے میں کہا پھر بڑی محبت اور احترام کے ساتھ اللہ وسائی کو بے حس خالقو کے قدموں سے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ پورے مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا، اللہ وسائی اپنا رونا دھونا بھلا کر ایک ٹک اپنے دیور کو دیکھنے لگی، اس کی نمناک آنکھوں میں اب حیرت انداز کی تھی البتہ عورتوں کی قطار میں اپنی ماں کے ساتھ کھڑی میراں بے چین سی نظر آنے لگی، سارنگ کے قافلے سے الگ ہو جانے والے فیصلے نے اسے دہلا کر رکھ دیا تھا مگر وہ چپ رہنے پر مجبور تھی، اگر وہ اپنے دل کی بے چینی ظاہر کر دیتی تو پھر بے مجمع میں اس کا حال دل آشکار ہو جاتا۔

سارنگ نے بڑے ملتجیانہ انداز میں اپنے بڑے بھائی خالقو سے کہا۔ ”اس کا بچہ اس کو دے دے، یہ مر جائے گی اس کے بنا.....!“ اس کی بات پر خالقو نے برا سامنہ بنا کر ننھے منٹھار کو اللہ وسائی کے حوالے کر دیا۔

سارنگ کے ماں، باپ روتے رہے لیکن سارنگ نے انہیں تسلی دے کر روانہ کر دیا۔ قافلہ تین افراد کو تھر کے پتے سلگتے ویرانے میں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا البتہ ایک خیمہ ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا اور تھوڑا بہت زاد راہ بھی..... اللہ وسائی ننھے منٹھار کو گود میں لے کھڑی سسک رہی تھی، پختہ العمر شخص جھانی خاصا بیمار دکھائی دے رہا تھا، اس کا نوسالہ معصوم بیٹا فرید و باپ کے ساتھ کھڑا سارنگ کی طرف تکے جا رہا تھا، اس کے پیروں میں جوتی نہیں تھی، اس سے پہلے اپنے بیمار باپ کے کاندھے پر سوار تھا، ان لوگوں کی بے بسی دیکھ کر سارنگ کا جی کڑھنے لگا، سارنگ فطرتاً ئیںم خوتا۔

”اڑے چھو کر.....! تو نے کیوں ہماری خاطر کھد کو مشکل میں ڈال لیا تو تو بھلا چنگا تھا۔“ جھانی نے سارنگ سے کہا پھر وہ اللہ وسائی کے سر پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔ ”یہ میری دھیوں جیسی ہے، پر یہ ہے بڑا جلم..... یہ بیماری چین بلا پھیلنے والی تھوڑا ہی تھی، یہ تو حکیم نے بھی بتایا تھا۔“

”ہاں چاچا.....! پر سائیں بخش بھی تو مجبور تھا، میرا خیال ہے اس نے میرا کارواں ہونے کا فرض نبھایا ہے، یہ بات تو وہ پہلے بھی کہہ چکا تھا کہ اگر اس کے خاندان میں بھی کسی کو یہ خطرناک بیماری ہوتی تو قافلے کے دوسروں لوگوں کے مفاد اور بہتری کی خاطر اسے بھی نکال باہر کرتا۔“ سارنگ نے کہا۔

”اچھا چلو اندر آ جاؤ۔“ جھانی نے اپنے بیٹے فرید و کا ہاتھ پکڑا اور سارنگ اپنی بھابی واکھوتے خیمے کی طرف لے کر بڑھا۔ یہ سب لوگ اندر آ کر بیٹھ گئے..... سارنگ، جھانی، راجھانی، سارنگ کو اچھی طرح جانتا تھا، دونوں ایک ہی گوشہ کے تھے اور ان میں قریبی

بھی سنائی دی، اس نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر امدادی ہیلی کاپٹر بے رحم ٹکڑا ہٹ کے ساتھ اس کے اوپر سے گزر گیا، ان کی شاید اس پر نظر نہیں پڑی تھی یا پھر انہوں نے ایک اکیلے انسان کو نظر انداز کر دیا تھا، ہیلی کاپٹر اب صحرائی وسعتوں میں غائب ہو چکا تھا۔

سارنگ نڈھال سے انداز میں پھر آگے بڑ گیا، دور دور تک بے رحم تپتے صحرا کے سوا کچھ نہ تھا، جانوروں کے ڈھانچوں پر اب صحرائی گدھوں نے منڈلانا چھوڑ دیا تھا، دفعنا سارنگ کی نظر ایک ریتیلے ٹیلے پر پڑی، وہ بری طرح ٹھکا، وہاں اسے دو گدھ آپس میں لڑتے دکھائی دیے، سارنگ اس سمت کو دوڑا، اس کے چونکنے کی وجہ سورج کی روشنی میں منعکس ہوتی وہ شعاعیں تھیں جو کسی دھاتی شے سے آ رہی تھیں، ریت پر پاؤں دھسنے کی وجہ سے اس سے دوڑا بھی نہیں جارہا تھا مگر اس دھاتی شے سے روشنی کے انعکاس نے جیسے اس کے اندر نخل امید کا چراغ جلا دیا تھا، جس نے اس کی منتشر طاقت کو مجتمع کر کے آگے بڑھنے پر مہمیز کیا تھا بالآخر وہ گر تاپڑتا ٹیلے کے پاس پہنچ گیا۔

وہ دونوں گدھ اتنے ٹیلے تھے کہ ایک انسان کی موجودگی کے باوجود لڑنے میں مصروف تھے، ان کی لمبی لمبی پتلی گردنیں بالوں سے عاری تھیں اور سر بھی گنجدے تھے۔ اچانک سارنگ نے ایک دلخراش منظر دیکھا تو اسے چکر سا آ گیا۔

دونوں گدھ ایک انسانی ہاتھ کو کھانے میں مصروف تھے، ہاتھ کے ریشے علیحدہ ہو چکے تھے، ہڈیاں تک نظر آ رہی تھیں، سارنگ کا جی مٹلانے لگا، تیز دھوپ اور گرمی کی وجہ سے بڑی ناگوار ہو پھیلی ہوئی تھی، سارنگ نے بمشکل اپنے جی پر قابو پاتے ہوئے اس کراہت آمیز منظر سے توجہ ہٹائی اور اس دھانی شے کی طرف موڑی، وہ ایک پانی کی سفری بوتل تھی، سارنگ کی آنکھوں میں چمک ابھری، وہ بوتل کی طرف لپکا، یہ مشکیزہ نما بوتل تھی، پلاسٹک کی، اس کا نو لادی اسٹریپ دھوپ میں چمک رہا تھا۔

سارنگ نے بوتل اٹھائی، اسے جونیوں کی طرح ہلا کر دیکھا، اندر پانی کی چھلکا ہٹ ابھری، سارنگ نے آس پاس کا یونہی جائزہ لیا، ذرا فاصلے پر ایک بیل کا ڈھانچہ تھا اور دیگر ڈھانچے بھی بکھرے ہوئے تھے، سارنگ نے اندازہ لگایا کہ یہ مشکیزہ نما بڑی سی بوتل شاید فضا میں پرواز کرتے ہوئے امدادی ہیلی کاپٹر نے پھینکی تھی، سارنگ بوتل مضبوطی سے تھامے آپس دوڑا، پانی کی بوتل پا کر اس کے خشک چڑیاں جتے ہونٹوں پر تراوٹ سی ابھری اور اس کی گویا ازلی پیاس چمکی، اس نے ذرا رک کر بوتل کا ڈھکنا کھولا اور ابھی بوتل کو منہ سے لگانا

ہی چاہتا تھا کہ اچانک اس کی نگاہوں کے سامنے اپنی بھابی اللہ وسائی اور بچے کا معصوم چہرہ ابھرا پھر جھانی کے بیٹے فرید وکا بھی چہرہ نظر آیا تب سارنگ نے پانی پیئے بغیر بوتل کا ڈھکنا دوبارہ بند کر دیا اور لب تر ساں تر کیے بغیر آگے چل پڑا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ خیمے کے اندر داخل ہوا، سب سارنگ کے ہاتھ میں پانی کی بوتل دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھے جیسے سارنگ کے ہاتھ میں پانی نہیں، آب حیات کی بوتل ہو، سارنگ نے سب سے پہلے بوتل کا ڈھکنا کھول کر اپنی بھابی اللہ وسائی کے خشک لبوں سے لگایا مگر اللہ وسائی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور جلدی سے سارنگ کے ہاتھ سے بوتل چھین کر اس کے چھوٹے سے ڈھکن میں تھوڑا پانی انڈیلا اور اپنے ننھے بچے منٹھار کے خشک لبوں سے لگا دیا، بچے کا سوکھا حلق پانی سے تر ہوا اور جلد ہی ڈھکن خالی ہو گیا، اللہ وسائی نے دوبارہ ڈھکن کو پانی سے لبریز کیا اور پھر اس کے لبوں سے لگا دیا، پانی کی ٹھنڈک ننھے لبوں سے ہوتی جب معدے میں منتقل ہوئی تو نڈھال سی ننھی جان میں تحریک پیدا ہوئی اور اس نے بلند آواز سے رونا شروع کر دیا، اس کے رونے کی آواز نے اللہ وسائی کے تن مردہ میں زندگی کی لہر دوڑادی۔

”بھابی.....! تم بھی تو پیو نا.....!“ سارنگ نے زخمی لہجے میں بھابی سے کہا تو اللہ وسائی نے انکار میں سر ہلا دیا اور اپنے سامنے جھانی کے ساتھ بیٹھے نو سالہ فرید و کو اپنے پاس بلانے کا اشارہ کیا جو بے چارہ اپنی معصوم اور پیاسی نظروں سے پانی کی بوتل کو تنکے جارہا تھا، اشارہ پانے کی دیر تھی کہ وہ لپک کر آگے بڑھا، اللہ وسائی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پانی کی بوتل اس کی طرف بڑھادی جسے جھپٹنے کے انداز میں پکڑ کر فرید و نے اپنے پیاسے ہونٹوں سے لگالی اور غنا غٹ پانی پینے لگا۔

”اڑے چھو کر.....! کیا سارا ختم کر دے گا پانی، بس کراب.....!“ اس کے باپ نے اپنے بیٹے فرید و کو گھر کا تو فرید و نے بوتل منہ سے بٹھادی جسے سارنگ نے لے کر بھابی کو تھادی۔

”لو بھابی.....! اب تھوڑا ستم بھی پی لو۔“ سارنگ نے کہا۔

”تو بھی تو پی لے..... پتہ نہیں کب سے ٹوپیسا ہے۔“ اللہ وسائی نے چورنگا ہوں سے سارنگ کی طرف دیکھ کر کہا۔

سارنگ نے دردغ گوئی سے کام لیتے ہوئے بھابی سے کہا۔ ”بھابی.....! تو پی لے پنی، میں نے راستے میں تھوڑا سا پی لیا تھا۔“

”تو جھوٹ بولتا ہے..... نہیں تو کھا میری قسم.....!“ اللہ وسائی نے شک بھری نگاہوں سے اپنے دیور کی طرف دیکھ کر کہا۔

سارنگ تڑپ کر بولا۔ ”بھابی..... اپنی لے پہلے تو پھر میں بھی پی لوں گا..... دیکھ خدمت کر ہم نے آگے بھی نکلتا ہے..... لے شاباش چند گھنٹ بھر لے۔“ یہ کہہ کر سارنگ نے بوتل زبردستی اس کے خشک لبوں سے لگا دی۔

چند گھنٹ بھرنے کے بعد اللہ وسائی نے ناچا ہتے ہوئے بھی اپنا منہ پرے کو کر لیا، سارنگ بوتل سنبھالے نڈھال بیٹھے جھانی کے پاس آیا۔ ”لے چا چا.....! تو بھی چند گھنٹ پی لے۔“ سارنگ نے اس سے کہا۔

جھانی نے انکار میں اپنا سر ہلاتے ہوئے نحیف سی آواز میں کہا۔ ”اڑے نہیں یار.....! مجھے رہنے دے تو پی لے، میری خیر ہے۔“

”نہیں چا چا! تو پی لے تو پھر آگے نکلیں..... یہاں ہم کب تک پڑے رہیں گے۔“ سارنگ نے رساں سے کہا۔

”چل یار.....! پیو تو گھنٹ بھر لے پھر میں پیوں گا شاباش!“ جھانی نے کہا تو ناچار سارنگ نے چند گھنٹ پانی پی کر اپنا تھوہر زدہ حلق تریا اور بوتل جھانی کی طرف بڑھا دی، جھانی نے بھی چند گھنٹ بھر کر بوتل واپس سارنگ کی طرف بڑھائی تو اس کے نو سالہ بیٹے فرید نے معصومانہ لچائی نظروں سے پانی کی بوتل کو دیکھتے ہوئے اپنے باپ سے کہا۔

”بابا.....! میں اور پانی پیوں گا۔“

”اڑے بس کر سارا تو ہی پی جائے گا..... چپ ہو جا.....“ باپ کی جھڑکی پر فرید نے چپ سادھ لی۔

”اب کیا ارادے ہیں یار.....! نکلیں آگے.....؟“ جھانی نے سارنگ کی طرف دیکھ کر کمزور سے لہجے میں پوچھا۔ اس کے ٹوٹے ہوئے لہجے سے صاف لگ رہا تھا کہ اس میں آگے بڑھنے کی سکت بالکل دم توڑنے لگی ہو۔

”چا چا.....! آگے تو بڑھنا ہی پڑے گا ورنہ اس جہنم زار میں تو ہم ختم ہو جائیں گے۔“ سارنگ نے کسی قدر تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

”یار.....! پھر ایسا کر تم لوگ آگے چلے جاؤ پر میرا ایک کام کر دے یار.....! میرے انت جگر فرید کو میرا پورا اس کی ماسی رختاں تک پہنچا دینا، تیرا مجھ پر اور اس معصوم پر بڑا حسان ہو گا۔“ جھانی نے مہجور لہجے میں اپنے بچے فرید کی طرف دیکھ کر کہا۔

سارنگ اس کے غمزدہ لہجے پر کٹ کر رہ گیا، اپنی رقت پر قابو پاتے ہوئے اس سے بولا۔ ”نہیں چا چا.....! تو بھی ہمارے ساتھ چلے گا، فرید کی تو ذرا پروا نہ کر، میں اسے اس کی ماسی رختاں تک پہنچا کر رہوں گا۔“

”اڑے یار.....! خدمت کر، بین بلانے مجھے کھانا شروع کر دیا ہے، میرے سر کا ناسور میرے بھیجے (دماغ) میں اترنے لگا ہے، میں..... میں اب نہیں بچوں گا، تو نے خواہ مخواہ اپنا پانی مجھے پلا کر ضائع کیا۔“

سارنگ اس کے لہجے کی یاسیت اور بے چارگی پر سرتاپا کانپ اٹھا اور بے اختیار اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے لرزیدہ لہجے میں بولا۔ ”چا چا.....! یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے، چل اٹھ شہر میں تیرا علاج کرواؤں گا، میں بھابی اور تیرے کو شہر کے وڈے ہسپتال میں داخل.....“

”اڑے یار ارہنے دے مجھے.....“ جھانی، سارنگ کی بات کاٹ کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ”تم کیوں اڑاؤں وقت کھوٹا کر رہے ہو، میں چلنے کے قابل بھی نہیں ہوں، اب میرا سر بھی چکرانے لگا ہے، میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا ہے، اللہ وسائی کو ابھی بین بلانے نہیں پکڑا، اسے تو شہر لے جا، یہ جلدی ٹھیک ہو جائے گی، میں تو..... میں تو گزرنے (مرنے) لگا ہوں۔“ یہ کہہ کر جھانی نے اپنی آنکھیں موند لیں اور اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ خیسے کے اندر اللہ وسائی کی غم زدہ سسکاری ابھری اور نو سالہ فرید اپنے باپ کو دیکھ کر رونے لگا۔

☆=====☆

لگ بھگ نصف گھنٹے کے بعد لینڈ کروزر ایک نیم اجازسی آبادی میں داخل ہوئی، اطراف کا منظر بڑا ہی لرزہ خیز تھا، جھونپڑیاں و بران تھیں، ان میں گارے مٹی کی دیواروں والے شکستہ و بوسیدہ گھر بھی تھے، یہاں جا بجا ریتیلی زمین پر موشیوں کے پنجر بکھرے ہوئے تھے، کچھ لوگ بے حال سے باقی تھے۔ ریت پر اٹھتے ہوئے انسان بھی پڑے موت کی گھڑیاں گن رہے تھے، ایک جانب ایک مختصر سا کتبہ چھوٹے سے معصوم بچے کی لاش اٹھائے ماتم کر رہا تھا، ایک مضطرب الحال عورت سینہ کو پی کر رہی تھی، ایسے ہی ماتم کرتے دو تین اور بھی کتبے ڈاکٹر نوذیر کی نگاہ عبرت کا ساماں ہوئے تو وہ اندر بیٹھی بے اختیار چلا اٹھی۔

”روکو..... روکو گاڑی پہلے ان لوگوں کو ہمارے کیپ تک پہنچاؤ۔“

اس کے یوں اچانک چیخنے چلانے پر انگلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے بندوق بردار افراد کے چہروں پر عجیب سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ ڈاکٹر جواد کو فوزیہ کی اس حرکت پر ذہنی کوفت ہونے لگی۔ ایسے میں ڈرائیونگ کے برابر والی سیٹ پر براجمان اس منشی ٹائپ شخص نے بے رحمانہ انداز میں اپنی گردن موڑے بغیر فوزیہ سے کہا۔ ”ڈاکٹر نی صاحبہ.....! یہ حالت صرف اس گوتھ کی نہیں بلکہ پورے تھر پارکر کی ہو رہی ہے، آپ کس کس کو اپنے کمپ پہنچائیں گی۔“ ”فوزیہ.....! پلیز فار گاڈ سیک..... چپ رہو۔“ اس بار اس کے ساتھ بیٹھے ڈاکٹر جواد نے ڈاکٹر فوزیہ کو ٹوکنا چار فوزیہ دل مسوس کر چپ ہو رہی تاہم اس نے اب شیشے کے پار جگر خراش مناظر سے نگاہیں ہٹالیں۔

ذرا ہی دیر بعد لینڈ کروڑ ایک جھٹکے سے رک گئی، یہ لوگ نیچے اترے، سامنے خاصے وسیع رقبے پر ایک پرانی سی نیم پختہ حویلی تھی جو ایک منہدم چار دیواری کے احاطے کے اندر واقع تھی، احاطے کا دیویدیکل جو بی گیت دیکھ کر لگتا تھا جیسے اسے عرصہ دراز سے بند کرنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی گئی، وہ ریٹیلی زمین دھنسا ہوا تھا، یہ لوگ آگے پیچھے چلتے ہوئے اس شکستہ چار دیواری کے اندر داخل ہوئے، حویلی کا دروازہ بند تھا، وہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا، قریب ہی ایک چھپر نما اوطاق کا دروازہ بھی نظر آیا جو کھلا ہوا تھا، منشی نے رک کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”اڑے بابا.....! تم ان لوگوں کو ادھر اوطاق میں بٹھاؤ اور ان کے چائے پانی کا بندوبست کرو، میں ڈاکٹر نی صاحبہ کو اندر لے کر جاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر پھر وہ ڈاکٹر فوزیہ سے مخاطب ہوا۔ ”آؤ ڈاکٹر صاحبہ.....! آپ کا مریض اندر ہے۔“

ڈاکٹر فوزیہ تذبذب کا شکار ہو گئی الر ڈاکٹر جواد کی طرف الجھی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔

ایسے میں ڈاکٹر جواد نے کہا۔ ”ڈاکٹر فوزیہ اندر اکیلی نہیں جائے گی، میں اور عملے کے لوگ بھی اندر جائیں گے۔“ اس کی بات سن کر منشی نے خشمگین نظروں سے ڈاکٹر جواد کی طرف دیکھا اور بولا۔

”اڑے بابا.....! اندر زانی کو بچہ ہونے والا ہے، تم مردوں کا کیا کام، بس یہ عورت ساتھ اندر جاسکتی ہے۔“ اس نے ڈاکٹر فوزیہ کے ساتھ میڈیکل بیک تھاے کھڑی موسیٰ کی طرف اشارہ کیا۔

”تمہاری بات غلط ہے۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے بھی تنہا اس کے ہمراہ اندر جانے پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا تعلق ڈاکٹری جیسے معزز پیشے سے ہے، رہی بات ایک

عورت کو دیکھنے کی تو ظاہر ہے الگ کمرے میں، میں ہی اس کا معائنہ کروں گی، یہ لوگ صرف مددگار کی حیثیت سے کمرے سے باہر موجود رہیں گے، کیا اندر اتنی بڑی حویلی میں صرف ایک ہی کمرہ ہوگا.....؟“

ڈاکٹر فوزیہ کے چبھتے لہجے پر منشی ذرا جربز ہوا، چند لمحے کی خاموشی کے بعد بولا۔

”اچھا ٹھیک ہے آ جاؤ سب لوگ.....!“

ڈاکٹر جواد، فوزیہ کے آگے چل رہا تھا اور فوزیہ کے عقب میں اشرف اور موسیٰ تھے باقی بندوق بردار بھی پیچھے چلے آ رہے تھے، سب سے آگے منشی تھا۔

ڈاکٹر فوزیہ نے جیسے ہی حویلی کے اندر قدم رکھا، جانے کیوں ایک انجانے اندیشے تلے اس کا دل زور سے دھڑکا، وہ خوف زدہ سی ہو گئی مگر اب وہ لوگ ان کے ساتھ یہاں تک آچکے تھے اور یہاں سے واپس لوٹنے کا ان کے پاس کوئی جواز نہ بچا تھا، اندر ایک اونچی چھت والے بڑے کمرے میں انہیں بٹھا دیا گیا، ڈاکٹر فوزیہ نے اندر کمرے میں قدم رکھتے ہی کسی عورت کے چیخنے چلانے کی آوازیں سننے کی کوشش کی تھی مگر اس کی توقع کے برخلاف اس کے کانوں میں ایسی کوئی آواز نہ پڑی، اس کے دل میں پھر کھٹکا ہوا۔

”آپ لوگ ادھر بیٹھو، مریضہ ساتھ کے کمرے میں ہے، ادھر اور بھی عورتیں موجود ہیں۔“ منشی نے ڈاکٹر جواد سے کہا پھر ڈاکٹر فوزیہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”آپ آئیے ڈاکٹر نی صاحبہ.....!“

ڈاکٹر فوزیہ ایک بار پھر تذبذب کا شکار ہو گئی تاہم وہ موسیٰ کو اپنے ساتھ لے کر منشی کے ساتھ چل دی، وہ ان کو سیلین زدہ سی غلام گردشوں اور راہدار یوں سے گھماتا ہوا ایک نسبتاً چھوٹے کمرے میں لے آیا۔

اندر قدم رکھتے ہی ڈاکٹر فوزیہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، اسے سامنے مسہری پر ایک نہایت خوبصورت اور الہندسی دو شیرہ پاؤں لٹکائے بیٹھی نظر آئی، وہ بڑے زرق برق لباس میں تھی مگر اس وقت اس کے چہرے پر بڑے کرب کے تاثرات نمایاں تھے، ڈاکٹر فوزیہ کو وہ کہیں سے بھی بیمار دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

اچانک فوزیہ کی نگاہ اپنے دائیں جانب پڑی اور وہ بری طرح ٹھٹکی، ایک منقش پایوں والی بان کی بڑی کرسی پر ایک جوان شخص بیٹھا نظر آیا، اس کے تیور دیکھ کر ہی ڈاکٹر فوزیہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی بگڑا ہوا عیاش وڈیرازادہ ہے، وہ خاصے ذیل ڈول کا مالک تھا اور عمر تیس پینتیس کے قریب رہی ہوگی، اس نے سفید براق شلوار، قمیض پر اجرک کو بڑے

ملوکاں کا خیال بالکل درست تھا کیونکہ یہ اس دو چار پائیوں کے ایک جھوٹے سے خیمے کے اندر گھنٹوں میں سردیے اداس اور رنجور بنی ہوئی تھی، اس کا باپ سکھو اور ماں سوچکے تھے، تھوڑا بہت جو کھانے پینے کو ان کے پاس تھا وہ آج رات میں ختم ہو چلا تھا، اب کل کے لیے ان لوگوں کے پاس منہ گیلا کرنے کے لیے بھی کچھ باقی نہ بچا تھا، اگرچہ میرا کارواں نے صبح ہوتے ہی منزل تک پہنچ جانے کی خوشخبری سنائی تھی لہذا اس مژدہ جانفزا نے بھی تنہا مردہ میں جان ہی ڈال دی تھی۔

میرا اس وقت اداس بیٹھی سارنگ کو یاد کر رہی تھی جو اس کے دل کے قریب ترین تھا۔ جب سے سارنگ قافلے سے جدا ہوا تھا، اسے ایک ٹک بھی چین نہیں ملا تھا، جدائی کے عذاب تلے اس کا معصوم دل انجانے خوف کا شکار ہونے لگا تھا حالانکہ جدا ہوتے وقت سارنگ نے کن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر تسلی دی تھی کہ وہ بہت جلد آخری منزل میرا پورا خاص کے گوٹھ جمعہ خان ضرور پہنچ جائے گا لیکن میرا اس کے دل کو جانے کیوں قرار نہیں مل رہا تھا۔ رات کے اس سے اس کی بھیگی بھیگی خوبصورت آنکھوں میں اپنے محبوب سارنگ کا ہی روشن روشن چہرہ رقصاں تھا، وہ اپنے دل ہی دل میں سارنگ سے شکوہ کرنے لگی تھی کہ اسے اس کا بھی خیال نہ آیا، کس بے رحمی سے اس نے قافلے کو نہیں بلکہ خود اسے الوداع کہہ دیا تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے جب دل پر عقل غالب آئی تو اسے اپنے محبوب کا فیصلہ مستحسن لگا، وہ انسانی ہمدردی کی خاطر اس قافلے سے جدا ہوا تھا ورنہ اسے کیا ضرورت تھی.....؟ اللہ وسائی اور اس کے معصوم بچے کو قافلے سے جدا کرنے کے حکم نامے پر خود میراں کو بھی دکھ ہوا تھا اور ایسے میں میراں کا اپنا کلیجہ بھی ہولنے لگا تھا کہ بے چاری اللہ وسائی تو دہرے غم کا شکار ہونے لگی تھی، ایک طرف اسے قافلہ چھوڑ رہا تھا اور دوسری طرف اس کا بے حس اور سنگدل شوہر خالقو بھی اسے اپنی زندگی سے نکالنے پر تلا ہوا تھا۔ یہ سوچ کر میراں کو کچھ تسلی ہونے لگی کہ سارنگ کا قدم ایک مجبور اور دکھوں کی ماری عورت کے تحفظ کے لیے نہیں اٹھا تھا بلکہ اس کے ساتھ تھی اس ننھی جان کی بھی سلامتی کا سوال تھا جو اللہ وسائی کا لخت جگر تھا۔ میراں اب اپنی غمناک آنکھیں موند کر سارنگ اور اللہ وسائی کی سلامتی کے لیے خدا سے دعا مانگنے لگی، باہرات دبے پاؤں ٹھہرتی ریت پر ریگ رہی تھی، میراں نے ایک میلی چیکٹ سی رلی اپنے اوپر اوڑھ رکھی تھی مگر اسے شروع ہی سے سردی کا احساس کم ہوا کرتا تھا، ہر سوسناٹا طاری تھا، بالکل اتھا گہری خاموش کی چادر تھی جو دم بخود ماحول میں تنی ہوئی تھی کہ اچانک باہر سناٹے میں کچھ ایسی آوازیں ابھریں جیسے کوئی صحرائی طوفان اٹھ آیا ہو۔

قرینے سے لپیٹ رکھا تھا جو اس کے چوڑے شانوں تک آئی ہوئی تھی، وہ بڑے شاہانہ انداز کے ساتھ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے سگریٹ پی رہا تھا، اس کے سامنے تپائی پر سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر کے علاوہ منرل واٹر کی بوتلیں اور شراب کا آدھا بھرا پیگ رکھا ہوا تھا، وہ بڑی گھورتی ہوئی نظروں سے ڈاکٹر فوزیہ کو دیکھ جاتا تھا، ڈاکٹر فوزیہ کی حالت دگرگوں ہونے لگی، اسے یہ سارا ماحول تشویش ناک حد تک خطرناک محسوس ہو رہا تھا، وہ جیسے یکدم ٹرانس میں آگئی اور اپنی جگہ چند ثانیے کے لیے دم بخود سی کھڑی رہ گئی تھی۔

☆=====☆=====☆

صحرا میں جلد ہی شام اتر آتی تھی، جو بالآخر ٹھہرتی رات پر منج ہوتی چنانچہ جیسے ہی ریت پر طائر شب نے اپنے سرمئی پنکھ پھیلانے شروع کئے، میرا کارواں سائیں بخش نے قافلہ روک دینے کا حکم دیا پھر اس کے بعد عارضی پڑاؤ کی تیاریاں ہونے لگیں، تھکے ہارے نڈھال ہاتھوں نے چار پائیوں، اجرکوں اور موٹی موٹی رلیوں سے خیمے تان دیئے، مٹھل اور عجیباں بے سدھ ہو کر پڑ گئے، ملوکاں جاگ رہی تھی جبکہ اس کا بڑا بھائی خالقو بھی اب اپنی بیوی اللہ وسائی اور بچے منٹھار کو صحرا میں چھوڑنے کی وجہ سے اداس تھا، وہ ایک طرف لاش کی طرح ڈھیر ہو کر پڑ گیا تھا، ایک طرف کونے میں بیٹھی ہوئی اس کی بہن ملوکاں بڑی نفرت انگیز نگاہوں سے اپنے بھائی خالقو کو دیکھ رہی تھی، اس کی آنکھیں غمناک تھیں، اسے اپنی سادہ لوح بھابی اللہ وسائی یاد آ رہی تھی اور اس کی گود میں ہکتا ہوا اپنا ننھا بھتیجا منٹھا بھی یاد آ رہا تھا، اسے بہت دکھ ہو رہا تھا اپنی بھابی اور بھتیجے سے اس طرح جدا ہونے پر، تاہم ملوکاں کو اپنے بھائی سارنگ کی طرف سے قدرے تسلی تھی جو اپنی بھابی کی وجہ سے صحرا میں ہی اس کے ساتھ رک گیا تھا۔ درحقیقت یہ دونوں بہن بھائی ہی اللہ وسائی کے ہاتھوں میں کھیلے ہوئے تھے، ملوکاں کو اپنے ماں باپ پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ چاہئے تو انہیں بھی یہ تھا کہ جیسے ہی اللہ وسائی کو قافلے سے علیحدہ کر دیا گیا تھا تو یہ لوگ بھی علیحدگی اختیار کر لیتے۔ ملوکاں اب کڑھے دل کے ساتھ سوچ رہی تھی، کیا ہوتا اگر یہ لوگ بھی قافلے سے الگ ہو جاتے تو خود بھی تو آخر اپنی کوششوں سے منزل تک پہنچا جاسکتا تھا، اس طرح کم از کم سب لوگ ساتھ تو رہتے۔ شاید بھوک، پیاس کی مجبوری ہوئی ہی اس قدر زہریلی ہے کہ انسان کو بے حس بنا دیتی ہے۔ ملوکاں کو اچانک میراں کا خیال آیا، وہ جانتی تھی کہ سارنگ اور اس کے بچے کس قسم کا تعلق تھا اور اس وقت وہ اس کے لیے کس قدر بے چین اور پریشان ہو رہی ہوگی۔

وقت اس قافلے پر آفات ٹوٹ چکی تھیں، صحرائی لٹیروں نے خوب قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا جس نے ان کے سامنے مزاحمت کرنے کی کوشش کی، اسے بڑی بیدردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، جوان عورتوں اور لڑکیوں کی خاصی کھپ اپنے گھوڑوں پر ڈال لی اور یہ جاوہ جا۔ وہ ان کی عزتوں پر حملہ کر کے بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا۔

لئے پنے پڑاؤ سے دھواں اٹھ رہا تھا، سب کچھ لپٹ تھا، لاشیں بکھری ہوئی تھیں، جو زندہ بچ گئے تھے، وہ ماتم کناں تھے جو زخمی تھے، وہ نیم مردہ حالت میں کراہ رہے تھے۔ انہیں بھوک، پیاس اور قحط نے اتنا نہیں توڑا تھا جتنا ان صحرائی لٹیروں نے، وہ ان کی عزتوں کو لوٹ کر شیطانی اندھیالوں میں غائب ہو چکے تھے، سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

☆=====☆=====☆

سارنگ نے خیمے کے مختصر سامان کو اپنی پشت پر باندھ لیا تھا، اللہ وسائی اس کے عقب میں چل رہی تھی، اس کی گود میں پڑا بچہ ایک بار پھر بھوک اور پیاس کی شدت سے خاموش ہو چکا تھا، جھانی کا نو سالہ لڑکا فرید، سارنگ کے ساتھ چل رہا تھا، اس کا چہرہ ابھی تک آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا اور وہ اپنے باپ جھانی کو یاد کر کے وقفے وقفے سے سڑکی لگا تا اور پھر اپنی میلی آستین سے ناک اور چہرہ پونچھتا۔ اس کی معصومانہ اور روایتی حرکت کو دیکھ کر سارنگ کا جگر چھلنی ہونے لگتا تھا، اس کے باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا، معصوم فرید و کا اب اس بھری دنیا میں اللہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا، جھانی اس پر اسرار بیماری کی لپیٹ میں آ کر مر چکا تھا اور سارنگ نے بوجہ مجبوری جھانی کی لاش کو وہیں ریت میں دفن دیا تھا اور پھر یہ لوگ وہاں ایک پل بھی نہیں ٹھہرے تھے۔ سارنگ کو اپنی بھالی اللہ وسائی کی اس سے زیادہ اپنے ننھے سنے بچے کی زیادہ فکر تھی کیونکہ اللہ وسائی کو بھی بہر حال پین بلا جیسی بیماری تھی اور سارنگ شہر پہنچ کر جلد سے جلد اسے کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھانا چاہتا تھا۔ اسے یہ حقیقت بھی معلوم تھی کہ یہ بیماری چھوت کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہے لیکن لا علاج نہیں تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس پر اسرار بیماری کا علاج پورے قہر میں نہ تھا۔ ویدوں، حکیموں کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آ سکا تھا۔ منزل تک پہنچنے کی سارنگ کے دماغ میں ایک عجیب ترکیب سمائی تھی، وہ قافلے کے لوگوں کو قحطیوں کے نشانات سے رہنمائی لیتا ہوا آئے بڑھ رہا تھا، یوں جلد سے جلد مطلوبہ منزل تک پہنچ جانے کی امید بالکل واضح تھی اور راستہ وغیرہ بھی بھولنے کا احتمال نہ تھا لہذا اب تک وہ اسی طرح ہی کافی فاصلہ طے کرتے چلے آئے تھے حتیٰ کہ رات سر پر آگئی، پیروں

میراں چونک پڑی اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگا مگر اس نے اپنے حواس مختل نہ ہونے دیئے، وہ یکدم اپنی جگہ سے اٹھی اور اگلے ہی لمحے جینوں کی آوازیں ابھریں، اس کے ساتھ کئی رائفلیں ایک ساتھ گرجیں، میراں کا دل اچھل کر حلق میں آٹکا، بائرا ب شور کے ساتھ افراتفری سی مچ گئی تھی، میراں نے دہشت زدہ ہو کر بے سدھ سوئے ہوئے اپنے ماں، باپ کو جھنجھوڑ کر جگا یا پھر ٹھیک اسی وقت تین چار افراد کے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی، ان کا رخ خیمے کی طرف تھا، میراں دہشت زدہ ہو کر خیمے کے روزنوں سے باہر چاندنی میں چند رائفل بردار افراد کو اپنے خیمے کی طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

دوسرے ہی لمحے ان کا خیمہ ڈھا دیا گیا، میراں کے حلق سے ہدائی جیج برآمد ہوئی، وہ چار ڈھانا پوش مسلح افراد خزاں رسیدہ پتے کی طرح کپکپاتی میراں کے قریب آئے اور ڈھانوں کے افق سے ان کی خوفناک آنکھیں وحشتانہ چمک لئے ہوئے تھیں، وہ کالی گھیردار شلوار قمیض میں لمبوس تھے، ان چاروں نے بدست قہقہے لگائے اور لرزتی کانپتی میراں کو دبوچ لیا۔ مٹھل اور مائی عجیباں نے یہ منظر دیکھا تو مٹھل نے فوراً اپنے سر سے ٹوپی اتار کر اور مائی عجیباں نے اپنے سر کی چادر ان کے آگے پھیلا کر گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ”ہماری دھی کو جھوڑ دو، بھلے ہمیں لے جاؤ۔ تمہارے کو اللہ سائیں کا واسطہ۔۔۔۔۔ مرشد سائیں کا واسطہ۔۔۔۔۔!“

”اڑے پرے ہنوں۔۔۔۔۔ تم دونوں کا ہم کیا چار ڈالیں گے۔“ ایک نسبتاً لمبے تونگے ڈھانا پوش شخص نے کہا اور پھر اپنے ساتھیوں سے بولا۔ ”چلوڑے اٹھاؤ اس کو۔۔۔۔۔ اپڑیں پاس وقت ویسے ہی کم ہے۔“

مٹھل اور عجیباں زار و زار روتے ہاتھ جوڑتے ہوئے ڈاکوؤں کے پیروں پر گرے مگر وہ تو مجسم پتھر تھے لہذا انہوں نے قہارت آمیز غیظ سے دونوں بوڑھوں کو ٹھوکر رسید کر دی اور میراں کو بڑی بیدردی کے ساتھ کھینچ کر کاندھے پر ڈال لیا۔

میراں کی جینیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں، یہ بد نصیب قافلہ صحرائی لٹیروں کے ہتھے چڑھ گیا تھا جن کا کام ہی کارواں لوٹنا تھا۔ اگرچہ یہ لوگ بھی جانتے تھے کہ آج اس دھرتی پر دیسے ہی خدائی قہر نازل ہے اور لوگ بھوکے، پیاسے مر رہے تھے۔ چیزوں، روپوں اور مال و اسباب کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی، لیکن یہ لیٹرے مال و اسباب کے نہیں بلکہ عزت کے لیٹرے تھے، ایسی آفات اس دھرتی پر ٹوٹتی رہتی تھیں کہ لوگ تنگ آ کر کارواں کی صورت میں شہر یا کسی دریا کے کنارے آباد دیہاتوں کا رخ کرتے تھے، بہر طور اس

پھر جب وہ ایک ریتیلٹلا پار کر کے چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ
دہنی جانب ایک روشنی پر پڑی، اس کا دل امید بھری مسرت سے یکبارگی دھڑکا، وہ روشنی
ایک قدرے وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے نیلے کے ڈھلان کے عقب سے مدہم سی چمک مارتی
ہوئی نظر آرہی تھی، تب سارنگ نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر تیز قدم بڑھانے شروع کر
دیئے، ذرا سی دیر بعد وہ اس نیلے کے قریب پہنچ چکا تھا، وہ پُر اسرار سی روشنی اس ویران
چاندنی میں نہائے ہوئے نیلے کے عقبی ڈھلان سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، سارنگ اب
دیوانہ دار نیلے پر چڑھنے لگا، نیلہ وسیع رقبے میں پھیلا ہونے کی وجہ سے زیادہ بلند نہ تھا تاہم
اسے پار کرنے کے لیے سارنگ کو دیر تک چلنا پڑا تھا اور بالآخر اس کے دوسرے ڈھلوانی
سرے تک پہنچتے پہنچتے وہ بری طرح ہانپ گیا تھا اور بے دم ہو کر وہیں ریت پر گر گیا، اس کی
سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی، نقاہت کے، رے اب تو اس کے جسم میں اٹھنے کی بھی
طاقت نہ رہی تھی، بے اختیار اس پر غشی طاری ہونے لگی، بے ہوشی طاری ہونے سے پہلے
اس کی نیم غودہ آنکھوں نے سامنے ایک جھونپڑی نما خیمہ دیکھ لیا تھا جس کے قریب ایک
اونٹ بھی بندھا جگالی کر رہا تھا، وہ روشنی اس جھونپڑی کے اندر سے آرہی تھی۔ سارنگ نے
منہ کھول کر چلانے کی ناکام سعی کی اور پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆=====☆=====☆

اچانک اس کی دم بخود سماعتوں سے ایک کرخت آواز نگرانی۔
”تم لیڈی ڈاکٹر ہو.....؟“ اس کرخت صورت نو جوان نے سگریٹ کا ایک طویل
کش لے کر ڈاکٹر فوزیہ کو مخاطب کر کے پوچھا۔ ڈاکٹر فوزیہ نے خود کو سنبھالا اور اس کی طرف
دیکھ کر دھیرے سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ اسے یہ کرخت رونو جوان ایک آنکھ نہیں بھایا
تھا، اس کا انداز تحاطب اور لٹھ مارتا ہوا لہجہ اسے انتہائی ناگوار گزارا تھا بلکہ اسے تو غصہ آنے لگا
تھا کہ اسے جس طرح غلت میں ایمر جنسی کال کے طور پر بلوایا گیا تھا، وہ اسے دور دور تک
یہاں محسوس نہیں ہو رہی تھی، اس کے ساتھ میڈیکل بیگ سنبھالے ہوئے موسیٰ بری طرح
گھبرائی ہوئی حیران پریشان کھڑی تھی۔

”تم تو کہہ رہے تھے تم کو یہاں کسی عورت کا مسئلہ ہے، کہاں ہے وہ عورت.....؟“
ڈاکٹر فوزیہ نے اس کرخت رونو جوان کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے قدرے تلخ لہجے میں منشی
سے پوچھا۔ اس کے پتلے پتلے سیاہ ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ عود کر آئی۔

تسلے جلتی اتنی ریت اب ٹھنڈی ہونے لگی تھی، طباق چاند ننھے منے تاروں کی فوج سمیت
آسمان پر ٹکا ہوا تھا، صحرا میں بکھری ہوئی نرم نرم گداز چاندنی بکھری ہوئی تھی، سارنگ نے
جیسے تیسے مختصر سا خیمہ ایستادہ کیا، بچا کھچا پانی بچے اور فرید کو پلا دیا جبکہ انتہائی قلیل مقدار میں
پانی کو اگلے دن کے جنم زار سے گزرنے کے لیے بچا لیا گیا، اب ان کا ارادہ پانی پینے کا
نہیں تھا بلکہ ململ کے کپڑے کو گیلیا کر کے اسے اگلا سارا دن چوس چوس کر گزارنے کا تھا،
بھوک کے مارے ان کے پیٹ پچک کر کمر سے جا لگے تھے۔ خیمہ وغیرہ ایستادہ کرنے کے
بعد سارنگ نے اللہ وسائی سے کہا۔ ”بھابی.....! میں ذرا ادھر ادھر کچھ کھانے کو تلاش کرتا
ہوں، کم از کم تمہیں اور فرید کو کچھ کھانے کو مل جائے۔“

”مم..... مگر ادا سارنگ.....! تم اتنی رات کو اس ویران صحرا میں کیا تلاش کرو
گے.....؟ یہاں تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔“ اللہ وسائی نے کسی قدر پریشان ہو کر سارنگ کے
چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سارنگ ہچکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”بھابی.....! کچھ نہ کچھ تو ہاتھ پیر مارنے
پڑیں گے ہی ورنہ ریت کا یہ بے رحم سمندر ہمیں لے ڈوبے گا..... پیٹ کا جنم تو سرد کرنا ہی
پڑے گا..... تو آرام سے ادھر بیٹھ، میں ابھی آجاتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر سارنگ اٹھ کھڑا ہوا
اور خیمے سے باہر اندھیرے میں نکل آیا۔

چہار سو ریت کا سمندر مدہم چاند کی طلسماتی روشنی میں دمکتا محسوس ہو رہا تھا، اطراف
میں ذرا ذرا فاصلے پر بکھرے ہوئے ریتیلے ٹیلوں پر ویرانی مسلط تھی، صحرا کی اسرار بھری رات
گویا ان ویران ٹیلوں پر سسک سسک کر رینگ رہی تھی، سارنگ نے ایک گہری سانس بھری
اور اللہ کا نام لے کر آگے بڑھ گیا، وہ بالکل ناک کی سیدھ میں چلا جا رہا تھا اور ٹھنڈی ریت
پر دانستہ اپنے پاؤں گھسیٹنے کے انداز میں چل رہا تھا تاکہ وہ اس سراب زدہ صحرا میں واپس
اپنے خیمے تک کا راستہ نہ بھول جائے، جانے کیوں اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ کھانے، پینے کی
کوئی نہ کوئی شے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ تھا بھی تو اپنی ہٹ کا پکا۔ اس نے
پانی کی وہ مشکیزہ نما بڑی سی بوتل بھی تو اسی طرح تلاش کی تھی جس نے اس کی امیدوں کو
مزید جوشیلی تحریک دی تھی۔

وہ اب اپنے خیمے سے کافی دور نکل آیا تھا، اس نے ذرا رک کر اپنے عقب میں یونہی
نگاہ دوڑائی، خیمہ اب اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا، وہاں اب دور دور تک پُر اسرار
چاندنی میں ہولناک ریتیلے ویرانوں کے سوا کچھ نہ تھا، سارنگ پھر آگے بڑھنے لگا۔

”ڈاکٹرنی صاحبہ.....! میں نے کب جھوٹ بولا تھا، آپ آرام سے بیٹھو تو سہی، آپ کو سب سمجھاتے ہیں۔“ اس نے اسرار بھرے لہجے میں کہا۔
ڈاکٹر فوزیہ ایک بار پھر اس کی طرف بھیجتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے درشت لہجے میں بولی۔ ”دیکھو مسٹر.....! میں یہاں کچھ سمجھنے یا سمجھانے کے لیے نہیں آئی ہوں اور نہ ہی مجھے تمہارا یہ گھنایا مذاق پسند آیا ہے۔“
”ڈاکٹر.....! آرام سے کرسی پر بیٹھ جاؤ اور ہماری بات غور سے سنو۔“

اس کرخت رونو جوان نے سرسراتے ہوئے بارعب لہجے میں ڈاکٹر فوزیہ سے کہا تو نے کیوں اس کے لہجے پر ڈاکٹر فوزیہ کو اپنے اندر انجانے خوف کی لہریں دوڑتی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے اعصاب منتشر نہیں ہونے دیئے، وہ اس متوقع وڈیرے زادے کے رونت آمیز لہجے سے مرعوب ہوئے بغیر اس کی طرف دیکھ کر سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”دیکھو مسٹر.....!“

”جہاں دادخان نام ہے میرا.....!“
”ہاں مسٹر جہاں دادخان.....! یہ شخص جو شاید آپ کا منشی ہے، مجھے یہاں.....“

”ہوں.....! میں جانتا ہوں بابا..... جانتا ہوں۔“ جہاں دادا ایک بار پھر اس کی بات کاٹ کر بولا اور ساتھ ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور ڈاکٹر فوزیہ کے چہرے کی طرف عجیب نظروں سے گھورتا ہوا اس کے قریب آیا، ڈاکٹر فوزیہ اس کی بڑی بڑی جھپتی ہوئی آنکھوں میں کروٹیں لیتی پُر اسراریت کو محسوس کر کے بے اختیار چند قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئی، مسہری پریشانی ہوئی نوخیز دوشیزہ یکدم مسہری سے اٹھ کھڑی ہوئی، اس کے انداز سے ابھی تک گھبراہٹ اور پریشانی مترشح تھی۔

”سنو ڈاکٹرنی صاحبہ.....! ہمارا ایک چھوٹا سا کام کر دو۔ ہم تمہیں اس کا منہ مانگا انعام دیں گے۔“ وڈیرے زادے جہاں داد نے ڈاکٹر فوزیہ کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر فوزیہ ہلکی۔ اسے جہاں داد کی بات سخت ناگوار گزری تھی۔ اس نے اپنے مرتعش حواس پر قابو پانے کے لیے ایک طویل سانس بھری۔

یہاں کا پُر اسرار ماحول، جہاں داد کا انداز خطاب، ڈری سہمی نوخیز دوشیزہ..... ان سارے عوامل نے ڈاکٹر فوزیہ کو ایک لمحہ میں اعصاب زدہ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر فوزیہ کو اس سارے معاملے میں دال میں کالا نظر آ رہا تھا۔ تاہم وہ خود پر قابو پاتے ہوئے قدرے تلخ لہجے میں بولی۔ ”دیکھئے مسٹر جہاں داد.....! مجھے یہاں ایک مریضہ کو دکھانے کے لیے لایا گیا

تھا مگر یہاں مجھے کوئی مریض نظر نہیں آ رہا ہے۔ اس لئے میں اب واپس جانا بہتر سمجھوں گی۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر فوزیہ واپس ہٹتی۔

”شہرہ.....!“ اچانک ڈاکٹر فوزیہ کی سماعتوں میں جہاں داد کی گونجدار آواز گونجائی اور وہ سن ہو کر رہ گئی۔ اس کے پلٹتے ہوئے قدم رک گئے تھے۔

”ڈاکٹرنی صاحبہ.....! آپ ناراض مت ہونا۔ ہمیں آپ کا ہر حال میں احترام لازم ہے..... آپ ہماری بات سن لیتیں تو بڑی مہربانی ہوتی۔“ اس بار جہاں داد کا رویہ غیر متوقع طور پر نرم سا ہو گیا جس نے ڈاکٹر فوزیہ کو اس کی بات سننے پر مجبور کر دیا۔

”جی بولیں.....“ ڈاکٹر فوزیہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر سپاٹ لہجے میں کہا۔

جہاں داد دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب آیا۔ ”اس لڑکی کا پاؤں بھاری ہے۔“ جہاں داد کا اشارہ گھبرائی ہوئی اور سراسیمہ لڑکی طرف تھا۔ ”آپ اس کو کسی طرح اس مصیبت سے نجات دلا دیں۔ اس کے لیے آپ جتنی رقم.....“

”جہاں داد صاحب.....!“ ڈاکٹر فوزیہ لرزتی ہوئی آواز میں اس کی بات کاٹتی ہوئی بولی۔ اس نے چشم زدن میں اس کی بات سے اندازہ لگا لیا تھا کہ اصل ”معاملہ“ کیا ہے۔ وہ جان گئی تھی کہ اسے ایک جرم کی پردہ پوشی کے لیے ادھر لایا گیا ہے۔ ”جس منہ مانگی رقم کا آپ ذکر کر رہے ہیں..... وہ آپ اب یاس ہی رکھیں، میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گی جس سے میرے معزز پیشے پر دھبہ لگے۔ ڈاکٹر فوزیہ یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

ٹھیک اسی وقت منشی قسم کا شخص حرکت میں آیا اور اس کا راستہ روک کر اسے گھورنے لگا۔ موسیٰ کی تو روح فنا ہو گئی۔ خود ڈاکٹر فوزیہ بھی ایک لمحے کو لرزی گئی۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے اپنی سراسیمگی پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”یہ کیا بد تمیزی ہے، ہنواگے سے.....“
مگر ڈاکٹر فوزیہ کی بات کا اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔ ڈاکٹر فوزیہ کے اندر سنسناہٹ بڑھنے لگی۔

”ڈاکٹرنی صاحبہ.....! آپ کو ہر حالت میں ہمارا یہ کام کرنا پڑے گا۔“ معاً عقب سے جہاں داد کی سرسراہٹ آواز ابھری۔

ڈاکٹر فوزیہ اس لہجے پر کانپ سی گئی۔ مگر ہمت کر کے پلٹی اور جہاں داد کو گھورتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولی۔ ”یہ سراسر غیر قانونی ہے۔ میں یہ جرم نہیں کر سکتی۔ مجھے یہاں سے جانے دیا جائے ورنہ.....“ ڈاکٹر فوزیہ کی کمزور تنبیہ پر جہاں داد کے ہونٹوں پر زہر خند مسکراہٹ نمودار ہو گئی اور پھر وہ بر ماتی ہوئی آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔

وقت اس نے اپنے حواریوں کو ایک مخصوص اشارہ کیا تو اس کے دو کارہے آگے بڑھے اور انہوں نے فرش پر روتی اس نوجوان لڑکی کو بازوؤں سے پکڑ کر نہایت بیدردی سے مسہری پر پھینک دیا۔

ڈاکٹر فوزیہ کو لڑکی کی حالت پر رحم اور جہاں دا کی سنگ دلی پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ مگر وہ بھلا کیا کر سکتی تھی۔ وہ خود ان کے سامنے بے بس تھی۔ لڑکی اب مسہری پر دراز ہو چکی تھی اور گھٹی گھٹی سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔

ڈاکٹر فوزیہ نے جہاں داد کی طرف دیکھ کر سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”تم سب کو اس کمرے سے باہر نکلتا ہوگا۔“

اس کی بات سن کر جہاں داد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے۔“ اس نے اپنے دونوں حواریوں کو کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کیا۔

”یہاں کوئی مرد نہیں رکے گا۔۔۔۔۔ تم دونوں کو بھی باہر جانا ہوگا۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے چپھٹے ہوئے لہجے میں جہاں داد کی طرف دیکھ کر کہا۔

وہ نخوت بھرے لہجے میں بولا۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔۔۔ آپ اپنا کام کرو۔“

”مگر یہ میرے پروفیشن کے خلاف ہے کہ کوئی مرد یہاں موجود ہو۔ اس طرح میں اپنا کام تسلی بخش طریقے سے نہیں کر پاؤں گی۔ اسے میری مجبوری سمجھ لو۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے گہری متانت سے کہا۔

جہاں داد تذبذب کا شکار ہو گیا۔ ایسے میں اچانک اس کے قریب کھڑے منشی ٹائپ شخص نے جہاں داد سے کہا۔ ”سائیں وڈا! آجاؤ۔۔۔۔۔ باہر چلتے ہیں۔۔۔۔۔ میڈم کو اپنا کام آزادی سے کرنے دو۔“ اپنے منشی کی بات پر جہاں داد نے سنسناتی ہوئی گہری سانس بھری اور پھر دھیرے دھیرے اپنا سر اثبات میں ہلاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

منشی بھی دانت نکالتا ہوا اپنے سائیں وڈے کے عقب میں چلتا کمرے سے نکل گیا۔

”دروازہ اندر سے اچھی طرح بند کر دو موسیٰ۔“ ان دونوں کے کمرے سے نکلتے ہی ڈاکٹر فوزیہ نے مرتعش آواز میں موسیٰ سے کہا تو موسیٰ نے میڈیکل باکس نیچے رکھ کر فوراً دروازے کی چنجی چڑھا دی۔

ڈاکٹر فوزیہ مسہری کے قریب آئی۔ اس کی نگاہیں سسکیاں لیتی مسہری پر دراز اس لڑکی پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے اس پر ترس آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی جانے یہ کون ہے اور کس غریب باری کی بیٹی ہے جو اس بھیڑیا صفت وڈیرے زادے کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔

”اس دھرتی کے مالک ہم ہیں۔۔۔۔۔ یہاں قانون بھی ہمارا چلتا ہے۔ تم کو ہماری بات ماننی پڑے گی۔۔۔۔۔ ورنہ ہمیں مجبوراً دوسرا طریقہ آزمانا پڑے گا۔“ اس کے لہجے کی نخوت پر ڈاکٹر فوزیہ کا غصہ اور خوف کی ملی جلی کیفیات سے پورا دو جو مرتعش سا ہونے لگا۔ وہ مارے بے بسی کے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

”دوسرے طریقے“ سے جہاں داد کی کیا مراد تھی؟ فوراً یہ کو اس کا اندازہ تھا۔ وہ اب یہاں آکر بری طرح پچھتا رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خونخوار بھیڑیوں کے بھٹ میں آ پھنسی ہو۔

جہاں داد کے ایک دو اور مسلح حواری بھی وہاں آن موجود ہوئے تھے۔ وہ بھی اپنی خوفناک آنکھوں سے اس کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر فوزیہ اب محسوس کرنے لگی تھی کہ اس کے پاس اب ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تاہم وہ مفرکی ایک آخری سعی کرتے ہوئے قدرے معتدل لہجے میں بولی۔ ”ٹھیک ہے پھر۔۔۔۔۔ لیکن میں ایک بار اپنے عملے کے لوگوں سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”ان کی تم فکر نہ کرو۔“ جہاں داد نے بے اعتنائی سے کہا۔ ”وہ ہمارے آدمیوں کی نگرانی میں بہ خیریت ہیں اور ویسے بھی ان لوگوں کو تم نے“ اندر کی بات“ نہیں بتانی ہے۔ چلو اب کام شروع کرو۔ زیادہ وقت نہ تمہارے پاس ہے نہ ہمارے پاس ہے۔“

ڈاکٹر فوزیہ بے بسی کے ساتھ اپنے ساتھ کھڑی موسیٰ کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بے چاری خود فوزیہ کو کبھی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ اب ان لوگوں کی بات ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ ڈاکٹر فوزیہ نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر مسہری کی طرف بڑھی۔ وہ نوخیز دوشیزہ بنوز گھبرائی ہوئی پائنتی کے سہارے مسہری سے نکلی کھڑی تھی۔

فوزیہ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس کی حالت مزید غیر ہونے لگی اور بے اختیار وہ آگے بڑھ کر روتی ہوئی جہاں داد کے قدموں میں گر گئی اور گر گڑا تے ہوئے بولی۔

”ناسائیں نا۔۔۔۔۔ میرے ساتھ یہ ظلم نہ کرو۔ میں اپنا بچہ مارنا نہیں چاہتی۔ اللہ سائیں کا واسطہ مجھ پر اور میرے بچے پر رحم کرو۔“

ڈاکٹر فوزیہ اس لڑکی کی گریہ و زاری پر مزید پریشانی کا شکار ہو گئی۔ اب اسے بھی ایک کریدی لگ گئی تھی کیونکہ اصل حقیقت سے بنوز وہ لاعلم ہی تھی۔

”اڑی بکواس بند کر۔۔۔۔۔ نہیں تو ادھر ہی جان سے مار کر زمین میں گاڑ دوں گا۔ چل جا۔۔۔۔۔ سو جا مسہری پر۔“ جہاں داد نے غصیلے لہجے میں اسے پاؤں کی ٹھوکر رسید کی۔ پھر اسی

رکھا تھا۔ کہیں سے انہیں چاندی سونے کے زیور ہاتھ لگے تھے تو کہیں سے مال و اسباب کی صورت میں خوبصورت اور جوان عورتیں اور لڑکیاں۔ جنہیں ان لوگوں نے ایک دیران اور اجڑی بستی کے ایک بڑے بے گوپے میں قید کر رکھا تھا۔

مسلل تین چار دنوں تک لوٹ مار کرنے کے بعد آخری بارسائیں کے قافلے کو لوٹا گیا تھا۔ تمام مال و اسباب سمیت کراپنے اصل ڈیرے پر جا پہنچے تھے۔

لیروں کا یہ گروہ پیشہ ورنہ تھا۔ یہ بھوک اور افلاس کے مارے یا کام سے جی چرانے والے اور آسان راستے کے ذریعے مال حرام کھانے والے افراد کا گروہ تھا۔ پہلے یہ لوگ تین تھے۔ جمعہ خان، پوپٹ اور خمیسو۔ تینوں کا کام چوری چکاری کرنا تھا بالخصوص صحرائی قہر میں تحقیقاتی سروے یا ٹور پر آئی ہوئی ٹیموں کے افراد یا شہر جانے والے قافلوں کو لوٹا کرتے تھے۔

سائیں بخش کے قافلے میں انہیں یوں تو مال و اسباب ہاتھ نہ لگا تھا البتہ دو جوان اور خوبصورت چھوکر یاں ان کے ہاتھ ضرور لگی تھیں۔ ان میں ایک سکھیو کی بیٹی میراں تھی اور دوسری مٹھل ہاری کی بیٹی ملو کاں تھی، جو سارنگ کی بہن تھی۔ ان دونوں کے علاوہ جمعہ خان، پوپٹ اور خمیسو کے ہمراہ لگ بھگ گیارہ جوان عورتیں اور صحرائی لڑکیاں تھیں۔ ان سب کو ایک ایک چھو لاری میں قید کر دیا گیا تھا اور ان پر سخت پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ جمعہ خان، پوپٹ، اور خمیسو تقریباً پچیس لیروں کے گروہ کی ”کمانڈ“ کرتے تھے۔ ان کا صحرائی ڈیرا گاؤں گوٹھوں کی آبادی سے بہت دور واقع تھا۔ اسی لئے یہ لوگ بڑی آزادی سے یہاں بلا لگا کرتے تھے۔ باقاعدہ ایک جشن کا ساماں پیدا ہو جاتا تھا۔

اس وقت بھی یہ لوگ فتح کے نشے میں چور محفل سجائے ہوئے تھے۔ ایک جگہ الاؤ روشن تھا جس پر صحرائی خرگوش اور بھٹ تیر بھونے جا رہے تھے۔ یہ لوگ آپس میں ہنسی مذاق میں مصروف تھے۔

ادھر بڑی سی چھو لاری میں جن گیارہ بد نصیب عورتوں اور لڑکیوں کو قید کر رکھا تھا، وہ گھٹنوں میں سر دیئے اپنے نصیبوں کو رو رہی تھیں۔ باہر الاؤ کے گرد صحرائی لیروں کا بے ہنگم شور ان کی سماعتوں کو چیرے دے رہا تھا۔ ملو کاں اور میراں آپس میں جڑی بیٹی تھیں اور دیگر عورتوں کی طرح خوف زدہ انداز میں سسکیاں لے رہی تھیں۔ ساتھ ہی ان دونوں کے دلوں میں یہاں سے بھاگ نکلنے کی جرأت خیزی بھی جنم لے رہی تھی۔ اس جرأت انگیزی کا سبب ان کے ہاتھوں پیروں کی آزادی تھی۔ یہ لوگ سرکنڈوں کی اس چھو لاری کے اندر

”تمہارا نام کیا ہے..... کون ہو تم؟“ ڈاکٹر فوزیہ نے قدرے نرم لہجے اور دھیمی آواز میں اسے مخاطب کر کے پوچھا تو اس لڑکی نے اپنی سسکیوں پر قابو پاتے ہوئے لرزیدہ آواز میں اپنا نام سدھوراں بتایا۔

”تم کس کی بیٹی ہو اور جہاں داد سے تمہارے کب سے اس قسم کے تعلقات ہیں؟“ ڈاکٹر فوزیہ نے یہ غور اس کے ستے ہوئے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے اگلا سوال کیا۔ یہ لڑکی اسے غیر معمولی حسین نظر آرہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرنگیں اور بڑی بڑی تھیں۔ چہرہ کنول کی طرح اگرچہ شاداب تھا مگر اس سے اس کے معصوم اور ملوکوتی حسن پر کچھ کے چھینٹے پڑ چکے تھے۔

”مم..... میں..... جی وہ..... وہ.....“ سدھوراں کے سسکتے حلق سے بے ربط انداز میں نکلا اور پھر اچانک جانے اسے کیا ہوا کہ وہ یکدم مسہری سے اٹھ کھڑی ہوئی اور نیچے اتر کر ڈاکٹر فوزیہ کے پیروں کو چھونے لگی۔ مگر ڈاکٹر فوزیہ جو پہلے ہی اس کے اس اچانک مسہری سے اترنے کا مطلب سمجھ چکی تھی فوراً اپنے پیروں پہ جھکنے سے روکنے لیے اسے دونوں شانوں سے تھام لیا اور قدرے ملائمت آمیز ڈانٹ سے بولی۔

”کیوں خود کو اس طرح گراتی ہو۔ تم تو نظروں سے بھی گر چکی ہو..... اب بھلا تمہارے پیروں پر گرنے کی کیا اہمیت ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی ڈاکٹر فوزیہ کے لبوں پر کڑوے کیلے الفاظ در آئے۔

سدھوراں نے ہیکلی ہوئی نگاہوں سے ڈاکٹر فوزیہ کی طرف دیکھا۔ تو ڈاکٹر فوزیہ کو سدھوراں کی نمناک آنکھوں سے مجبوری کے آنسو بہتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

”ڈاکٹر فی صاحبہ.....! مجھے اپنے کئے کی سزا ملنی چاہئے۔ میں اس قابل ہوں کہ اب ساری زندگی لوگوں کی ٹھوکروں میں رہوں۔ مگر..... میں اپنے بچے پر ظلم برداشت نہیں کر سکتی۔ اس معصوم اور گریب کا کیا قصور.....“ اتنا کہہ کر ایک بار پھر بلک بلک کر رونے لگی۔

☆=====☆=====☆

صحرائی لیروں کے قافلے میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کرنے کے بعد خاطر خواہ مال لوٹ کر اپنے صحرائی ڈیرے پر پہنچے۔ ان کا صحرائی ڈیرا ریگ زار کے بعد ترین گوشے میں تھا جہاں ہر راستہ ان کے صحرا کی حدود ملتی تھیں۔ یہ ان کی آخری کارروائی تھی۔ چار دن مسلسل ان صحرائی لیروں نے آس پاس کے علاقوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کر

ایک نظر قریب سر دھنتے ہوئے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور قدرے تذبذب کا شکار نظر آنے لگا۔ پھر جب وہ اس کی طرف بڑھنے لگا تو اچانک ملوکاں نے اسے روک کر ایک ادا سے پوچھا۔ ”کدھر جا رہے ہو؟“

”اڑیں ساتھی کو بھی تو بتا دوں۔“ اس نے دبی دبی مسرت سے کہا۔
”اس کی کیا ضرورت ہے..... کیا تم اکیلے ہم دونوں کی نگرانی نہیں کر سکتے۔“ ملوکاں نے چالاکی اور بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا کر اس سے کہا۔

وہ سینہ پھلا کر بولا۔ ”ہاں..... ہاں..... کیوں نہیں..... چلو آؤ۔“ یہ کہہ کر اس نے چھا بڑھایا۔ ملوکاں اور میراں باہر نکلیں۔ وہ لیرا ان دونوں کو سر کندوں کی آڑ لیتا ہوا عقب میں لے آیا۔ ملوکاں اور میراں یہاں رک گئیں اور شرمانے کے انداز میں لیرے کی طرف دیکھنے لگیں۔

”تم اپنا منہ دوسری طرف کر کے کھڑے ہو جاؤ۔“ ملوکاں نے شرمانے مئی بھر پور اداکاری کرتے ہوئے کہا اور اس صحرائی لیرے نے ان دونوں کو مسکرا کر دیکھا پھر اپنا منہ دوسری طرف پھیر کر کھڑا ہو گیا۔

ملوکاں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ..... میراں کا ہاتھ پکڑا اور اونٹوں کی کجادری کے درمیان دبک کر بیٹھ گئیں اور اوٹ سے لیرے کی طرف دیکھنے لگیں۔

”ادی ملوکاں.....! یہ کم بخت غصے میں آکر ہمیں نقصان نہ پہنچا دے۔“ میراں نے متوحش لہجے میں ملوکاں کے کان میں سرگوشی کی۔

”نہیں..... یہ نشے میں ہے۔ ابھی خود اس کا دماغ درست ہو جائے گا۔“ ملوکاں نے جواباً اسے تسلی دی۔ میراں کی نسبت ملوکاں فطرتاً بہادر لڑکی تھی اور ذہین بھی..... بچپن میں بہت شرارتی ہوتی تھی۔ ملوکاں اور میراں کا بچپن ایک ساتھ ہی گزرا تھا۔ اچانک صحرائی لیرے نے مڑ کر دیکھا۔ ملوکاں اور میراں کو غائب پا کر وہ اپنی آنکھیں بار بار منسل کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ چند ثانیے ہکا بکا کھڑا رہا۔ اس کے بعد اس نے اس طرح اپنا سر ہلایا جیسے اس نے کوئی خواب دیکھ لیا تھا یا اسے وہم ہوا ہو۔ پھر وہ جھومتا ہوا دوبارہ سر کندوں کی جھولداری کی طرف چل دیا۔

”چلو میراں..... بھاگ چلو!“ ملوکاں نے میراں کا بازو پکڑتے ہوئے جوش سے مرتش لہجے میں کہا تو میراں بولی۔

”ملوکاں.....! یہ اونٹ؟ کیا ہم ایک اونٹ پر نہیں فرار ہو سکتے؟“

آزاد تھیں جبکہ باہر پہرہ تھا۔ صحرائی لیروں کو شاید اپنی طاقت کا کچھ زیادہ ہی زعم تھا، جو کسی حد تک درست بھی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ ڈری سہمی ہرنیاں بھلا یہاں سے بھاگ کر کہاں جا سکتی ہیں لیکن ملوکاں اور میراں نے اب رونا دھونا چھوڑ کر یہاں سے فرار ہونے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔

ان دونوں نے دل میں پکا تہیہ کر لیا تھا کہ آج رات ان پر قیامت ٹوٹنے سے پہلے یہاں سے بھاگ نکلیں گی یا پھر اپنی چوڑیاں توڑ کر کھالیں گی۔ ان دونوں نے سرسری طور پر آس پاس کا جائزہ لیا۔ دیگر عورتوں نے بھی اب رونا دھونا چھوڑ کر شاید خود کو تقدیر کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ سب اپنے اپنے کونے کھدروں میں دبکی ہوئی تھیں۔ اتنے میں ملوکاں اور میراں اپنی جگہ سے اٹھیں اور دروازے کے قریب آئیں۔ دروازہ بند تھا بلکہ دروازہ کیا تھا ایک چھا بڑ سا چوکت میں پھنس دیا گیا تھا، جس کے روزنوں سے باہر تاریک صحرا میں جلتے الاؤ کی تیز روشنی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ملوکاں نے جھری سے آنکھ لگا دی۔ اسے سارے لیرے الاؤ کے گرد شراب کے نشے میں دھینکا مشتی کرتے نظر آئے۔ دو افراد جنہوں نے لمبی نال والی بند و قیس تھام رکھی تھیں، وہ بھی اپنے حصے کی شراب وہیں کھڑے کھڑے نوش کر رہے تھے اور جھوم رہے تھے۔ وہ نام کو پہرہ داری کر رہے تھے۔ اچانک ملوکاں کی نگاہ قریب ہی بندھے ہوئے اونٹوں پر پڑی۔ وہ کوئی پانچ چھ کے قریب تھے۔ ان پر کچا دے بھی لگے ہوئے تھے۔ ایک خیال کے تحت ملوکاں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے ہلکی سی سرگوشی میں میراں کو اپنے منصوبہ سے آگاہ کیا۔ کسی نے درست کہا ہے کہ جب جان پر بن آتی ہے تو گیدڑ بھی شیر بن جاتا ہے اور لمبی بھی کتے پر جھپٹ پڑتی ہے لہذا دونوں نے ایک منصوبے پر صادقاً اور پھر اگلے ہی لمحے ملوکاں نے جھری کے قریب اپنا منہ کر کے پہرے دار کو آواز دیتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کیا۔ حسب توقع پہرہ دار جھومتا جھومتا چھا بڑے کے قریب آیا۔

”در کھول..... مجھے ضرورت سے باہر جانا ہے۔“ ملوکاں نے معصومیت سے کہا تو پہرے دار کے چہرے پر ایک شیطانی چمک لہرائی۔ اس نے جھٹ سے چھا بڑ کا دروازہ ہٹا دیا اور ملوکاں اور میراں کے چہروں کو گھورنے لگا۔ پھر اپنی مسرت کو دباتے ہوئے بولا۔
”کیا تم دونوں جاؤ گی؟“

ملوکاں اور میراں نے ہولے سے مسکرا کر اثبات میں سر ہلادیا۔ ”مسکراہٹ“ ان کے منصوبے کا حصہ تھی۔ شراب کے نشے میں مدہوش صحرائی لیرا جھوم اٹھا۔ اس نے پہلے

”نہیں میرو.....! اس طرح یہ سارے شیطان ہماری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔“
ملوکاں نے کہا۔

”لیکن ملوکاں..... وہ باقی لڑکیاں اور عورتیں.....“ میراں نے دکھ سے کہا۔

”ان کے لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے..... چلو.....“ ملوکاں بولی۔

وہ دونوں چاند کی مدھم طلسماتی روشنی میں صحرا کی تاریک وسعتوں میں نامعلوم منزل کی طرف بڑھ گئیں۔ الاؤ کے گرد صحرائی لٹیروں کا طوفان بدتمیزی عروج پر تھا۔

☆=====☆=====☆

سارنگ کی آنکھ کھلی تو وہ قدرے گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے محسوس کئے تھے۔ وہ ایک جھوپڑی کے اندر تھا۔ اس کے قریب ایک لبوترے چہرے والا شخص بیٹھا تھا۔

”کون ہو تم..... کیا نام ہے تمہارا؟“ اس لبوترے چہرے والے شخص نے پُراسرار لہجے میں پوچھا۔

”سارنگ ہے میرا نام۔“ اس نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ سارنگ کو یہ شخص اس دھرتی کا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اب سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ اس شخص نے اسے جھکا بھر کر پانی پلایا۔

”زیادہ نہیں پی..... الٹی آ جاوے گی..... کچھ کھائے گا بھی؟“ اس پُراسرار شخص نے پوچھا۔

سارنگ اب اس کو رحمت کا فرشتہ سمجھنے لگا تھا، بولا۔ ”سائیں تمہاری بڑی مہربانی..... میرے ساتھ ایک عورت اور دو معصوم بچے بھی ہیں..... اودھر خیمے کے اندر..... انہوں نے بھی کچھ نہیں کھایا پیا۔“

سارنگ کی بات سن کر لبوترے چہرے والے شخص کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ اس کی آنکھوں میں اچانک عجز کر آنے والی پُراسرار چمک سارنگ محسوس نہیں کر سکا تھا۔

”چلو آؤ میرے ساتھ..... اونٹ لے چلتے ہیں۔ ان کو بھی ادھر ہی لے آتے ہیں۔“ اس شخص نے کہا اور سارنگ جھٹ اٹھ کھڑا ہوا اور ممنون نظروں سے اس فرشتہ صفت انسان کو دیکھنے لگا۔

قصہ کوتاہ ذرا دیر بعد دونوں اونٹ کے کجاوے میں سوار ہو کر اللہ وسائی کے اجڑے خیمے کے قریب پہنچے۔ اپنے آرام دہ خیمے سے نکلنے وقت لبوترے چہرے والے نے پانی کی بوتل اٹھائی تھی۔ اونٹ کو آواز دے کر نیچے بٹھایا پھر یہ دونوں اتر کر اندر خیمے میں آئے۔ اللہ وسائی سارنگ کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر قدرے چونکی مگر جب اس شخص نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ میں پکڑی پانی کی بوتل اللہ وسائی کی طرف بڑھائی تو اس نے جھٹ سے بوتل اس کے ہاتھوں سے پکڑ کر منہ سے لگالی۔ پھر فریاد کو بھی بہت سا پانی پلایا۔ وہ دونوں اب اس مہربان شخص کو احسان مند نظروں سے نکلنے لگے۔

وہ شخص ملائمت آمیز لہجے میں بولا۔ ”تم سب چلو میرے ساتھ..... خوب پیٹ بھر کر روٹی کھاؤ اور جدھر کہو گے، میں تم لوگوں کو چھوڑ دوں گا۔“ سارنگ اور اللہ وسائی ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے تو وہ پھر بولا۔ ”گھبراؤ نہیں میں سرحد پار کا ایک مسافر ہوں..... یہاں سے گزر رہا تھا۔ کھجور کی گٹھلیوں کا کاروبار کرتا ہوں، یہاں سے حیدر آباد جا رہا تھا پر یہاں لوگوں کو بھوک پیاس سے مرتے ہوئے دیکھ کر مجھے بڑا ترس آیا تب میں ادھر ہی رک گیا کوئی بھولا بھٹکا مل جاتا ہے تو اس کی مدد کر کے خوشی ہوتی ہے۔“

اس اجنبی کی باتوں سے سارنگ اور اللہ وسائی بہت متاثر ہوئے۔ اس کے بعد وہ اجنبی انہیں اونٹ پر سوار کروا کر اپنے آرام دہ خیمے میں لے آیا۔ وہاں اس نے ابلے ہوئے چاولوں اور دال بھات سے ان کی خوب تواضع کی..... کھاپی کر یہ لوگ تازہ دم ہو گئے۔ شکم سیری ہوئی تو دماغ نے سوچنا شروع کر دیا اور جانے کیوں پہلی بار اللہ وسائی اس اجنبی کو دیکھ کر بے چینی سی محسوس کرنے لگی۔ اس نے اکثر اسے اپنی طرف عجب نظروں سے گھورتے ہوئے پایا تھا۔ اس کے لبوترے چہرے پر چندھی چندھی آنکھوں کی تپش اللہ وسائی کو اپنے چہرے پر صاف محسوس ہوتی تھی۔ مگر پھر جلد ہی اس شخص نے..... ”دھی راڑیں..... دھی راڑیں“ کہہ کر جب اللہ وسائی کو پکارا تو اللہ وسائی کو خود اپنے آپ پر شرمندگی ہونے لگی کہ اس نے بلاوجہ ایک فرشتہ صفت انسان پر شبہ کیا۔ اس شخص نے اپنا نام گارتیا بتایا تھا۔

یہ عجیب نام سن کر اللہ وسائی کو حیرت تو ہوئی مگر پھر گارتیا کی سرحد پار رہائش پر وہ چپ ہو رہے۔ گارتیا کا خیمہ نہ صرف خاص کشادہ تھا بلکہ آرام دہ بھی تھا اور بنیادی ضروریات سے بھی مالا مال تھا۔ سارنگ کو حیرت ہوئی تھی کہ یہ کیسا عجیب شخص ہے کہ اس فلاکت زدہ ویرانے میں پڑا ہے۔ آخر کب تک اس کا راشن پانی چلے گا۔ سارنگ نے دل ہی دل میں ارادہ کیا کہ وہ اس شخص کو یہاں سے فوری نکل جانے کے لیے کہے گا۔ اس

کے پاس اپنا اونٹ بھی ہے، جس پر ”کجادہ“ بھی بنا ہوا تھا جس کے اندر آرام سے آگے پیچھے چار افراد سوار ہو سکتے تھے۔ اچانک ان کی آنکھیں نیند سے جھل ہونے لگیں۔ یہ شاید شکم سیری کا اثر تھا کہ سارنگ اللہ وسائی اور نو سالہ فرید واپنی اپنی جگہ پر بے سدھ ہو کر لڑھک گئے۔

گاتریا ذرا فاصلے پر میلی چیکٹ رلی پر بیٹھا ان کے بے سدھ پڑے جسموں کو گہری نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ اس کے پتلے پتلے سیاہ رو بدبیت ہونٹوں پر بڑی عجیب مسکراہٹ رقصاں تھی۔

☆=====☆=====☆

سب سے پہلے سارنگ کی آنکھ کھلی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی پہلے تو اس کے دماغ میں دھند سی چھائی رہی پھر اسے چکر سے آنے لگے۔ اسے یوں لگا جیسے وہ جاگنا نہ ہو بلکہ ”ہوش“ میں آ گیا ہو۔ اس نے جلدی سے اپنے سر کو دو تین بار جھٹکے دے کر اپنی یادداشت بحال کرنے کی کوشش کی اور اپنی آنکھوں کے آگے ناچتے ہوئے تازے بھی بھگائے۔ تب اچانک اس پر ایک بھیانک انکشاف ہوا۔ وہ خیمے کے اندر نہیں بلکہ ٹھنڈی ریت پر اوندھا پڑا تھا۔ وہ یکدم تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے پاگلوں کی طرح اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آس پاس ٹھنڈی اور نرم چاندنی کے سوا کچھ نہ تھا۔ رات اپنے آخری پہر کی طرف گامزن تھی۔ سب کچھ غائب تھا۔ گاتریا، اس کا آرام دہ خیمہ، بھابی اللہ وسائی، اس کا بچہ منٹھار، نو سالہ فرید و..... ان سب کو جیسے آسمان نکل گیا تھا یا پھر وہ ریت میں دفن ہو چکے تھے۔

سارنگ پاگل ہو گیا۔ جنونیوں کے سے انداز میں اپنے چاروں طرف دوڑتے ہوئے بھابی اللہ وسائی کو آوازیں دینے لگا۔ مگر اس کی آواز آس پاس کے ریتیلے ٹیلوں سے ٹکرا کر واپس آگئی۔ اب سارنگ کا ماتھا ٹھنکا۔ اسے دال میں کالا محسوس ہونے لگا۔ وہ پُر اسرار ہمدرد شخص گاتریا ایک دھوکے باز اور فریبی انسان تھا، جو کھانے پینے میں بے ہوشی کا سفوف ملا کر نہیں بے ہوش کر کے ”پنا“ ”کام“ دکھا گیا تھا یعنی بھابی اللہ وسائی اور فرید کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ سارنگ نے سوچا اور پھر جیسے اس کے دماغ میں پریشانی کے ساتھ ساتھ غیظ کا آتش فشاں بھی پکنے لگا۔ اس نے غصے اور پریشانی کو ایک طرف رکھا پھر غور سے موجودہ حالات کی سنگینی کو کم کرنے کی غرض سے اس نے باریک بینی سے جائزہ لیا۔ اس کے لیے اس نے فوراً زمین پر نگاہ دوڑائی اور مدھم چاندنی میں جلد ہی اسے ریت پر اونٹ کے

بڑے بڑے پیالہ نما پیروں کے نشانات نظر آ گئے۔ جو عقب میں دور ریتیلے ٹیلوں کے درمیان سے گزر کر گم ہو رہے تھے۔ سارنگ ایک بات کا تواب خوب انداز لگا چکا تھا کہ اگرچہ یہ جگہ وہی تھی جہر گاتریا کا خیمہ تھا۔ مگر اب وہ خبیث شیطان اپنا بوریا بستر سمیٹ کر اور بھابی اللہ وسائی کے علاوہ ان کے بچے منٹھار اور فرید کو کو بھی یرغمال بنا کر اپنے ساتھ لے جا چکا تھا۔

سارنگ نے فوراً ایک فیصلہ کیا۔ وہ جلدی سے ریت پر گاتریا کے اونٹ کے پیروں کے نشانات کو دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ نشانات بتدریج واضح ہوتے جا رہے تھے۔ اسی لئے اب سارنگ اپنی سی مقدور بھر کوشش کے سہارے تیز تیز ریت پر چلا جا رہا تھا۔ وہ پُر عزم تھا، ایک لمحہ بھی تاخیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر یہ نشانات معدوم ہو گئے تو وہ ساری عمر مکار گاتریا کو نہیں تلاش کر پائے گا۔ اسے اپنی بھابی اللہ وسائی اور اس کے بچے منٹھار کی فکر لاحق ہونے لگی۔ فرید و کی طرف سے بھی وہ فکر مند تھا۔ نجانے ان تینوں معصوموں کے ساتھ اس دھوکے باز گاتریا نے کیا سلوک کیا ہو؟ و آخر اس کا ان تینوں کو یرغمال بنانے کا کیا مقصد تھا؟ گاتریا درحقیقت کون تھا؟ ایسے ہی پریشان کن اور سوالیہ گمان آمیز خدشات سے سارنگ کو اپنا دماغ شل ہوتا محسوس ہونے لگا۔ وہ تازہ دم تھا اور ریت پر اپنی پوری قوت صرف کرتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھا چلا جا رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر ایک ہی خیال ستارہا تھا کہ اگر دھوکے باز گاتریا بھابی اللہ وسائی اور فرید و کو اپنے ساتھ سرحد پار لے گیا تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ بار بار سارنگ کی آنکھوں کے سامنے اپنی بھابی اور فریدہ کا معصوم اور روتا ہوا چہرہ ابھر رہا تھا۔

سارنگ انہیں یاد کرنا تو اس کے وجود میں چنگاریاں سی دوڑنے لگتیں جو اسے آگے قدم بڑھانے پر مہمیز کر رہی تھیں۔

سارنگ تنہا تر چلتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ رگوں میں خون پارے کی مثل دوڑ رہا تھا۔ کنپٹیاں سلگ رہی تھیں اور فریبی گاتریا کی تصویر ہی تصور میں گردن مروڑے جا رہا تھا۔ سارنگ پیروں کے نشانات کو گم نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس کی شدید خواہش تھی کہ صبح سورج کی روشنی پھیلنے سے پہلے وہ اس مکار گاتریا کو پکڑ لے کیونکہ اگر صبح ہوگئی اور سلگتا سورج ریتیلے ٹیلوں کی اوٹ سے بلند ہوا تو گرم لو کے تیز چلنے والے جھکڑوں سے ریت پر بنے اونٹ کے پیروں کے نشانات معدوم ہوتے چلے جائیں گے۔ سارنگ اپنے شکستہ وجود کی پوری طاقت صرف کئے ریت پر چلا جا رہا تھا۔ اس کے اندر

”ہاں.....! اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہارا آپریشن نہ کروں..... تو بے فکر ہو جاؤ..... میں یہ نہیں کروں گی لیکن اس کے لیے ہمیں تھوڑا ڈرامہ کرنا ہو گا تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔“

قدرے تلخی سے بولی۔ ”ڈاکٹر فی صابہ.....! ان اونچی حویلیوں میں رہنے والوں پر بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔ ان کے پاس بی بی جیسے ہیں، شہروں میں بڑی بڑی کوٹھیاں اور بنگلے ہیں۔ جیسے ہی حالات سازگار ہوتے ہیں، یہ لوگ فصلی بیٹروں کی طرح واپس آ جاتے ہیں اور پھر ظلم و ستم کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔“

”اچھا.....! سدھوراں آگے بتاؤ پھر کیا ہوا..... سانول کہاں گیا اور تمہارے ماں پو؟“ ڈاکٹر فوزیہ نے پوچھا۔

”مومن سون بارشیں نہ ہونے کی وجہ سے جب قحط بڑھنے لگا اور فصلیں سوکھنے لگیں تو لوگ جانے لگے۔ جہاں داد نے میرے کہنے پر میرے ماں پو کو آزاد کر دیا تھا اور سانول کے ماں پو کو بھی..... لیکن جہاں داد نے مجھے سانول سے قطع تعلق کرنے کی سختی سے تاکید کی تھی۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو وہ پھر میرے بوڑھے ماں پو، سانول اور اس کے ماں پو کو دوبارہ قید خانے میں ڈال دیتا..... بلکہ اس بار تو اس مردود جہاں داد نے مجھے کھلے عام دھکی دے دی تھی کہ اگر میں نے سانول کا نام بھی لیا تو وہ سانول کو زندہ نہیں چھوڑے گا اور میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ ایسا کر سکتا تھا بس پھر.....“

”پھر..... تم..... جہاں داد کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ گئیں۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ ”تم اتنی کم ہمت نکلیں۔ میرا خیال تھا کہ اگر تم سانول سے ساری حقیقت کہہ دیتیں تو وہ یقیناً اس کا دوسرا حل ڈھونڈ سکتا تھا۔“

”آپ کو کیا معلوم ڈاکٹر فی صابہ.....! ہم گر بیوں کی ان وڈیروں کے سامنے کیا حیثیت ہے۔ میں نے جو کچھ کیا وقت اور حالات کے عین مطابق کیا لیکن میرے کھلونا بننے میں میرا قصور نہیں ہے کیونکہ جہاں داد نے مجھ سے باقاعدہ شادی کرنے کو کہا تھا۔“

”تم بھی بہت بھولی ہو۔ ایک طرف اس کی طاقت کا تمہیں اندازہ ہے اور دوسری طرف تم ایسے ظالم اور سنگ دل انسان کے وعدے پر بھروسہ بھی کرتی ہو۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے پھٹکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا پھر پوچھا۔ ”تم نے سانول کے بارے میں نہیں بتایا، وہ کہاں گیا؟“

ڈاکٹر فوزیہ کے استفسار پر اس کے معصوم بکل چہرے پر آزدگی چھا گئی پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔ ”میری اچانک بے اعتنائی پر وہ دل برداشتہ ہو کر اپنے ماں پو کو لے کر شہر چلا گیا۔“

”اچھا یہ بتاؤ..... اب جہاں داد تمہیں اس مصیبت سے نجات کیوں دلوانا چاہتا ہے۔“

دیکھ لیا تو بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ میں اس سے کیوں کتر رہی ہوں۔ جہاں داد نے اسے اپنی توہین سمجھا۔ اس نے سانول اور اس کے غریب ماں پو کے خلاف ایک لرزہ خیز چال چلی۔ ہم سب چونکہ وڈیرے میر منصب کی رعایا تھے اور اس کی زمینوں وغیرہ پر کام بھی کرتے تھے، اس لیے اس کے مقروض بھی ہو گئے تھے۔ ہمیں مقروض بنانے میں وڈیرے کے منشی کا بڑا ہاتھ تھا لہذا ہمارے ماں پو بھی وڈیرے کے بیگار باری بن گئے تھے لیکن میری وجہ سے گریب سانول کچھ زیادہ ہی وڈیرے کے بیٹے جہاں داد کے ظلم کا نشانہ بنا۔ اس نے نہ صرف سانول کو بلکہ اس کے ماں پو (ماں باپ) کو بھی اس حویلی کے تہہ خانے میں قید کر دیا۔ یہ ان کی نجی جیل تھی۔ جو بھی ہماری خاندان وڈیرے کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر گھٹھ سے نکلنے کی کوشش کرتا تو وڈیرا جہاں داد ان بد نصیبوں کو اپنی اس نجی جیل میں قید کر دیتا۔“

سدھوراں یہاں تک بتا کر ذرا سانس لینے لگی۔ ڈاکٹر فوزیہ ایک ٹک اس کا چہرہ تکے جا رہی تھی۔ سدھوراں کے منہ سے یہ بے رحم داستان سن کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آج کل کے تعلیم یافتہ مہذب دور میں جو ایک سو صدی میں قدم رکھ چکا تھا، ایسا بھی ہوتا ہے۔ انسانوں کو غلام بنانا تو گئے وقتوں اور دور جاہلیت کا حصہ تھا۔ وہ حیران تھی کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی جنگل کے قانون کا راج تھا اور کیا حکومتی حلقے اس سے لاعلم تھے۔ ”اس کے بعد.....“ معاں سدھوراں نے پھر بتانا شروع کیا اور ڈاکٹر فوزیہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہو کر ہر تن گوش ہو گئی۔

”جہاں داد نے حسد اور ذاتی انان کی خاطر نہ صرف سانول کے ماں پو کو بے گناہ اپنے باپ کی نجی جیل میں قید کر دیا بلکہ سانول کو بھی نہیں بخشا۔ ان غریبوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتا رہا۔ میں نے ایک دن تڑپ کر جہاں داد کے پاؤں پکڑ لئے اور تب سے میں اس کے ہاتھ میں کھونا بن کر رہ گئی۔ کیونکہ اس نے میرے گریب ماں پو کو بھی قید میں ڈال دیا تھا اور انہیں جان سے مار دینے کی دھمکیاں دیتا رہتا تھا۔ تب سے ہی میری بربادی کی کہانی شروع ہو گئی۔“ اتنا بتا کر سدھوراں دبی دبی سسکیوں کے ساتھ رونے لگی۔

ڈاکٹر فوزیہ نے ایک افسوس بھری طویل سانس بھری اور پھر اسے ایک بار پھر تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ”حوصلہ رکھو..... سدھوراں..... اللہ سائیں بہتر کرے گا۔ اب تم نے خود دیکھ لیا ناں..... اللہ جب آفات نازل کرتا ہے تو وہ سب کے لئے یکساں ہوتی ہیں۔ دیکھ لو آخر یہ حویلی بھی ویران ہو گئی ناں۔“

ڈاکٹر فوزیہ کی بات سن کر سدھوراں کے ہر ننوں پر پھٹکی سی مسکراہٹ ابھری اور

لیا۔

یاگوں کی طرح ”ہش ہش“ کرتی دوڑی اور میراں کے ارد گرد سے گدھوں کو بھگانے لگی۔ گدھ بھی ڈھٹائی پر اتر آئے تھے۔ ذرا دور جست مار کر ہٹتے اور پھر قریب آنے کی کوشش کرتے۔ ملوکاں نے جلدی جلدی میراں کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پھر کرگسوں کے بدست غول کو دیکھ کر وہ بھی لرز اٹھی۔

”چلو میراں..... بھاگو یہاں سے..... ورنہ یہ منحوس گدھ ہمیں لاشوں میں تبدیل کر دیں گے۔“ ملوکاں نے کہا۔ پھر آؤ دیکھنا تہاؤ۔ دونوں نے لق و دق صحرا کی وسعتوں میں دوڑ لگا دی۔

کرگسوں کے زرخے سے جان چھڑا کر جب وہ کافی آگے نکل آئیں تو ایک بار پھر بے سدھ ہو کر گر پڑیں۔ مگر اس بار انہوں نے اپنے حواس قابو میں رکھے تھے۔ اب وہ دونوں ریت پر بیٹھی بری طرح ہانپ رہی تھیں۔ بھوک پیاس سے ان کا برا حال ہو رہا تھا۔ حد نگاہ تک ریت ہی ریت نظر آرہی تھی۔ مگر کہیں کہیں ہلکی روئیدگی بھی پھیلی ہوئی تھی۔ چھدری چھدری جھاڑیوں کے درمیان پودے بھی آگے ہوئے تھے۔

دور ریتیہ ٹیلوں سے سورج آتیش عفریت کی مانند ابھرتا محسوس ہو رہا تھا۔ ان دونوں کے متوحش دلوں میں ابھی تک صحرائی لیروں کا خوف جاگزیں تھا، اسی لیے وہ جلد سے جلد یہاں سے دور نکل جانا چاہتی تھیں۔ ان کی منزل کہاں تھی؟ وہ کب تک اس لق و دق صحرا میں بھوکی پیاسی بھٹکیں گی؟ یہ وہ نہیں جانتی تھیں مگر اس لرزہ خیز حقیقت کا ان دونوں کو بھی بہ خوبی ادراک تھا کہ اس صحرا میں بھٹک جانے کا مطلب صرف موت تھا..... عبرت ناک موت۔

دیکھتے ہوئے ریگستان میں سورج آگ برسا رہا تھا۔

سامنے ایک ٹیلہ نظر آیا، ملوکاں کے دل میں جانے کیا سائی، اس نے میراں کا ہاتھ پکڑا اور اس ٹیلے کی طرف بڑھی۔ یہاں اسے دراصل ایک چھدری چھدری جھاڑیوں والا نخلستان سادکھائی دیا تھا، یہ جھلک امید افزا تھی مگر ابھی وہ چند قدم ہی بڑھی ہوگی کہ ٹھٹھک کر اسے رکنا پڑا، ٹیلے کی پرلی ڈھلان سے کوئی ابھرتا ہوا دکھائی دیا، وہ کوئی توموند نو جوان شخص تھا، میراں جانے کیوں خوف زدہ سی ہوگئی اور اسی لہجے میں وہ ملوکاں کا ہاتھ تھام کر بولی۔

”ملوکاں.....! چلو یہاں سے نجانے یہ شخص کون ہے؟“

جواباً ملوکاں نے اسے ہلکی سی سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ”میراں اگر اسی طرح ہم ہر

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ اس صورت حال پر تم سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا۔ جیسا کہ عیاش لوگوں کا وتیرہ ہے۔ مطلب نکل جانے کے بعد وہ منہ پھیر لیتے ہیں۔“

”جہاں دادا اپنے باپ یعنی وڈے بھوتہ سائیں (میر منصب) سے ڈرتا ہے۔ کیونکہ وڈا سائیں غصے کا بڑا تیز ہے۔ وہ نسلوں کے معاملے میں بڑنی احتیاط برتا ہے۔“ سدھوراں نے عجیب لہجے میں کہا۔ ”جہاں دادا اپنے باپ کے غصے سے خوف زدہ ہے۔ ویسے یہ بھی سچ ہے کہ جہاں دادا مجھ پر بری طرح فریفتہ ہے اور وہ مجھے ساری عمر اپنے پاس رکھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اپنے اس گھناؤنے فعل کو شرافت کا لبادہ پہنانے کے لیے اس نے اپنے ایک کارندے سے مجھے شادی کرنے کے لیے کہا۔ یہ صرف دکھاوے کی شادی ہوتی مگر میں نے صاف انکار کر دیا لیکن..... لیکن..... اب..... جہاں دادا پھر مجھے اس سے جعلی شادی کرنے کے لیے باؤ ڈالے گا۔“ سدھوراں نے اتنا کہا تو اس کی سرگیں آنکھیں میں آنسو اُٹ آئے۔ ڈاکٹر فوزیہ اس کی غم ناک داستان سن کر دم بخود رہ گئی۔ پھر اچانک سدھوراں نے ملتجیانہ لہجے میں اپنے ہاتھ جوڑ کر قدر روتے ہوئے اس سے کہا۔ ”ڈاکٹرئی صاحبہ.....! مجھ پر ایک احسان کرو۔ مجھے کوئی ایسا نیکا لگا دو کہ میں مر جاؤں۔ مجھ میں اب ایسی زہر آلود زندگی گزارنے کا مزید حوصلہ نہیں ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ٹھیک اسی وقت دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی۔

☆=====☆=====☆

دور مشرقی ٹیلوں میں پو پھٹ رہی تھی۔

ملوکاں اور میراں صحرائی لیروں کے شیطانی بچوں سے نکل کر گرتی پڑتی بہت دور نکل آئی تھیں اور جب رات آخری پہر میں داخل ہونے لگی تو دونوں تھکن اور پیاس کے باعث نڈھال ہو کر ریت پر ہی ڈھیر ہو گئیں۔ سب سے پہلے ملوکاں کی آنکھ کھلی۔ بیدار ہوتے ہی وہ لرز اٹھی۔ اس کے ارد گرد لاتعداد گدھ پھدکتے پھر رہے تھے۔ دو تین تو اس کے اوپر بھی چڑھ آئے تھے اور اسے ٹھونگے مارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ملوکاں کے حلق سے چیخ خارج ہوگئی۔ اس کے اوپر سے گدھ اپنے غلیظ پر پھڑ پھڑاتے ہوئے اڑے..... ملوکاں یکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنے حواس بحال کئے پھر اچانک اس کی نظر قریب ہی ریت پر اوندھی پڑی میراں پر پڑی۔ اس کے بے سدھ وجود کے آس پاس بھی گدھ منڈلا رہے تھے۔ وہ شاید ان دونوں کو مردہ سمجھ کر پتہ ر ہے تھے۔ ملوکاں کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ

سارنگ کو ہوش آیا تو اسے جہنمی تپش کا احساس ہوا جس سے اس کا پورا وجود سلگ اٹھا، سورج کی برساتی ہوئی تمازت الگ و بال جان بنی ہوئی تھی اور اس پر مستزاد بادِ سموم کے جھلاتے ہوئے پیڑھے بھی وبال جان بنے ہوئے تھے۔ سارنگ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے سوکھے چٹری جے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اطراف کا جائزہ لینے لگا، حدنگاہ تک ریت ہی ریت پھیل ہوئی تھی، وہ اس مردود گاتریا کے اونٹ کے پیروں کے نشانات تلاش کر رہا تھا جو اسے فوراً دکھائی دے گئے، وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا، اسے اب اپنے ٹوٹے وجود میں ایک نئی طاقت محسوس ہونے لگی تھی۔ اگرچہ اسے بھوک سے زیادہ پیاس نے بے حال کر رکھا تھا مگر وہ محض اپنی قوت ارادی کے سہارے آگے بڑھا چلا جا رہا تھا، مکار اور فریبی گاتریا کو جالینے کی آگ اسے جلا رہی تھی اور وہ ہر ممکن کوشش کر کے اس تک پہنچ جانا چاہتا تھا مگر اسے یہ سوچ کر بھی مایوسی ہوتی تھی کہ گاتریا کے پاس اونٹ تھا جو اس ریگستان میں ”صحرائی جہاز“ کی حیثیت رکھتا تھا، جانے وہ اب کہاں سے کہاں جا پہنچا تھا، اسے بھابی اللہ وسائی اور فرید و کا بھی خیال پریشان کئے دے رہا تھا کہ وہ جانے کس حال میں ہوں گے۔ سارنگ یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا۔

سارنگ کو اسی طرح گرتے پڑتے چلتے چلتے شام نے آلیا، وہ کافی آگے نکل آیا تھا، اس کے سر پر مردار خور منحوس گدھ بھی منڈلاتے ہوئے نظر آرہے تھے شاید ان کی بھوکی نظروں نے اپنے شکار کا پیشگی پتہ چلا لیا تھا، ایک دو گدھ تو اپنے غلیظ پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے اس کے سر کے قریب بھی اتر آئے تھے اور اسے چونچ بھی مارنے کی کوشش کی تھی، وہ بے تاب ہو رہے تھے، وہ اس کے مردہ ہو کر گرنے کے بے چینی سے منتظر تھے۔ کرگسوں کے اس بھوکے غول نے سارنگ پر الگ دہشت طاری کر رکھی تھی، سارنگ نے سنا تھا کہ ان مردار خور گدھوں کو فرشتہ اجل نظر آ جاتا ہے، ایک گدھوں پر ہی کیا موقوف خود سارنگ ملک الموت کو اپنی آنکھوں کے سامنے منڈلاتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

اچانک سارنگ کی نظر ذرا دور شمال مغرب کی سمت پڑی، وہ ٹھنکا لیکن اس کے قدم رکے نہیں تھے بلکہ اس نے کسی آبادی کے آثار دیکھ کر پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ اپنے قدم بڑھانے شروع کر دیئے تھے، اسے مذکورہ سمت کسی بستی کے آثار دکھائی دیئے تھے پھر ذرا دیر بعد وہ اس کے قریب پہنچ چکا تھا مگر یہاں پہنچ کر سارنگ کو مایوسی ہوئی تھی کیونکہ وہ ایک قحط زدہ بستی تھی جہاں ویرانی مسلط تھی، جا بجا موشیوں کے پنجر بکھرے ہوئے تھے، پھونس کی بنی جھونپڑیوں پر مردار خور گدھوں کے غول منحوس آوازوں میں چیختے چلاتے نظر

کسی سے ڈرنے لگے تو اس جہنم میں بھوکے پیاسے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے لگے، آؤ ادھر چلتے ہیں، سب انسان ایک سے نہیں ہوتے..... آؤ شاباش.....!“
وہ آہستگی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھی۔ اس اجنبی نوجوان نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا اور وہ بھی انہی کی طرف چلا آ رہا تھا۔

قریب پہنچنے پر دونوں رگ گئیں، وہ نوجوان بھی تھم گیا، میراں اسے دیکھ کر سہم رہی تھی جبکہ ملو کاں بغور اس نوجوان کو تنکے جاری تھی۔ نوجوان بیس پچیس کے پیٹے میں تھا، تہبند باندھے تھا، اوپر کا جسم برہنہ تھا، وہ خاصا لمبا چوڑا تھا، رنگت سانولی تھی، آنکھیں بڑی بڑی اور روشن مگر ان میں عجیب قسم کی تنگی کروٹ لے رہی تھی، بال گھنگھریالے تھے، دریائے سندھ کے چوڑے پاٹ کی طرح اس کے بالوں بھرے سینے میں بنی ہوئی پسینے کی لکیریں، کاریزوں کی طرح بہتی نظر آرہی تھیں جیسے بڑے دریا یا نہر سے نکال کر کھیتوں کو سیراب کیا جاتا ہے۔

”کون ہو تم دونوں.....؟“ اس نے اچنتی ہوئی نظروں سے دونوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ملو کاں کو جانے کیوں اس سانولے، بھلے نوجوان کے لہجے کی گومی تپش دیتی محسوس ہوئی پھر اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”ہمارے کارواں پر صحرائی لٹیروں نے حملہ کر دیا تھا، ہم دونوں بڑی مشکلوں سے جان بچا کر بھاگی ہیں، کیا تم ہماری مدد کرو گے؟“ ملو کاں کی بات سن کر اس نوجوان کے سانولے اور قدرے موٹے لبوں پر تلخ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”میں تمہاری بھلا کیا مدد کر سکتا ہوں، میں تو پہلے ہی سے اپنے ماں، بیوی کی لاشیں کا ندھے پر تھامے ہوئے ہوں۔“ اس نوجوان نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر اچانک سوغواری سی عود کر آئی تھی، وہ خود کلامی کے انداز میں پھر بولا۔ ”اچھا ہی ہوا جو مر گئے وہ دونوں..... اس بے رحم دنیا میں رکھا ہی کیا تھا ان گریبوں کے لئے.....“ وہ شدید مایوسی کا شکار نظر آ رہا تھا۔ ملو کاں کا دل بے طرح انداز میں دھڑکنے لگا۔ اسے بیک وقت اس جیلے نوجوان پر ترس بھی آ رہا تھا اور غصہ بھی کہ مرد ہو کر وہ اس قدر مایوسی کی باتیں کر رہا تھا پھر اچانک ملو کاں اور میراں دونوں چونکے بغیر نہ رہ سکیں کیونکہ وہ نوجوان اب واپس پلٹ گیا تھا۔

آ رہے تھے شاید وہ چندا پے بچے کچھ بد نصیب مکینوں کی ضیافت اڑا رہے تھے جنہیں یا تو بیماری کی وجہ سے ادھر ہی چھوڑ دیا گیا تھا یا پھر بڑھاپے نے انہیں چلنے پھرنے سے معذور کر دیا تھا باقی کسر اس ہلاکت خیز خشک سالی اور جان لیوا قحط نے پوری کر دی تھی۔ یہ عبرتناک مناظر سارنگ کے لیے نئی بات نہ تھے مگر بہر حال وہ ایک انسان تھا، اس دھرتی کی ارزاں زندگی پر اس کا دل کڑھتا تھا۔ اچانک جب وہ ایک بوسیدہ سی اجڑی جھونپڑی کے قریب سے گزرنے لگا تو اندر سے ایک گدھ ”چگ..... چگ“ کی آواز نکالتا باہر نکلا، اس کی چونچ میں ایک انسانی آنکھ کا ڈھیلا دبا ہوا تھا، سارنگ کی روح کا نپ اٹھی، بے اختیار اس کا جی متلانے لگا اور اسے ابکائیاں آنے لگیں، گدھ نے سارنگ کو دیکھ کر انسانی آنکھ کو جلدی سے نگلا اور اپنے غلیظ پر پھڑ پھڑاتا ہوا دوبارہ جھونپڑی کے اندر گھس گیا، سارنگ یہاں زیادہ دیر نہ رکھا اور جلدی سے آگے بڑھ گیا، وہ اب خالی اور ویران جھونپڑیوں کے اندر کچھ کھانے پینے کی شے تلاش کرنے کی لا حاصل سعی بھی کرتا جا رہا تھا مگر سر دست اسے کچھ نہیں ملا۔ تاہم اس اجڑی ویران بستی کو دیکھ کر اسے کچھ امید ہو چلی تھی کہ کم از کم وہ یہاں کسی خالی گھریا جھونپڑی میں رات گزار سکتا تھا مگر پھر جب اسے فوراً بھابی اللہ وسائی اور اس کے ننھے بچے منٹھار اور فرید و کا خیال آیا تو اس نے فوراً یہاں رکنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

کچھ دیر کے بغیر چلتے رہنے کے بعد اچانک سارنگ ٹھٹک کر رکھا، اسے شام کے پُر ہول سناٹے میں ایک آواز سنائی دی تھی، کسی کے بین کرنے کی آواز جیسے کوئی رورہا ہو۔

☆=====☆=====☆

دستک کی آواز پر ان دونوں کے ساتھ قریب متوحش سی کھڑی موسیٰ بھی چونکی پھر ڈاکٹر فوزیہ نے جلدی سے قدرے سرگوشیاں لہجے میں سدھوراں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو سدھوراں.....! ذرا ہمت اور حوصلے سے کام لینا، تم اچھی طرح سمجھ گئی ہو نا تمہیں کیا ڈرامہ کرنا ہے؟“

”جی ڈاکٹر نی صاحبہ.....! میں سمجھ گئی ہوں، آپ بے فکر رہیں۔“ سدھوراں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا اور پھر مسہری پر دراز ہو گئی۔

ڈاکٹر فوزیہ نے ابھی اپنے ڈاکٹری آلات سمیٹے نہیں تھے، اس نے قریب کھڑی موسیٰ کو دروازہ کھولنے کا اشارہ دیا اور خود یونہی سدھوراں کے قریب آ کر اس کا بلڈ پریشر چیک کرنے لگی۔ ادھر سدھوراں نے ڈاکٹر فوزیہ کی ہدایات کے مطابق ہولے ہولے کراہنا

شروع کر دیا تھا۔ موسیٰ اشارہ پا کر دروازے کی طرف بڑھی اور اسے پورا کھول دیا، دروازہ کھلتے ہی جہاں دادا اندر داخل ہوا، اس کے ہمراہ منشی اور دیگر کارندے بھی اندر آ گئے۔

”ڈاکٹر نی صاحبہ.....! کیا کام ہو گیا.....؟“ جہاں دادا نے امید بھرے لہجے میں ڈاکٹر فوزیہ سے پوچھا تو وہ قدرے تشویش زدہ لہجے میں بولی۔

”کام تو میں نے اپنا کر دیا ہے مگر پیشنت چونکہ کمزور تھی اس لیے اس کا بلڈ پریشر لوہو گیا ہے، اسے فوراً ہمارے میڈیکل کیمپ لے جانا ہوگا۔“

اس کی بات سن کر جہاں دادا بغور مسہری پر نیم بے ہوشی کی حالت میں دراز سدھوراں کو گھورنے لگا۔ ڈاکٹر فوزیہ کن آنکھوں سے جہاں دادا کا چہرہ دیکھ رہی تھی، اسے یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ اگر جہاں دادا کو ان کے ڈرامے پر ذرا بھی شبہ ہو گیا تو یقیناً یہ وڈیرا زادہ ان سب کے لیے مصیبت بن سکتا تھا۔

جہاں دادا نے ارد گرد دیکھ رہے ہوئے میڈیکل آلات کو دیکھا اور پھر وہ ڈاکٹر فوزیہ کے چہرے پر اپنی تیز نظریں گاڑتے ہوئے بولا۔

”کیا اسے تمہارے میڈیکل کیمپ لے جانا ضروری ہے..... ادھر اس کا علاج نہیں ہو سکتا؟“

”نہیں.....!“ ڈاکٹر فوزیہ نے قطعیت سے کہا اور مزید بولی۔ ”پیشنت کی حالت نازک ہو رہی ہے، اسے جو نہیں گھٹنے نگرانی کی ضرورت ہے جو یہاں ممکن نہیں۔“ ڈاکٹر فوزیہ کی بات میں خاصا وزن تھا جسے محسوس کرتے ہوئے جہاں دادا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ڈاکٹر فوزیہ نے سکون کا سانس لیا۔ درحقیقت اس نے حالات اور دکھوں کی باری سدھوراں کی دادری کا تہیہ کر لیا تھا اور وہ اس مظلوم لڑکی کی پوری پوری مدد کرنا چاہتی تھی نہ صرف یہ بلکہ وہ اسے جہاں دادا خان کے ہولناک بچوں سے بھی دور لے جانا چاہتی تھی۔

بہر طور ان سب کو ایک بار پھر لہڈ کر دوز میں سوار کرایا گیا، ڈاکٹر جواد احمد نے فوزیہ کو دیکھ کر سکھ کر سانس لیا مگر اس کا موڈ از حد بگڑا ہوا تھا، صاف لگتا تھا کہ جتنا عرصہ فوزیہ اندر رہی تھی، باہر اوطاق میں موجود جواد نہ صرف بے چینی میں مبتلا رہا تھا بلکہ اس کی جہاں دادا کے کارندوں سے بھی وقتاً فوقتاً تلخ کلامی ہوتی رہی تھی، ان کے ہمراہ منشی جس کا نام خیر بخش تھا، چار مسلح کارندے، سدھوراں سمیت لینڈ کرور کے عقبی حصے میں سوار ہو گئے، سدھوراں کو ایک لمبی سیٹ پر لٹا دیا گیا تھا۔ سدھوراں، ڈاکٹر فوزیہ کی ہدایت کے مطابق بڑی کامیابی

دیئے تھے، رکھ لیں۔“

ڈاکٹر فوزیہ نوٹوں کو دیکھ کر استہزائیہ انداز میں مسکرائی پھر اسی لہجے میں منشی سے بولی۔ ”یہ میں نہیں لوں گی۔ اللہ کا دیا میرے پاس سب کچھ ہے، اپنے چھوٹے سائیں کو کہنا کہ ان روپوں سے منزل واٹر کی بوتلیں شہر سے منگوا کر غریب لوگوں میں بانٹ دے۔“ اتنا کہہ کر ڈاکٹر فوزیہ کیپ کے اس حصے کی طرف بڑھ گئی جہر سدھوراں کو منتقل کیا گیا تھا۔ منشی خیر بخش چند لمحے ڈاکٹر فوزیہ کو عجیب نظروں سے تکتا رہا پھر اپنی گول عدسوں والی عینک کو درست کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں بڑبڑایا۔

”عجیب چھو کر ہے یہ۔ اتنے سارے نوٹوں کو ٹھکرا رہی ہے اور کہتی یہ پڑی کہ منزل واٹر کی بوتلیں شہر سے منگوا کر غریب لوگوں کو تقسیم کر دے ہنہ۔۔۔۔۔ بے وقوف چھو کر ہے۔۔۔۔۔ غریبوں کو تو ہم ان کا پسینہ بھی نہیں پینہ دیتے، منزل واٹر کا پانی پینے دیں گے ہنہ۔۔۔۔۔!“

☆=====☆=====☆

اس عجیب نوجوان کو اچانک واپس نیلے طرف پلٹنا دیکھ کر ایک ٹائیپ کے لئے ملوکاں اور میراں نے قدرے حیرت سے ایک دوسرے کا چہرہ تکتے کے بعد بے اختیار اس کے عقب میں قدم بڑھا دیئے۔ اس نوجوان کو معلوم تھا کہ وہ دونوں چھو کر یاں اس کے عقب میں چلی آ رہی تھیں، وہ ٹیکری کی دوسری طرف اتر گیا تو ملوکاں اور میراں بھی اس کے عقب میں خاموشی سے چلتی ہوئی ٹیکری کی دوسری جانب اتریں تو انہیں سامنے ایک خیمہ سا تانا ہوا دکھائی دیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ دونوں بری طرح ٹھکی تھیں، خیمے کے ذرا قریب ہی تازہ گڑھے کھدے ہوئے تھے اور قریب ہی ریت کا بڑا سا ڈھیر بھی تھا، ایک کھدال بھی پاس ہی رکھی تھی، ملوکاں اور میراں دو تازہ کھدی ہوئی ریتیلی قبروں کو دیکھ کر بری طرح لرز اٹھیں اور دونوں کے قدم ریتیلی ڈھلوان پر لڑکھڑاسے گئے، ملوکاں نے تو خود کو سنبھال لیا مگر میراں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور ڈھلوان پر لڑکھڑکتی، چیختی چلاتی تازہ کھدی ہوئی قبر میں جا پڑی، اندرا ایک بوڑھے بے کفن شخص کی لاش پڑی تھی۔

میراں کے حلق سے نکلنے والی چیخ بڑی بھیانک تھی، اس پر نیم غشی کی کیفیت طاری ہونے لگی، نوجوان چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ادھر ملوکاں بھی گڑھے کے قریب آگئی اور پھر جلدی سے بیک وقت وہ دونوں گڑھے میں اتر گئے۔

سے سوانگ بھر رہی تھی، سدھوراں دل ہی دل میں خوش بھی ہو رہی تھی اور وہ ڈاکٹر فوزیہ جہر نیک سیرت لڑکی کو دل سے دعائیں دے رہی تھی، انہوں نے بڑی بہادری کے ساتھ جہاں داد جیسے بھیڑیے صفت انسان کی آنکھوں میں دھول جھونک دی تھی اور اسے ان کے ڈراے کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا تھا۔

لینڈ کرورز کا رخ اب میڈیکل کیپ کی طرف تھا، ڈاکٹر فوزیہ اگرچہ بڑی کامیابی کے ساتھ ایک نازک صورت حال سے نمٹ آئی تھی مگر اب اسے خاصی پریشان کن چپ لگ گئی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ ابھی تو وہ جہاں داد کی آنکھوں میں دھول جھونک آئی ہے، اس کے بعد کیا ہوگا، کیا وہ اس بگڑے ہوئے وڈیرے زادے سے دشمنی کی قحط ہو سکتی تھی پھر سب سے بڑی بات ڈاکٹر جواد کی تھی جو اکثر اسے ان پرانے معاملوں میں ٹانگ نہ پھسانے کی تلقین کرتا رہتا تھا مگر فوزیہ اپنی فطرت سے مجبور تھی، وہ ایک پختہ العزم لڑکی تھی، ایک بار جو عزم کر لیتی پھر اس سے پیچھے نہیں ہٹتی تھی۔

لینڈ کرورز میڈیکل کیپ کے قریب پہنچ کر رک گئی، یہ لوگ نیچے اترے، سدھوراں کو اسٹریچر کے ذریعے لینڈ کرورز سے کیپ میں منتقل کیا گیا، وہ ہنوز نیم بے ہوشی کی ایکٹنگ بڑی کامیابی سے کر رہی تھی۔

کیپ میں پہنچتے ہی ڈاکٹر فوزیہ نے منشی خیر بخش اور اس کے کارندوں کو دکھانے کی غرض سے عملے کو مریضہ کی نازک حالت کے متعلق جلدی جلدی مختلف ہدایتیں دیں، سدھوراں کو کیپ کے عقبی حصے میں منتقل کر دیا گیا تھا جو لیبر روم کے طور پر مستعمل تھا، وہاں موسیٰ، سدھوراں کے ساتھ موجود تھی۔

”اچھا ڈاکٹر صاحبہ۔۔۔۔۔! میں اب چلتا ہوں، میرے دو آدمی ادھر موجود رہیں گے۔“ عیار منشی خیر بخش نے رخصت ہونے کی غرض سے کہا تو اس کی دو کارندوں کی موجود رہنے والی بات نے ڈاکٹر فوزیہ کو قدرے متذبذب سا کر دیا مگر وہ منشی کو ایسا کرنے سے منع بھی نہیں کر سکتی تھی۔ منشی نے فوراً دوبارہ مخاطب ہوتے ہوئے ڈاکٹر فوزیہ سے پوچھا۔

”ڈاکٹر صاحبہ۔۔۔۔۔! ویسے مریضہ کو کب تک یہاں کیپ میں رہنا ہوگا؟“

”فی الحال، دو تین دن تو ضروری ہیں۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے مختصر کہا۔ منشی کرتے کی اندرونی جیب سے بڑے نوٹوں کی بڑی سی گڈی نکال کر فوزیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”ڈاکٹر صاحبہ۔۔۔۔۔! یہ چھوٹے سائیں نے انعام کے طور پر مجھے آپ کو دینے کے لیے

”بس کر ڈی.....! زیادہ زبان مت چلا، نہیں تو ایک ایسا تھپڑ رسید کروں گا کہ.....“
 ”ذرا ہاتھ تو لگا کر دیکھ کر میرے کو.....“ ملوکاں بھی کمر پر ہاتھ رکھ کر تنک کر بولی۔
 ”مجھے پتہ قاتل لگتا ہے..... جانے کن غریب بڑھوں کو قتل کر کے ان کی لاشیں قبر کھود کر ڈال دی ہیں۔“

ملوکاں کی نشتر زنی پر وہ نوجوان خلاف توقع طیش میں آنے کی بجائے یک دم غمگین سا نظر آنے لگا اور اس نے اپنا چہرہ جھکا دیا پھر اس نے خاموشی سے صراحی ملوکاں کو تھما دی اور اس کے بعد خیمے سے باہر نکل گیا۔ ملوکاں کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ ”یہ کدھر چلا گیا؟“ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔ اس کے قریب بیٹھی میراں جواب مکمل طور پر ہوش میں آچکی تھی، ملوکاں کے قریب آتے ہوئے متوحش لہجے میں بولی۔

”ملو.....! چلو یہاں سے..... مجھے تو اس چھوکرے سے ڈر لگ رہا ہے۔“
 ”جو مرد غصہ کرتے ہیں، ان سے خوف کیسا، ایسے لوگ منہ کے کڑوے ضرور ہوتے ہیں مگر دل کے اچھے ہوتے ہیں۔“ ملوکاں نے عجیب گم صم لہجے میں کہا تو میراں بھونچکی رہ گئی۔

ملوکاں نے صراحی منہ سے لگالی اور چند گھونٹ پانی پی کر صراحی میراں کی صرف بڑھا دی، میراں نے بھی پانی کے چند گھونٹ بھرے پھر اچانک ان کے کانوں میں باہر کسی کے رونے کی آواز سنائی دی۔

ملوکاں باہر نکلی تو کیا دیکھتی ہے وہی نوجوان قبر میں ریت ڈال رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ بچکیاں لے لے کر روتا جا رہا تھا، ملوکاں نے حالات کی سنگینی کا اندازہ لگا لیا کہ یہ ضرور اس کے کسی اپنوں کی قبریں ہیں، اسے اب اس نوجوان پر ترس آنے لگا، اس نے وہیں کھڑے کھڑے اس سے کہا۔ ”اڑے چھوکر!.....! مرد ہو کر روتا پڑا ہے، یہ دونوں کون تھے تیرے.....؟“

اس نوجوان نے چہرہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا جو آنسوؤں سے لبریز تھا پھر وہ جیسے اپنے آنسوؤں کو پی کر اس سے غمگین لہجے میں بولا۔ ”اگر تیرے ماں، پیو (ماں، باپ) بھوک اور بیماری سے مر جاتے اور تجھے اس دیرانے میں ان کی خود قبریں کھودنی پڑتیں تو میں دیکھتا کہ تھو روتی یا خوشیاں مناتی۔“ یہ کہہ وہ جلدی جلدی قبر بھرنے لگا۔

ملوکاں کے دل کو ایک گھونسا لگا، اس اثناء میں میراں بھی خیمے نما جھونپڑی سے باہر آچکی تھی، اس نے بھی نوجوان کی بات سن لی تھی پھر دونوں نے آگے بڑھ کر قبر بھرنے میں اس نوجوان کی مدد کی۔ خاصی دیر بعد دونوں قبریں نرم نرم ریت سے پُر کرنے کے بعد انہوں

اس نوجوان کا چہرہ بدستور سیات اور سرد تھا۔ بہر طور دونوں نے میراں کو باہر نکالا اور اندر خیمے میں لے آئے، خیمے کے اندر کھجور کی چٹائی بچھی ہوئی تھی، ایک طرف چھوٹی سی صراحی دھری تھی، سحرائی دیکھ کر ملوکاں کی آنکھوں میں چمک ابھرتی، اور وہ بے اختیار اپنے سوکھے لبوں پر زبان پھیرنے لگی، نیم بے ہوش میراں کو چٹائی پر لٹا دیا گیا تھا، ملوکاں تازہ کھدی ہوئی قبر کے اندر پڑے مردے سے ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس کے لیے ایسے دل خراش مناظر نئی بات تھی، وہ سمجھتی تھی کہ وہ نوجوان اس کی بے خوفی سے متاثر ہو کر اس کی تعریف کرے گا مگر اس نے ایک نظر بھی اٹھا کر ملوکاں کی طرف نہیں دیکھا تھا، ایک عجیب سی سرد مہری اور زہرناک تنخی اس کے چہرے پر کھنڈ کر رہ گئی تھی بلکہ اب تو وہ نوجوان بیزار سا بھی دکھائی دینے لگا تھا تاہم اس نے آگے بڑھ کر وہ صراحی اٹھائی، اس سے تھوڑا پانی ایک مٹی کے آب خورے میں نکال کر میراں کے لڑتے لبوں سے لگا دیا، پانی کی برودت نے حلق میں آگے ہوئے کانٹوں کی چھین کو ختم کر کے رکھ دیا اور دوسرے ہی لمحے میراں نے آنکھیں کھول دیں اور یکدم اٹھ کر بیٹھ گئی، اب وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔

ادھر پانی کو دیکھ کر ملوکاں کی پیاس مزید شدت اختیار کرنے لگی اور وہ منتظر نگاہوں سے نوجوان کی طرف دیکھنے جا رہی تھی کہ ابھی وہ اسے صراحی دے دے گا مگر جب وہ ملوکاں کو نظر انداز کر کے اٹھنے لگا تو ملوکاں کی فطری سرکشی ابھرتی، اسے پہلے ہی نظر انداز کئے جانے کا غصہ تھا لہذا اس نے جھپٹ کر نوجوان سے صراحی چھیننے کی کوشش کی مگر نوجوان بھی ایک کایاں تھا، اس نے فوراً صراحی والا ہاتھ پیچھے کر لیا اور درشت لہجے میں اسے گھرکا۔ ”اڑی.....! پرے ہٹ.....! یہ پانی میں نے اپنے لئے رکھا ہے، پہلے ہی تیری اس بے ہوش چھوکر کی کو بہت سارا پلا چکا ہوں۔“

”اڑے تو کیسا مرد ہے.....؟ چھوکریوں کا پیاس سے برا حال ہو رہا ہے اور.....؟“

”ہاؤ.....! ہاؤ.....! میں اچھی طرح جانتا ہوں تمہارے جیسی چھوکریوں کو.....“ وہ نوجوان ملوکاں کی بات کاٹ کر زہر خند لہجے میں بولا تو ملوکاں ایک دم چراغ پا ہو گئی اور اٹھ کھڑی ہوئی اور تیز لگا ہوں سے نوجوان کو گھورتے ہوئے بولی۔

”اڑے اچھوکر!.....! زبان سنبھال کر بات کر.....! لعنت ہے تیری تنگ نظری پر، ہم تیرے کو کیا ایسی ویسی چھوکریاں نظر آتی پڑی ہیں.....! کاٹھ تو دیکھ اونٹ بھرکا اور عقل مرغی جیسی.....! پانی نہیں دیتا ہے تو نہ دے، بے رحم کہیں کا.....!“

”سچ بتانا..... چپ کیوں ہو گیا..... کیا اپنے جی کا بوجھ ہلکا نہیں کرے گا؟“
 ”تو بڑی مکار ہے چھو کرے!“ وہ نو جوان اچانک پھسکی مسکراہٹ سے ملوکاں کا
 چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اچھا.....! پھر سدھوراں نے مجھے چھوڑ دیا اور اس وڈیرے زادے
 جہاں داد کے ساتھ دوستی گانٹھ لی۔“
 ”کیا سدھوراں نے اس وڈیرے سے شادی رچالی تھی.....؟“ ملوکاں نے اچانک
 پوچھا۔

”یہی تو دکھ تھا کہ سدھوراں سے اس مردود نے شادی بھی نہیں کی۔“ وہ نو جوان
 زہریلے لہجے میں بولا۔
 ”کیا مطلب.....؟“ ملوکاں نے پوچھا۔

”ہاں.....! اس وڈیرے زادے نے سدھوراں کو اپنی رکھیل بنالیا تھا۔“
 ”آخر سدھوراں کی ایسی کیا مجبوری تھی جو اس نے تیرے جیسے گبر و مرد کو ٹھکرا دیا؟“
 ملوکاں کے لبوں سے بے اختیار نکلا تو وہ نو جوان ایک اجنبی اسپرالٹک کے منہ سے اپنے لئے
 تعریفی کلمات سن کر ایک لمحے کو الجھی ہوئی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا، ملوکاں کو اچانک
 اپنی بات کی گہرائی کا احساس ہوا اور اس نے اپنی نظریں جھکا دیں۔

”سدھوراں کی مجبوری بالکل سیدھی سادی تھی۔“ دوسرے ہی لمحے نو جوان نے کہنا
 شروع کیا۔ ”میرے اور اس کے ماں، پیو کو جہاں داد نے اپنے باپ وڈیرے میر منصب
 خان کی فحش جیل میں قید کروا دیا تھا، جہاں داد کو جب یہ پتہ چلا کہ سدھوراں مجھ سے پیار کرتی
 ہے تو اس نے مجھے بھی نہ چھوڑا اور قید میں ڈال دیا، میں اچھی طرح جانتا تھا یہ حقیقت کہ
 سدھوراں، جہاں داد سے سخت نفرت کرتی ہے مگر وہ اس کے ظلم کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس
 کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ گئی ہے اور پھر مجھے آزادی مل گئی اور پھر میں نے اپنے ماں، پیو کے
 ساتھ گوٹھ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔“

”پھر تم کیوں سدھوراں سے نفرت کرنے لگے، اس بے چاری نے تو تمہاری خاطر
 ہی قربانی دی تھی۔“ ملوکاں نے چور دل کے ساتھ سدھوراں کی حمایت کی اور گہری نگاہوں
 سے اس نو جوان کے چہرے کو تکتے لگی، شاید ملوکاں اس نو جوان کی سدھوراں سے نفرت
 کا اندازہ لگانا چاہتی تھی۔

”نہیں، سدھوراں کو مجھ پر بھروسہ کرنا چاہئے تھا، میں بھی آخر مرد تھا، گریب کی
 اولاد تھا تو کیا ہوا، اس کی خاطر تو میں ساری دنیا سے ٹکراتا، سدھوراں نے مجھ پر بھروسہ نہ

نے قبروں پر فاتحہ پڑھی، اس کے بعد نو جوان سوا گوار انداز میں چپ چاپ خیمے کے اندر چلا
 گیا، ملوکاں اور میراں بھی اس کے ساتھ اندر آ گئیں، وہ نو جوان اب ایک طرف کونے میں
 سو گوار سے انداز میں گھٹنوں میں سر دیئے رونے لگا، ملوکاں کا دل پیچ رہا تھا پھر وہ اس کی
 طرف بڑھی اور اس کے پاس ہی اکڑوں بیٹھ کر آہستگی سے بولی۔ ”کیا یہ تیرے ماں، پیو
 تھے.....؟“ جواباً اس نو جوان نے آنسوؤں بھرا چہرہ اٹھا کر ملوکاں کی طرف دیکھا اور
 دھیرے سے اثبات میں سر ہلا کر مختصر اُبوللا۔ ”ہاں.....!“

”کیا بیمار تھے دونوں.....؟“ ملوکاں بدستور اس کی دلجمعی کی کوشش کر رہی تھی۔
 ”ہاں.....!“ اس نے پھر غم آگیاں لہجے میں مختصر کہا۔ ملوکاں کو اس نو جوان پر اب
 واقعی ترس آنے لگا تھا، وہ اسے اپنے دل کی چور دھڑکنوں میں بستا ہوا محسوس کرنے لگی پھر
 اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ کسی خیال سے پوچھا۔
 ”تیرا کوئی بال، بچہ بھی تھا؟“

اس کی بات سن کر اچانک وہ نو جوان سر اٹھا کر اس کی طرف تکتے لگا، اس کی بڑی
 بڑی روشن آنکھوں میں اب تنگی سی کھل گئی پھر جب وہ بولا تو آنکھوں میں اتنی نمی کے ساتھ
 پُر اسرار سی تنگی بھی اس کے لہجے میں نمود کر آئی۔ ”میرا کوئی بال، بچہ نہیں، میری تو ابھی شادی
 بھی نہیں ہوئی مگر.....!“ وہ اتنا بتا کر خاموش ہوا تو ملوکاں نے جلدی سے دھڑکتے دل سے
 پوچھا۔

”مگر کیا، آگے بتانا..... تیرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا رے.....“
 ”ہاں تو صحیح کہتی ہے، میرا غم واقعی ایسا ہے جسے اگر میں نے نہ بتایا تو اس غم کی بھاری
 سل تلے دب جاؤں گا۔“ پھر اس نے اسرار بھرے لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ”ادھر گوٹھ میں
 ایک چھو کرے تھی سدھوراں..... میں نے اس سے عشق کیا تھا، وہ بھی مجھے پسند کرتی تھی۔“
 اس نے اتنا ہی بتایا تھا کہ ملوکاں کو اپنے اندر چھپا کے سے کوئی چیز ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی، وہ
 بچہ کر رہ گئی اور خاموش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”سدھوراں بے وفائی، وہ شاید اپنی غربت سے تنگ آ گئی تھی، اس پر ایک
 وڈیرا زادہ جہاں داد عاشق ہو گیا تھا، اس کے بعد.....!“ یہاں تک بتا کر وہ بھیدوں بھرے
 انداز میں اپنا جملہ داستانہ ادھورا چھوڑ کر چپ ہو رہا۔ ملوکاں کو اس کا یوں اچانک خاموش ہونا
 گراں گزرا اور اسے عجیب سی کرید لگ گئی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دوبارہ بے چینی سے مستفسر
 ہوئی۔

کا اور سر جھٹک کر اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ملوکان اسے ایک مردانہ ادب پر محمول کر کے شوخ انداز میں اسے ٹھوکا مار کر بولی۔ ”اڑے چھو کر!.....! اپڑاں نام تو بتا۔۔۔۔۔“

”سانول!.....!“ نو جوان نے بغیر اس کی طرف دیکھے اپنا نام بتایا۔

☆=====☆=====☆

رونے کی آواز نسوانی تھی، سرمئی شام کا پُر ہول سناٹا اس پر ویران اور اجاز بستی میں بین کرنے کی یہ آواز اچھے خاصے انسان کو اعصاب گزیدہ کر دینے کے لئے کافی تھی مگر سارنگ نے اللہ کا نام لے کر اپنا دل مضبوط کیا اور اس رونے اور کبھی سسکنے کی آواز پر کان دھرتے ہوئے اس کی سمت کا تعین کرنے لگا۔ یہ آواز اس کی داہنی جانب ایک سالخورہ سی جھونپڑی سے آرہی تھی، وہ فوراً اس کی طرف بڑھا، جھونپڑی ویران تھی، وہ حیران بھی ہوا کہ اس ویران بستی میں یہ عورت یہاں کیا کر رہی تھی، ایک عجیب بات ہوئی سارنگ نے جیسے ہی جھونپڑی میں قدم رکھا، رونے کی آواز آنا بند ہو گئی، سارنگ یہی سمجھا کہ جھونپڑی کے کسی کونے میں بیٹھی اس بد نصیب عورت کو شاید کسی کے قدموں کی آواز سنائی دے گئی اس لئے اب وہ بے چاری خوف کے باعث خاموش ہو گئی تھی۔

جھونپڑی خاصی بڑی تھی، سامنے کا حصہ منہدم ہو چکا تھا البتہ سامنے پھونس کی لپ ڈار دیوار سلامت تھی جو کمرے نما کونپڑی کی تھی، آواز ادھر سے ہی آرہی تھی، سارنگ دھڑکتے دل کے ساتھ اکھڑے ہوئے فرش پر پھونس اور تنکوں پر چلتا کونپڑی کی طرف بڑھا، دروازہ غائب تھا صرف چوکھٹ پر اسرار عفریت کی طرح منہ کھولے کھڑی تھی، سارنگ نے باہر کھڑے کھڑے اندر جھانکا۔

”کون ہے یہاں!.....؟“ اس نے بہ آواز بلند پوچھا مگر جواب نداد۔۔۔۔۔ اس نے دوبارہ پکارا تب پھر اچانک اسے دوبارہ رونے اور سسکنے کی آواز سنائی دی، وہ بری طرح چونکہ اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگا کیونکہ اس بار رونے سسکنے کی یہ آواز کسی اور جگہ سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی، سارنگ کا ماتھا ٹھنکا، وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر واپس پلٹا اور اس منحوس جھونپڑی سے باہر نکل آیا، باہر نکلتے ہی اسے اب چاروں طرف سے رونے چلانے اور حتیٰ کہ قہقہوں کی بھی آوازیں آنے لگی تھیں، سارنگ نے دل ہی دل میں آیت الکرسی کا ورد کرنا شروع کر دیا، وہ اب لائق ہو کر آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا، بار بار اسے ایسا بھی محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے پیچھے دے پاؤں چلا آ رہا ہو مگر وہ اسے ویران اور

کر کے میری توہین کی، مجھے اب اس سے شدید نفرت ہو گئی۔“ یہ کہہ کر اس نو جوان کا چہرہ نفرت سے جلنے لگا۔

ملوکان نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں یہ تو سدھوراں کی بہر حال غلطی تھی، تمہارا یہ خیال بالکل درست ہے، سدھوراں نے اپنی غربت سے ہار مان لی ہوگی اور اس وڈیرے زادے کی پیش بھری زندگی نے تیرا پیار اس کے دل سے مٹا دیا ہوگا بلکہ میرا تو خیال ہے سدھوراں نے تیرے سے کبھی محبت نہیں کی ورنہ محبت کرنے والوں کے لیے محبت ہی سب سے بڑی دولت ہوتی ہے۔“ ملوکان کے لبوں سے خود بخود سدھوراں کے لیے غیبت بھرے الفاظ نکلتے چلے گئے۔

”تم دونوں کا خیال بالکل غلط ہے۔“ اچانک خاموش کھڑی میراں نے پہلی بار لب کشائی کی۔ وہ نو جوان اور ملوکان چونک کر اس کا چہرہ تنکنے لگے، میراں کے چہرے پر عجیب کھوئے کھوئے سے گہرے تاثرات کھنڈ آئے تھے، وہ بالکل بدلی ہوئی نظر آرہی تھی پھر وہ چند قدم ان کے قریب آئی اور سنجیدگی سے بولی۔ ”سدھوراں ایک عورت ہے اور ایک عورت کی ایک نہیں ہزار مجبوریاں ہوتی ہیں، اس کے اندر ایک مرد سے بڑھ کر ایثار کا جذبہ ہوتا ہے، سدھوراں نے اپنی عزت نفس کی قربانی دے کر بہت سے لوگوں کو اس خبیث وڈیرے زادے کے چنگل سے نجات دلائی تھی۔“ میراں اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ اس کا چہرہ اندرونی کیفیات کی آنچ تلے تمبھاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، اس کی مجبورنگاہوں میں اس وقت اپنے محبوب سارنگ کی شبیہ رقصاں، وہ پیش منظر کے بجائے پس منظر میں کھوئی گئی تھی۔

وہ نو جوان اور ملوکان حیرت سے میراں کا چہرہ تنکنے لگے مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ نو جوان نفرت سے میراں کو جھٹلاتے ہوئے بولا۔ ”عورت کی مجبوریاں ایک ڈھونگ کے سوا کچھ نہیں، میں نہیں مانتا، میں بس اتنا جانتا ہوں کہ جو عورت ایک بار محبت کرتی ہے، مرتے دم تک اور آخری سانس تک اسے نبھاتی ہے، وہ اپنی عزت کا سودا نہیں کرتی۔“ اس کا لہجہ بتدریج تلخ ہوتا جا رہا تھا۔

ملوکان نے بڑے مدہم اور گہرے لہجے میں اس نو جوان سے کہا۔ ”سب عورتیں سدھوراں جیسی نہیں ہوتیں جو محبت کی قدر نہ جانیں، ادھر دیکھ میری نگاہوں میں تیرے کو کیا دکھائی دیتا ہے؟“

وہ نو جوان چونک کر ملوکان کی جھیل ایسی آنکھوں میں دیکھنے لگا، اس کے عجیب لہجے کی حلاوت اور آنکھوں کی تپش نو جوان نے محسوس تو کی مگر وہ ان معنی خیز کیفیات کو جذب نہ کر

ادھر ہی اسے پانی کا بارانی تالاب بھی نظر آجائے گا اور ایسا ہی ہوا، وہ جیسے ہی ذرا قریب پہنچا، اسے چند بھٹکے بھٹکے کھجوروں کے بیڑوں کے دامن میں ایک تالاب ساد کھائی دے گیا، جس کی شفاف سطح پر کھجوروں کے جھنڈ کے درمیان سے روشن روشن چاند کا دمکتا کھڑا بڑا ہی دلکش منظر پیش کر رہا تھا۔

سارنگ نے فوراً سانڈنی کو روکا اور جلدی سے اتر کر سینے کے بل کنارے پر لیٹتے ہوئے اس نے اپنا گرد آلود چہرہ تالاب میں ڈبو دیا، پانی کی برودت چہرے سے نکلواتے ہی اسے اپنے ریختہ وجود میں ٹھنڈک اور سکون کا احساس ہوا پھر اس نے جی بھر کر پانی پیا پھر ایک کھجور کے نسبتاً کم بلند درخت پر اپنی اجرک کی کانپھ بنا کر اس پر چڑھ گیا اور ایک تازہ کھجوروں کا گچھا اتار لایا، خود بھی کھانے لگا اور سانڈنی کو بھی یہ کھجور کھلائے پھر سارنگ نے تھوڑی دیر آرام کا سوچا، گاتریا کے اونٹ کے نشانات اس تالاب کے قریب سے گزر کر آگے دور تک چلے گئے تھے، سارنگ نے دل ہی دل میں اندازہ لگا لیا تھا کہ گاتریا یہاں اس تالاب کے کنارے کچھ دیر ستانے کے بعد آگے بڑھ گیا تھا، سارنگ نے یونہی تالاب کے کنارے کھڑے کھڑے دو نظریں دوڑائیں تو اسے کچھ کچھ آبادی کے آثار دکھائی دیئے، یہ کوئی نخلستانی گوٹھ تھا، سارنگ نے محسوس کیا کہ وہ اپنی سرزمین سے کافی دور سرحدی علاقے کی طرف نکل آیا تھا تاہم اس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ درست منزل کی طرف گامزن تھا، اب اسے اس بات کی پوری امید تھی کہ وہ بہت جلدی اس منحوس گاتریا کو جالے گا، یہاں خشک سالی اور قحط کا عفریت ابھی نہیں پہنچا تھا۔

سارنگ وہیں تالاب کے مختصر سے ریتیلے کراڑے پر لیٹ گیا، تھکا ہوا تو تھا جی لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی، جانے کتنی دیر وہ سویا تھا کہ اچانک اس کی آنکھ کھلی اور وہ بری طرح چونک پڑا۔

☆=====☆=====☆

اجاڑ ماحول کی کارستانی جان کر کے بغیر چلتا رہا۔ اچانک اس کی نظر سامنے ایک سانڈنی پر پڑی، وہ خاصی صحت مند تھی، اسے دیکھ کر سارنگ کی آنکھیں چمک اٹھیں، وہ فوراً اس کی طرف بڑھا پھر ٹھٹھک کر رک گیا، سانڈنی کے بالکل قریب ایک بے سدھ وجود پڑا تھا، سارنگ قریب آیا، سانڈنی سوگوار سی نظروں سے سارنگ کی طرف دیکھنے لگی، سارنگ زمین پر پڑے بے سدھ انسانی وجود کو تنکے لگا، کھیموں اور دیگر کیڑے، مکوڑوں کے جھرمٹ سے سارنگ کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ بے سدھ وجود لاش میں تبدیل ہو چکا تھا، سارنگ کے پاس وقت نہ تھا، وہ جان گیا تھا کہ یہ سانڈنی سوار تھا اور اس کی لاش کو دفنانہیں سکتا تھا، سارنگ نے جلدی سانڈنی کی پشت کو پھتہ پھتہ پایا اور اس پر سوار ہو گیا، سارنگ نے اسے ہشکارے دیئے مگر وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی، وہ چند لمحے سوچ کر اس کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا پھر مخصوص انداز میں اسے ہشکارنے لگا، سانڈنی نے ناک سے عجیب سی ”آں..... آں..... آں.....“ کی آواز نکالی اور پھر سارنگ کے اشارے پر چلنے لگی، سارنگ خوشی سے کھل اٹھا، وہ اب وہ جلد سے جلد اس منحوس اور اجاڑ بستی سے آسانی سے نکل سکتا تھا، اگلے ہی لمحے سانڈنی ہو اسے باتیں کرنے لگی، سانڈنی پر ہلکی پھلکی زین بھی کسی ہوئی تھی، سارنگ ذرا ہی دیر بعد بستی سے باہر تھا، اب وہ سانڈنی کو ریت پر گاتریا کے اونٹ کے پیروں کے نشانات پر دوڑاے چلا جا رہا تھا، سارنگ نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ مولائے کریم نے اس کی سن لی تھی اور اس کے سفر کا وسیلہ اس تیز رفتار سانڈنی کی صورت میں عطا کر دیا تھا، اب سارنگ کے دل میں امید پیدا ہو چلی تھی کہ وہ بہت جلد اس مکار اور فریبی گاتریا تک جا پہنچے گا، سارنگ کو اپنی بھائی اللہ وسالی کی پُر اسرار بیماری پین بلا کی طرف سے فکر لاحق تھی، اگر اس کا بروقت علاج نہ ہوا تو وہ بے چاری ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گی۔ ان پریشان کن خیالات نے اسے بری طرح جھنجھوڑ ڈالا اور پھر وہ رکا نہیں، اس نے سانڈنی کی رفتار پہلے سے بھی زیادہ تیز کر دی، وہ دل میں خدا سے یہ دعائیں بھی کرتا چلا جا رہا تھا کہ کوئی صحرائی طوفان نہ اٹھ پڑے ورنہ گاتریا کے اونٹ کے پیروں کے نشانات معدوم ہو سکتے تھے اور سارنگ جانتا تھا پھر وہ ساری زندگی کا تریا کو تلاش نہیں کر سکتا تھا اس لیے وہ بغیر کے سانڈنی کو دوڑائے چلا جا رہا تھا حتیٰ کہ رات ہو گئی، پورے صحرا میں خشک طلسماتی چاندنی پھیل گئی مگر سارنگ بالکل نہیں رکا۔

جب رات اپنے آخری پہر میں داخل ہوئی تو سارنگ کو کھجور کے درختوں کا ایک نخلستانی سلسلہ نظر آیا، وہ خوشی سے بھول گیا، اس کی بھوک کا مسئلہ حل ہو گیا تھا، اسے میدھی

طرح فریفتہ ہے، الناقم نے جہاں داد سے یہ جھوٹ بھی بول دیا کہ تم نے اس کے کہنے کے مطابق سدھوراں کو مصیبت سے نجات دلادی ہے، میں تو اب یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کل کلاں اگر یہ بات اس وڈیر زادے کے سامنے آشکار ہوگئی جس کا مجھے پورا یقین ہے کہ ہوگی تو پھر کیا ہوگا، سدھوراں کا تو جو حشر ہوگا سو ہوگا، جہاں داد تمہارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائے گا۔“ ڈاکٹر جواد کے لہجے میں تشویش اور چہرے پر لفظ بہ لفظ پریشانی عود کرتی چلی آ رہی تھی۔

”کیا تم مجھے اس طرح بے حوصلہ کرنا چاہتے ہو جواد.....؟“ ڈاکٹر فوزیہ نے سنجیدگی

سے کہا۔

”نہیں میں صرف تمہیں آئندہ حالات کی سنگینی سے باخبر کرنا چاہ رہا ہوں۔“ ڈاکٹر جواد نے گہری سانس لے کر کہا پھر مزید بولا۔ ”اور ویسے بھی اب کیا ہو سکتا ہے، تم نے اوکھلی میں سروے ہی دیا ہے، اب تو آگے کی سوچنا چاہئے۔“

ڈاکٹر جواد کی بات سن کر ڈاکٹر فوزیہ ایک دم کھل اٹھی اور چپک کر بولی۔ ”یہ ہوئی نا مردوں والی بات.....“

”اچھا اب تم مجھے مردوں سے مردوں میں نہ بدل دینا۔“ ڈاکٹر جواد ماحول کی کشافیت دور کرنے کی غرض سے بذلہ سنجی سے بولا تو ڈاکٹر فوزیہ کے حنائی لبوں پر محبوبانہ مسکراہٹ نمودار آئی۔

”دیکھو جواد.....! میرے دماغ میں آئندہ کا لائحہ عمل ہے۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے دوسرے لمحے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”ہاں بتاؤ..... میں سن رہا ہوں۔“ وہ بولا۔

”میں سدھوراں کو اپنے ساتھ کراچی لے جاؤں گی۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے جیسے دھماکہ کیا اور ڈاکٹر جواد چونک کر اس کا منہ تھکنے لگا۔ ”ہاں جواد.....! میں نے اس معصوم اور دکھوں کی ماری بے سہارا لڑکی کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی اور اپنے گھر اپنی بہن بنا کر رکھوں گی۔“

ڈاکٹر جواد کا حیرت سے منہ کھل گیا اور وہ ایسی نظروں سے ڈاکٹر فوزیہ کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔ ”تو..... یہ..... تم کیا کہہ رہی ہو فوزیہ.....؟“ بالآخر اس نے الجھ کر پوچھا۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“

”فوزیہ.....! بھئی یہ کیا معاملہ ہے آخر.....؟“ منشی خیر بخش کو چلتا کرنے کے بعد ڈاکٹر جواد نے اس سے پوچھا۔ ”مریضہ کی حالت اگر اتنی ہی نازک تھی تو اسے یہ لوگ اپنی گاڑی میں بٹھا کر شہر لے جاسکتے تھے اور..... اور اس کا نومولود بچہ بھی دکھائی نہیں دے رہا، کیا وہ مر گیا.....؟“ ڈاکٹر جواد نے اپنی افتادہ طبع سے مجبور ہو کر کئی ایک سوال کر ڈالے۔

ڈاکٹر فوزیہ کے چہرے پر گہری خاموشی کھنڈ آتی تھی۔ درحقیقت وہ ڈاکٹر جواد کو نہ صرف ساری صورت حال مفصل انداز میں سنانا چاہتی تھی بلکہ وہ سدھواں سے متعلق اس سے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتی تھی۔

اس نے پھر ڈاکٹر جواد کو ہولے ہولے سب کچھ گوش گزار کر دیا اور سدھوراں سے متعلق یہ ساری کتھا سننے کے بعد ڈاکٹر جواد خاصی دیر تک ہکا بکا سا رہ گیا پھر ایک طویل سانس بھرتے ہوئے بولا۔ ”فوزیہ.....! میں جانتا ہوں تم اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو اور میں تمہاری آنکھوں میں سدھوراں کے لیے ہمدردی اور اس کی مدد کرنے کے بھرپور عزم کی پرچھائیں محسوس کر رہا ہوں لیکن فوزیہ.....! اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جذبہ انسانیت سے مغلوب ہو کر پرانی آگ میں کودنے کا انجام کچھ ٹھیک نہیں ہوتا، اس سے اپنا نشیمن بھی خاکستر ہونے لگتا ہے، جہاں داد جیسے وڈیرے زادوں کی خصلت بڑی خطرناک ہوتی ہے، یہ لوگ معمولی بات کو بھی انا کا مسئلہ بنالیں تو پھر پیچھا نہیں چھوڑتے ساری زندگی.....“ ڈاکٹر جواد نے متحمل اور مدہم سے لہجے میں ڈاکٹر فوزیہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر فوزیہ جیسے پہلے ہی سے اس بات کی منتظر تھی لہذا فوراً بولی۔ ”جواد.....! آخر انسانیت بھی کوئی شے ہوتی ہے، تمہارا کیا خیال ہے اگر ایک کمزور و مجبور انسان مصیبت میں گرفتار ہو اور ہم سے مدد کا خواباں بھی اور اس کی مدد کرنا ہمارے بس میں بھی ہو تو کیا اس سے منہ موڑ لیا جانا چاہئے؟“

”تم اس کی کیا مدد کر سکتی ہو، وہ ایک وڈیرے زادے کی محبوبہ ہے، وہ اس پر بری

”تم اس کی ملکیت نہیں ہو، وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، تمہیں پہلے کی طرح ایک اور ڈرامہ کرنا ہوگا۔“

”لل..... لیکن باجی! آ..... آپ یہ سب کیوں کر رہی ہیں، میری وجہ سے کہیں آپ بھی کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔“ سدھوراں کے لرزیدہ لہجے میں اچانک تشویش درآئی۔

”کچھ نہیں ہوگا مجھے..... تم تو خود ایک بہادر لڑکی ہو پھر ایسا کیوں سوچتی ہو۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے اسے تشفی دی۔

سدھوراں نے اس بار بدلے بدلے لہجے میں جواب دیا۔ ”نہیں باجی! یہ بات نہیں..... مجھے تو اب جہاں داد سے سخت نفرت ہو گئی ہے بلکہ میرا تو جی کرتا ہے کہ میں اس درندے کا منہ فوج لوں۔“

”بس ٹھیک ہے پھر فیصلہ ہو گیا، اب میری بات سنو..... تم نے ایک نیا ڈرامہ کرنا ہے۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر فوزیہ اسے سرگوشیاں لہجے میں کچھ سمجھانے لگی۔

☆=====☆=====☆

یوں سدھوراں کو میڈیکل کیمپ میں رہتے ہوئے اگلا دن بھی گزر گیا، جہاں داد کے دونوں کارندے بدستور کیمپ میں موجود تھے، اس دوران منشی خیر بخش لینڈ کروزر میں وہاں آتا رہتا تھا، آخر اگلے دن اس نے ڈاکٹر فوزیہ سے سدھوراں کو فارغ کرنے کے لیے کہا تو ڈاکٹر فوزیہ نے منصوبے کے مطابق انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”سدھوراں کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی ہے، اسے شہر پہنچانے تک ادھر ہی کیمپ میں رہنا ہوگا فی الحال ورنہ اس کی زندگی کو خطرہ بھی لاحق ہو سکتا ہے۔“

ڈاکٹر فوزیہ کی بات سن کر منشی خیر بخش سوچ میں پڑ گیا۔ یہ بات ہی ایسی تھی کہ وہ مزید آگے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، اس لیے خاموشی سے واپس لوٹ گیا، اس بار اس کے وہ دونوں کارندے بھی اس کے ساتھ لوٹ گئے۔

ڈاکٹر فوزیہ نے بے اختیار سناٹا کا سانس لیا۔ یہ اسی دن کا ذکر تھا کہ دوپہر کے قریب انہیں ایک ہیلی کاپٹر لینے آ گیا، ڈاکٹر فوزیہ کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا، اس کے خیال کے مطابق سدھوراں کو اپنے ساتھ شہر لے جانے کا یہ بہترین موقع تھا کیونکہ اب تو جہاں داد کے وہ دونوں کارندے بھی واپس لوٹ گئے تھے، راستہ صاف تھا لہذا جلدی جلدی کیمپ سمیٹا جانے لگا۔

”مگر تم اسے اپنے ساتھ شہر کیسے لے جاؤ گی، وہ وڈیرا زادہ..... کیا وہ اسے تمہارے ساتھ آسانی سے جانے دے گا.....؟“

”ہاں..... میں نے ایک ترکیب سوچ لی ہے، سدھوراں کو اپنے ساتھ لے جانے کی۔“

”مگر فوزی.....! تم اس حالت میں کیسے اسے اپنے ساتھ رکھو گی..... نہیں..... نہیں فوزی.....! تم اتنا بڑا رسک کیسے اٹھا پاؤ گی.....؟“ ڈاکٹر جواد پریشان ہو کر بولا۔

”آگے اللہ مالک ہے، کچھ نہ کچھ سوچ لیا جائے گا، مجھے پورا یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے بھرپور یقین سے کہا تو ڈاکٹر جواد خاموش سا ہو کر رہ گیا۔

ڈاکٹر فوزیہ اس کی کلاس فیلو اور اچھی ساتھی رہ چکی تھی، اس رعایت سے جواد کو اسے سمجھنے کا کافی موقع ملتا رہا تھا، یہی سبب تھا کہ وہ ڈاکٹر فوزیہ کی خصوصی طبیعت اور ارادے کی پختگی سے اچھی طرح واقف تھا، وہ ایک درد مند دل رکھنے والی پُر عزم لڑکی تھی مگر ڈاکٹر جواد کو اب اس کی یہ صفات خطرناک محسوس ہونے لگی تھیں اور ساتھ ہی اس نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ ڈاکٹر فوزیہ کو اس ارادے سے باز رکھنا ناممکن اور عبث تھا لہذا اس نے سرِ دست خاموشی اختیار کر لی۔

اس کے بعد ڈاکٹر فوزیہ کیمپ کے دوسرے پورشن میں آگئی جدرہ سدھوراں کو رکھا ہوا تھا، اس نے محبت سے سدھوراں کا ہاتھ تھام لیا اور ملائمت سے بولی۔ ”سدھوراں.....! تم آج سے میری بہن ہو، دیکھو اب میں تمہیں اپنے ساتھ شہر بلکہ اپنے گھر لے جانا چاہتی ہوں، تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں.....؟“

ڈاکٹر فوزیہ کے بیٹھے اور پُر خلوص لہجے پر سدھوراں کی آنکھوں میں فرط عقیدت سے آنسو نکل آئے، وہ جذبات سے کپکپاتی آواز میں بولی۔ ”ڈاکٹر فی صاحبہ.....! میں..... میں..... اس قابل کہاں..... آپ تو بہت..... بہت عظیم ہیں، میں..... میں..... اور اب کیا کہوں.....“

”تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں اب ہاں اب تم مجھے ڈاکٹر فی صاحبہ کی بجائے صرف باجی کہو..... سمجھیں۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے ملائمت سے کہا اور سدھوراں کو گلے سے لگا لیا۔

سدھوراں اب اٹھ بیٹھی تھی پھر معاً اس کی بڑی بڑی سرگیں آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرا گئے اور وہ اس لہجے میں ڈاکٹر فوزیہ سے بولی۔

”ڈاکٹر صاحبہ.....! میرا مطلب ہے باجی.....! وہ مردود جہاں داد کیا مجھے آپ کے ساتھ جانے دے گا؟“

یہی وہ وقت تھا جب اچانک ڈاکٹر فوزیہ کو دور ایک لینڈ کروزر تیزی سے دوڑتی نظر آئی، وہ بری طرح ٹھٹکی اور چونک کر ریت کے بگولوں کو دیکھنے لگی پھر اگلے ہی لمحے لینڈ کروزر ریت کے بادل اڑاتی ان کے بالکل قریب آ کر رک گئی، اس کے بعد جو بھاری بھرے شخص اجڑک کا ندھوں پر ڈالے بڑے کروفر کے ساتھ نیچے اترے، اسے دیکھ کر ڈاکٹر فوزیہ کو پاؤں سانس سینے میں اٹکتا ہوا محسوس ہونے لگا، وہ جہاں داد تھا۔

جہاں داد کے لینڈ کروزر سے اترتے ہی اس کے ساتھ تین چار مسلح کارندے بھر نیچے اتر آئے۔

”ڈاکٹر فی صاحبہ! آپ ہماری مریضہ کو فارغ کیوں نہیں کر رہی ہیں۔ منشی بر کو بتا رہا تھا کہ.....!“ جہاں داد کا جملہ حلق میں ہی اٹک گیا۔

دوسرے ہی لمحے ڈاکٹر فوزیہ نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”جہاں داد صاحب! آپ میرے ساتھ آئیں..... یہاں باتیں کرنا مناسب نہیں۔“

جہاں داد نے تقیہی انداز میں سر ہلایا۔ ”اے اچانک ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔“

”دیکھئے جہاں داد صاحب.....! یہ معاملہ ایسا نہ تھا کہ باہر سب کے سامنے گفتگو کی جاسکتی۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے اسے کیپ کے اندرونی گوشے میں لے جا کر چالاکی سے کہا۔ یہاں سدھوراں بھی اسٹریچر پر دراز تھی اور پہلے سے سوچے سمجھے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے نیم بے ہوشی کے عالم میں اپنا سر دائیں بائیں پٹک رہی تھی اور تکلیف کے مارے کراہ بھی رہی تھی۔

”ڈاکٹر فی صاحبہ.....! کیا ہوا اسے، یہ تو بھلی چٹلی تھی.....؟“ اچانک جہاں داد سدھوراں کی حالت دیکھ کر قدرے تشویش بھرے انداز میں بولا۔

”اس کی طبیعت تو اب تک سنبھل ہی نہیں سکی ہے۔ جہاں داد صاحب.....!“ ڈاکٹر فوزیہ نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ ”یہ بہت کمزور تھی مگر آپ کی ضد تھی کہ یہ کام اسی وقت ہو اب خون زیادہ بہنے کی وجہ سے بلڈ پریشر مزید گرتا چلا جا رہا ہے۔“

”تو پھر اب کیا ہوگا.....؟“

”گھبرانے کی بات نہیں..... میں اسے شہر اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں، وہاں ایک مشہور لیڈی ڈاکٹر ہے جو ایسے کیس حل کرنے میں ماہر ہے۔“

”لیکن ڈاکٹر صاحبہ.....! میں خود ہی کیوں نہ.....“

”نہیں.....! یہ خطرہ آپ نہ مول لیں تو اچھا ہے، اس سے مریضہ کی حالت مزید.....“

سکتی ہے اور پھر یہ کیس بھی میرے ہی ہاتھوں ہوا ہے، اس لیے میں ہی زیادہ تفصیل دے سکتی ہوں تاکہ اس کا علاج کرنے میں آسانی ہو..... ہمارے پاس بیلٹی کا پٹر ہے، ہم چند منٹوں میں شہر پہنچ جائیں گے جبکہ آپ کو گاڑی میں بہت دیر لگے گی۔“ ڈاکٹر فوزیہ کی کھوس دلیلوں نے جہاں داد کو رام کر لیا ورنہ وہ یہی تہیہ کر کے آیا تھا کہ سدھوراں کو خود ہی شہر لے جائے گا۔

”اچھا ڈاکٹر فی صاحبہ.....! مگر شہر میں، میں آپ کو کہاں تلاش کروں گا.....؟“

ڈاکٹر فوزیہ نے اسے ایک بڑے پرائیویٹ میڈیکل سینٹر کا پتہ بتایا جہاں وہ سدھوراں کو داخل کروانا چاہتی تھی۔ جہاں داد نے کچھ سوچ کر اثبات میں اپنا سر ہلادیا اور ڈاکٹر فوزیہ کا شکریہ ادا کر کے واپس چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ عندیہ دے گیا تھا کہ وہ جلد ہی مذکورہ میڈیکل سینٹر پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ اس بلا کے ملتے ہی ڈاکٹر فوزیہ نے سکھ کا سانس لیا ورنہ وہ ڈرگٹی تھی کہ اس بلا سے کیسے جان چھڑائے گی۔ ڈاکٹر فوزیہ نے اس بات کا بھی شکریہ ادا کیا تھا کہ جہاں داد نے اس بار اپنے کسی کارندے کو اس کے سر پر مسلط نہیں کیا تھا اور دوسری سب سے اہم اور خوش آئند بات اس نے یہ محسوس کی تھی کہ جہاں داد نے اس سے اس کا نام نہیں پوچھا تھا۔ ڈاکٹر فوزیہ، جہاں داد کو جتنا شاطر سمجھ رہی تھی، اس سے کہیں زیادہ وہ بے وقوف نکلا تھا۔

☆=====☆=====☆

”سانول.....!“ ملوکاں نے زیر لب اور بڑی وارفتگی سے یہ نام دہرایا جسے قریب کھڑی میراں نہیں سن سکی البتہ اس نوجوان سانول نے اپنا نام ضرور سن لیا..... اپنا نام سن کر قدرے چونک کر ملوکاں کا چہرہ کتنے لگا..... ملوکاں اسے بڑی مخمور نگاہوں سے دیکھ رہی تھی پھر اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر شرم سے نگاہیں نیچی کر لیں جب سانول نے ان سے تفصیلاً ان کے بارے میں پوچھا تو ملوکاں نے اپنی ساری رام کٹھا اسے سنا ڈالی۔

”کیا تم دونوں کو پورا یقین ہے کہ تمہارے ماں، پو بدین ہی کی طرف گئے ہیں؟“

ساری داستان سننے کے بعد سانول نے ان سے پوچھا تو ملوکاں نے خاموشی سے اثبات میں اپنا سر ہلادیا۔ اپنے ماں، باپ کے ذکر پر ملوکاں اور میراں دونوں کے چہرے غمگین ہو گئے تھے۔

”ٹھیک ہے پھر مجھے وہاں کا راستہ آتا ہے..... وہاں میرے رشتے کا ایک ماما اللہ رکھو رہتا ہے، وہ بے اولاد ہے، کبھی باڑی کا کام کرتا ہے، میں بھی اسی طرف جا رہا تھا۔“

سامنے ہی کچے صحن میں ایک عمر رسیدہ شخص کھری چار پائی پر چائے کی پیالی تھا ہے ہوئے نظر آیا، یہی سانول کا ماما اللہ رکھیو تھا۔ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود ماما اللہ رکھیو کی نظریں تیر تھیں۔ صحن خاصا بڑا تھا اور چار پائی بھی دروازے سے دور پچھی ہوئی تھی مگر ماما اللہ رکھیو اپنے بھانجے سانول کو فوراً پہچان گیا اور جلدی سے پیالی ایک طرف رکھ کر چار پائی سے اٹھ کر کھڑا ہوا، دونوں ماما بھانجے بڑی محبت اور گرجوشی سے ایک دوسرے سے بغلیگر ہوئے۔

پھر ماما نے ملوکاں اور میراں کے سر پر بھی باری باری ازراہ شفقت ہاتھ دھرا اور سانول سے ان کے بارے میں پوچھا۔ سانول نے مختصر ملوکاں اور میراں کے بارے میں بتایا کہ یہ دونوں اپنے ماں، باپ کا تلاش کر رہی ہیں جو اسی گوشے میں آئے ہیں۔

”پٹ.....! بھا خدا بخش اورادی نہلاں کدھر ہیں..... وہ تیرے ساتھ نہیں آئے؟“
اچانک ماما نے سانول سے پوچھا تو سانول کا چہرہ سو گوار ہو گیا۔
”ماما.....! ماں، بیو تو گزر گئے..... بہت بیمار ہو گئے تھے وہ.....“ سانول نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔

یہ سن کر ماما کو ایک جھٹکا لگا وہ چار پائی پکڑ کر بیٹھ گیا۔ بہنوئی اور بہن کی موت کی خبر نے اسے گہرا صدمہ پہنچایا تھا۔

سانول نے ماما کے کاندھے پر کپکپاتا ہوا ہاتھ رکھا اور غم سے چور لہجے میں بولا۔
”ماما.....! ہمارے گھر میں جو قیامت ٹوٹی ہے، اس میں تو جوان لوگ قحط کی وجہ سے اپنی جانیں ہار بیٹھے ہیں، بوڑھوں کا کیا حال ہوا ہوگا، تم خود سوچ لو۔“

ذرا دیر کی سو گوار خاموشی کے بعد ماما نے اپنے کاندھے پر دھری میلی چیکٹ اجرک سے اپنے آنسو پونچھے پھر زیر لب دعا پڑھی اور ”حکم اللہ کا“ کا کہا پھر ملوکاں اور میراں سے بولا۔ ”اڑی دھیو.....! تم کیوں کھڑی ہو..... آ جاؤ بیٹھو ادھر تو بھی بیٹھ سانولے.....! میں تمہارے لیے مانی ٹکر کا بندوبست کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ قریب ہی بنی ایک چھوٹی سے رسوئی کی طرف بڑھنے لگا۔

ملوکاں نے ایک دم کھڑے ہو کر کہا۔ ”ماما.....! تو کیوں تکلیف کرتا ہے، میں مانی بنا لیتی ہوں۔“

”نادھیئے نا.....! تم لوگ پہلے ہی تھکے ٹوٹے ہوئے ہو..... میں خود ہی بنا لیتا ہوں.....“
سبے جاری بھاگی کے گزرنے کے بعد پچھلے دس بارہ سال سے میں خود ہی کھانا بنارہا ہوں۔“

اس نوجوان کی بات سن کر وہ دونوں خوشی سے نہال ہو گئیں۔ ملوکاں زیادہ خوش تھی کہ یہ باہر جیلان نوجوان ان کی مدد کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے..... وہ اس کی ہمراہی میں اب تک وارنٹی اور عجیب سا سرور محسوس کرنے لگی تھی۔

بہر طور ان لوگوں سے فی الفور کوچ کرنے کا قصد کیا اور آگے چل پڑے..... خیمے کا مختصر سامان سانول نے لپیٹ کر اپنے اوپر لاد لیا تھا۔

خوشی قسمتی سے اگلے دن صبح یہ لوگ ایک کارواں سے جا ملے جو ٹنڈو باگو کی طرف جارہا تھا۔ بدین وہاں سے زیادہ دور نہ تھا..... وہاں سے انہیں کوئی تیل گاڑی مل سکتی تھی لہذا وہ اس کارواں میں شامل ہو گئے۔ یہ قافلہ خاصا منظم تھا، اس میں مال، مویشی بھی تھے اور تیل گاڑیوں کے علاوہ اونٹ بھی۔

ان تینوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کارواں چلتا رہا اور دو تین روز بعد یہ لوگ ٹنڈو باگو پہنچ گئے اور پھر یہاں سے انہیں ایک لاری مل گئی، وہ اس میں سوار ہو کر بدین کے ایک چھوٹے سے نواحی گوشے میں پہنچ گئے، یہی ان کا مطلوبہ گوشہ تھا، یہاں پہنچ کر سانول کو آسانی سے اپنے ماما اللہ رکھیو کے گھر کا پتہ مل گیا، یہ پتہ ایک چھپر ہوٹل میں چائے پینے کے دوران ایک شخص سے ملا، یہ شخص اس گوشے کا دھوبی تھا۔

تھوڑی دیر میں یہ تینوں اس شخص کے ساتھ ایک گارے مٹی والے چھوٹے کچے گھر کے دروازے پر پہنچ کر رک گئے۔

”یہ لو بابا.....! یہی اللہ رکھیو کا گھر ہے، میں چلتا ہوں۔“ اس بھلے مانس آدمی نے سانول سے کہا۔

سانول ازراہ تشکر بولا۔ ”سائیں.....! تیری وڈی مہربانی۔“
”اڑے بابا! مہربانی کیسی.....! اچھا چلتا ہوں۔“ یہ کہہ کر بھلا مانس شخص چلا گیا۔
سانول نے پردے کے طور مستعمل جھولتی بوسیدہ سی رلی کے ٹاٹ کو ہٹا کر دروازے پر دستک دی۔

”اڑے بابا کون ہے..... آ جاؤ اندر..... در کھلا ہے۔“ اندر سے ایک کھانستی ہوئی آواز ابھری۔

سانول نے دھیرے سے دروازے کو دھکیلا اور پھر پہلے ملوکاں اور میراں کو اندر داخل ہونے کا راستہ دیا پھر خود بھی اندر چلا گیا۔

ماما اللہ رکھیو نے طویل سانس لے کر کہا اور اپنا سر دھتا ہوا رسوئی کی طرف بڑھ گیا۔

”کیا تیرے ماما کا دنیا میں کوئی نہیں ہے ژے سانول..... یہ اکیلا ہی رہتا ہے اس گھر میں.....؟“ ملوکاں نے چار پائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

وہ پھکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”ہاؤ..... ماما بھاگی کو گزرے دس سال بیت گئے ہیں..... بے چارے مارے ماما اللہ رکھیو نے جانے کیوں دوسری شادی بھی نہیں کی، بس اپڑیں ہی حال میں مست رہتا ہے۔“

”یہ کرتا کیا ہے..... میرا مطلب ہے اپنی گزر بسر کیسے کرتا ہے.....؟“ ملوکاں نے اگلا سوال کیا۔

”رہا کی (کھیت مزدوری) کرتا تھا پہلے تو، اب پتہ نہیں کیا کرتا ہے..... آئے تو پوچھوں گا۔“ سانول نے کہا۔

پھر تھوڑی دیر بعد میراں نے سانول سے پوچھا۔ ”ادا سانول.....! کیا ہمارے ماں، پیو اسی گوٹھ میں ہوں گے.....؟ مجھ سے اپڑیں ماں، پیو کی دوری اب برداشت نہیں ہوتی..... پتہ نہیں وہ کتنے پریشان ہو رہے ہوں گے..... ٹو نے ہم پر بہت احسان کیا ہے ادا.....! ایک اور احسان کرو ہم پر ہمیں اپڑیں ماں، پیو سے ملا دے۔“

”اللہ سائیں کرے گا تیرے ماں، پیو ضرور مل جائیں گے ٹو کیوں گھبرائی ہے..... مجھے ادا کہا ہے تو میں اپڑاں یہ وعدہ ضرور پورا کروں گا، میں ابھی ماما سے اس سلسلے میں بات کرتا ہوں۔“ سانول نے اسے تسلی دی۔

اتنے میں ماما اللہ رکھیو ایک بڑی سی ڈلیہ میں چاولوں کی پانچ چھ بڑی بڑی روٹیاں لے کر آ گیا، جس پر دیسی گھی کے تڑکے علاوہ ساگ بھی رکھا ہوا تھا پھر ان تینوں نے مل کر کھانا کھایا۔ اس وقت شام کے سائے سرمئی ہونے لگے تھے اور جس زدہ ماحول میں ذرا کی واقع ہونے لگی تھی۔ اس دوران ماما نے صحن میں تازہ پانی کا چھڑکاؤ کیا تو کچے صحن کی زمین اور دیواروں سے سوندھی مٹی کی مہک سی اٹھنے لگی۔

”ماما.....! اب سب سے پہلا کام ان دونوں چھو کر یوں کے ماں، پیو کو تلاش کرنا ہے..... تیرے کو کچھ پتہ ہے ماما کہ تھر سے آئے ہوئے کتنے خاندان ادھر آ کر بے ہیں؟“ سانول نے پوچھا۔

ماما اللہ رکھیو نے ذرا سوچ کر جواب دیا۔ ”ہاؤ پیٹ.....! تھر سے آئے ہوئے یوں تو بہت سے لوگ ہیں بلکہ ابھی تک آمد ہے یہاں اور آس پاس کے گوٹھ میں بھی کچھ آباد ہوئے

ہیں، انہیں ڈھونڈنا پڑے گا۔“ وہ ملوکاں اور میراں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”دھیو.....! تمہارے ماں، پیو کے نام کیا ہیں اور وہ جس قافلے میں تھے، اس کا سالار کون تھا؟“ ملوکاں اور میراں نے اپنے اپنے والدین کا نام اور سالار کا رواں سائیں بخش کا ذکر کیا۔

پھر میراں نے قدرے تفکر آمیز بے چینی سے پوچھا۔ ”ماما.....! کیا ہمارے ماں، پیو ہمیں مل جائیں گے؟“

اس کے اس معصومانہ سوال پر ماما نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔ ”ہاؤ دھیئے.....! تم کیوں حوصلہ بارتی ہو، میں ہوں ناں..... ڈھونڈ ہی لوں گا، اللہ سائیں ہماری رہبری کرے گا، اچھا یہ بتاؤ دھیو.....! کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ جس قافلے میں تمہارے ماں، پیو شامل تھے، ان کی منزل یہی تھی.....؟“

”ہاں ماما.....! میرا رواں چاچا سائیں بخش کی منزل بدین کا یہی گوٹھ تھا۔“ اس بار ملوکاں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

ماما اللہ رکھیو پورے یقین سے بولا۔ ”اگر یہ بات ہے تو تم بالکل بے فکر ہو جاؤ، صبح اٹھ کر سب سے پہلے کام یہی کروں گا۔“

”تیری وڈی مہربانی چاچا.....!“

”اڑی دھیو.....! مہربانی کیسی، اپڑیں مٹھری دھیوں کے کام آنا کوئی مہربانی تھوڑا ہی ہوتی ہے، یہ تو میرا فرض ہے۔“ ماما اللہ رکھیو نے شفقت آمیز محبت سے کہا پھر بولا۔ ”اچھا تم دونوں اب آرام سے سو جاؤ، آؤ تم دونوں کو اندر لے چلوں۔“ یہ کہہ کر ماما اللہ رکھیو ان دونوں کو پاس پاس بنے دو کوٹھری نما کمروں میں سے ایک میں لے آیا، یہاں صرف ایک رلی بچھی چار پائی بڑی تھی، میراں اور ملوکاں چار پائی پر لیٹ گئیں، لیٹنے سے پہلے انہوں نے ماما کی ہدایت کے مطابق اپنی کوٹھری کے دروازے کی اندر سے کنڈی لگالی۔

☆=====☆=====☆

سارنگ کے اس طرح چونک کر اٹھنے کی وجہ یہ تھی کہ کسی جانور کی تھوٹھنی اس کے چہرے کو سہلا رہی تھی..... سارنگ گھبرا کر یکدم بدک کر اٹھ بیٹھا تب وہ جانور بھی اچھل کر وہاں سے بھاگ اٹھا..... سارنگ نے بغور اسے دیکھا، وہ ایک صحرائی لومڑی تھی، اس کا رنگ سفیدی مائل بھورا تھا، وہ سارنگ سے ذرا دور کھڑی ہو کر اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے

اسے دیکھ رہی تھی..... سارنگ نے اسے ہشکارا دیا تو وہ فوراً بھاگ اٹھی۔

دور مشرق میں پو پھنے لگی تھی..... ارد گرد کا ماحول ہنوز نیم تاریک تھا، شفاف آسمان پر نکا چاند اب پھیکا پڑنے لگا تھا، کہیں کوئی ستارہ کسی مایوس دل میں امید کی موہوم سی جوت کی طرح ٹٹمٹما رہا تھا۔

سارنگ نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا تو دھک سے رہ گیا..... اسے ساندنی کہیں بھی نظر نہ آئی، وہ پریشان سا ہو گیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو حوصلہ دیا اور قریب ہی تالاب سے منہ ہاتھ دھو کر تھوڑا پانی پیا..... پانی نے دانستہ تھوڑا پیا تھا شاید کسی بیماری کے خوف سے، بہر طور وہ پھر رکائیں اور جس سمت اسے نخلستانی آبادی کے آثار نظر آئے تھے، وہ اس طرف بڑھ گیا۔

سارنگ کے دل و دماغ میں اب بار بار اپنی بھالی اللہ وسائی، اس کے ننھے معصوم بچے منٹھار اور نو سالہ فرید کو چہرہ گردش کر رہا تھا اور انہیں یاد کر کے اسے اپنے سینے میں دل گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر اسے وسوسہ نے گھیر لیا تھا اور وہ اس منحوس گاتریا کے خون کا پیسا سا ہونے لگا تھا..... چلتے چلتے وہ بار بار اپنے دونوں ہاتھوں کی منٹھیاں غضب ناک انداز میں اس طرح بھیچے جارہا تھا جیسے وہ گاتریا کی گردن دبا رہا ہو..... غم و غصے کی اس کیفیت میں اس کے قدموں کی رفتار بھی تیز سے تیز تر ہونے لگی تھی۔

سارنگ نے آس پاس پھیلی ہوئی غیر معمولی ہریالی سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اپنی اصل تھر کی دھرتی سے کافی دور بلکہ بہت دور نکل آیا تھا۔ اتنا تو اس نے بھی اپنے بڑوں سے سن رکھا تھا کہ پڑوسی ملک بھارت کی ایک اور صحرائی دھرتی ان کی سرزمین کی حدود سے ملتی تھی جسے راجستھان کہا جاتا تھا۔ تو کیا وہ بھارت کی سرحد کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے خاصے متفکر انداز میں سوچا۔ کیا اس منحوس گاتریا کا تعلق اس ملک کی دھرتی سے تھا.....؟ اس کا ذہن ایک بار پھر زہریلے اور تشویشناک وسوسوں کی آماجگاہ بننے لگا تھا مگر اس کے چلنے رہنے کی رفتار میں کمی نہیں آئی تھی..... وہ بدستور اسی طرح پُر عزم انداز میں آگے بڑھا چلا جارہا تھا..... آبادی کے قریب پہنچ کر اسے کچھ لوگ نظر آئے، یہ لوگ بھی اس کی طرح غربت اور فلاکت کے مارے ہوئے تھے لیکن یہاں قحط سالی کا دیوا بھی نہیں پہنچا تھا، یہاں اسے ایک بوڑھا شخص ملا، اس نے اپنی کمزوری کمر پر سوکھی ٹہنیوں کا بہت بڑا گٹھڑا ٹھار کھانچا اور اسے چلنے میں تکلیف ہو رہی تھی، سارنگ نے ازراہ ہمدردی اس سے وہ گٹھڑا لے لیا اور نرم لہجے میں کہا۔ ”چاچا.....! میں یہ پہنچا دیتا ہوں..... کدھر ہے تیرا گھر.....؟“

اس بوڑھے کے جھریوں بھرے چہرے پر تشکر کی بجائے ایک لمحے کو عجیب سے تاثرات ابھرے اور وہ بغور اس کا چہرہ گھورنے لگا۔ سارنگ شرمندہ سا ہونے لگا، وہ سمجھا شاید اس بوڑھے کو اس کی یہ ہمدردانہ حرکت بری لگی ہے مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ بوڑھا عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”تیری مہربانی، کیا مسافر ہو، کہاں سے آئے ہو.....؟“

سارنگ نے قدرے اطمینان کی سانس لی پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں چاچا.....! مسافر ہی ہوں بلکہ حالات کا مارا ہوا بھی..... میرے کچھ عزیز کھو گئے ہیں، انہیں تلاش کرتا ہوں یہاں تک پہنچاں ہوں شاید تم کچھ مدد کر دو میری.....!“ سارنگ نے فوراً پناہ کا بھی بیان کر دیا۔

اس نے دیکھا، وہ بوڑھا اس کی بات سن کر ایک لمحے کو ٹھٹکا تھا پھر اچانک وہ اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اچھ..... اچھا.....! آجا میرے ساتھ..... مزہی میں بیٹھ کر آرام سے باتیں کریں گے۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا اور سارنگ اس کے پیچھے ہولیا۔

سارنگ نے اس بوڑھے میں ایک عجیب بات محسوس کی کہ اس کا لب و لہجہ اس دھرتی کے لوگوں سے میل نہیں کھاتا تھا پھر اچانک سارنگ کو گاتریا کا بھی انداز گفتگو یاد آنے لگا..... کم و بیش ان دونوں کا لہجہ ملتا جلتا تھا۔

ذرا دیر بعد وہ بوڑھا اسے اپنی پھونس کی بنی جھونپڑی میں لے آیا..... جھونپڑی خاصی کشادہ تھی اور اندر اس کا ایک اور بھی جھونٹا سا گوشہ تھا، وہاں اسے ایک سانولی سی دہلی پتلی مگر تیکھے نقوش والی ایک لڑکی نظر آئی شاید یہ اس بوڑھے کی بیٹی ہے..... سارنگ نے اندازہ لگایا اور اس نے جھاڑیوں کا گٹھڑا فرش پر پٹخ دیا۔

”بابو.....! یہ کون ہے.....؟“ وہ لڑکی سارنگ کو تیکھے چوتھوں کے ساتھ گھورتے ہوئے بولی۔ اس کے ”بابو“ کہنے کے انداز پر سارنگ ایک بار پھر ٹھٹکا تھا۔

”بیٹی.....! یہ مسافر ہے، اس بے چارے کے عزیز رشتے دار کھو گئے ہیں، انہیں لاش کرتا ہوا یہ یہاں تک آپہنچا ہے۔“ اس کے باپ نے جواب دیا پھر سارنگ کو ایک جھلکا سی چار پائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”کیوں رہے.....! کیا نام ہے تیرا.....؟“ لڑکی تیکھے انداز میں اس سے مخاطب ہو کر بولی۔

سارنگ کو اس کا انداز برا لگا..... اس نے بھی خاصے اکھڑ لہجے میں جواب دیا۔ ”سارنگ.....!“

”تیرا کون کھو گیا ہے.....؟“

”ارے امی.....! تُو نے تو اس بے چارے پر بھی تھانیداری شروع کر دی..... اس گریب کو دم تو لینے دے..... میں خود اس سے پوچھتا ہوں۔“ بوڑھے نے اپنی بیٹی کو ٹوکا تو سارنگ کو اس تیکھے چوتھوں والی لڑکی کا نام بھی معلوم ہو گیا جسے سن کر اس کا مسکرانے کو بی چاہا مگر وہ امی کے تیور دیکھ کر اپنی خواہش کو دبایا گیا۔ اس کے بعد وہ بوڑھا سارنگ کے سامنے چارپائی پر بیٹھنے ہوئے اپنی بیٹی سے بولا۔ ”تُو جاتھوڑا کھانے پینے کو لے آ.....“

امی وہاں سے ٹلی تو بوڑھے نے سارنگ کے چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ ”ہاں بھی بادلے.....! اب ذرا تفصیل سے مجھے بتا آخر معاملہ کیا ہے..... تیرا کون کھو گیا ہے اور کیسے.....؟“

بوڑھے کے استفسار پر سارنگ نے اسے فریبی گاتریا کے متعلق بتا دیا، ساتھ ہی اس کا ناک نقشہ بھی بیان کیا، اب تو اس بوڑھے کے چہرے پر پہلے سے بھی زیادہ گہری پراسراریت کھنڈ آئی تھی اور وہ کافی دیر تک گم صم سا بیٹھا رہا۔

سارنگ اپنے تئیں اس بوڑھے کے تاثرات کا اندازہ لگاتے ہوئے سمجھا کہ اس بوڑھے کو مردود گاتریا کے بارے میں علم ہے پھر بے اختیار اس نے بوڑھے سے پوچھا۔ ”چاچا.....! تم نے کیا ایسے شخص کو دیکھا..... وہ اس ہستی میں ہی آیا ہے؟“

”ہاں.....! دیکھا تو ہے۔“ بوڑھے نے گوگو سے لہجے میں کہا۔ سارنگ یکدم پرجوش مسرت سے بولا۔ ”کک..... کیا تُو صحیح کہہ رہا ہے، مجھے بتا کہان ہے وہ..... میں ابھی اس کے جا کر ٹوٹے کرتا ہوں۔“

”میں بتاتا ہوں..... وہ شخص یقیناً گاتریا ہی ہوگا پراس کے ساتھ میں نے کسی عورت یا بچے کو نہیں دیکھا مگر وہ تو یہاں سے آگے نکل گیا ہے۔“ بوڑھے کی بات سن کر سارنگ کی امیدوں پر اس پڑنے لگی۔ ”پرتو چتانا نہ کر..... آرام سے بیٹھ..... وہ جس کے پاس آ کر رہا تھا، میں اسے جانتا ہوں تُو یہاں ذرا بھوجن کر میں ابھی آتا ہوں۔“

”میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔“ سارنگ نے کہا۔ ”نہیں.....! اتنی جلد بازی ٹھیک نہیں، مجھے لگتا ہے وہ جس کے پاس کچھ دن رہا تھا، وہ ضرور اس کا ساتھی ہوگا، تیرے کو دیکھ کر وہ چونک جائے گا، میں خود اسے اپنے طور پر کریدوں گا۔“ یہ کہہ کر بوڑھا اٹھا اور باہر چلا گیا۔ سارنگ کی بھوک اڑ گئی تھی..... وہ اب بے چینی سے اس کے لوٹنے کا منتظر تھا۔

”ارے یہ باپو کدھر چلا گیا..... میں تو اس کے لیے بھی روٹی لائی تھی۔“ اچانک سارنگ کے کانوں میں امی کی کھٹکتی ہوئی آواز ابھری تو وہ چونکا۔ امی ایک بڑا سا تھال پکڑے اس کی چارپائی کے قریب کھڑی تھی۔

”چل لے تو ہی کھالے سارا..... تُو بہت بھوکا ہوگا۔“ امی نے ایک خاص کھٹکتی ہوئی آواز کے ساتھ کہا اور تھال اس کے سامنے چارپائی پر رکھ دیا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے تیری مہربانی.....!“ سارنگ اس وقت پریشان تھا، بھوکا ہوتے ہوئے بھی اس کا کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، اچانک اسے احساس ہوا کہ امی کھڑی اسے خاموشی سے نکتے جا رہی ہے۔ سارنگ نے اچانک سر اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا، امی کے لیج چہرے پر گہرے تاثرات کھنڈے ہوئے تھے۔ وہ بولی۔

”ارے خرے کا بے کو دکھاتا ہے..... اتنی محبت سے تیرے لئے روٹی بنا کر لائی ہوں خالص کھمبیوں کا سالن ہے کھا تو سہی.....!“ اس کا لہجہ بھی اس کے نام کی طرح ترش تھا۔

سارنگ پھر انکار نہ کر سکا اور جلدی سے روٹی کھانے میں مصروف ہو گیا۔ جوار کی روٹی اور کھمبیوں میں سارنگ کو بڑی لذت محسوس ہوئی۔

”میں نے تیری باتیں سن لی تھیں..... بڑا پریم کرتا ہے رے تُو اپنی بھالی اللہ وسائی سے.....!“ امی نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور سارنگ کے سامنے ہی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

جانے کیوں سارنگ کو اس لڑکی کا بے باک اور نڈر پن کھلے لگا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس کھٹی میٹھی چھو کر کی باتوں سے لطف ضرور اٹھاتا مگر وہ اس وقت خود پریشان تھا، اس لیے اس لڑکی کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں اور ویسے بھی اس کے تصور جاناں میں میراں بسکی ہوئی تھی لہذا وہ جواباً خاموش رہا۔

”ویسے تُو ہے بڑا سوہنا..... اپنے نام کی طرح سریلا سارنگ.....! ہائے نام لیتے ہی دل میں یکتا راسا بننے لگتا ہے۔“ امی کی بے باکی نے اس بار سارنگ کو اپنی طرف متوجہ کرنے پر مجبور کر دیا اور پہلی بار سارنگ نے اگلا نوالہ توڑے بغیر سر اٹھا کر اس کے سانولے چہرے کا جائزہ لیا۔

اس کا چہرہ کتابی تھا، ناک ستواں اور آنکھیں کھنچی ہوئی کمان..... اس نے رنگ دار گھاگر اور زرد چولی پہن رکھی تھی، ناک پر چاندی کا ابلق بھی جھول رہا تھا، اسی طرح چاندی کی ایک بڑا سا کنٹھا اس کی صراحی دار گردن پر بھی موجود تھا..... ناگن کی طرح بل کھاتی

جھلملاتے پراندے والی چوٹی اس کی کمر پر ریگتی محسوس ہو رہی تھی۔
 ”ایسے کا ہے دیکھے ہے رے؟“ وہ سارنگ کی آنکھوں کو گھورتے پا کر یکدم شرم
 کر بولی تو سارنگ اپنا سر جھٹک کر کھانے میں مشغول ہو گیا۔

☆=====☆=====☆

ڈاکٹر فوزیہ بڑی کامیابی کے ساتھ سدھوراں کو پہلی کا پٹر کے ذریعے شہر لے آئی تھی۔
 کراچی جیسے گنجان شہر میں سدھوراں کو پہلے تو کافی گھبراہٹ ہوئی مگر پھر جہاں داد
 جیسے بھیڑیے صفت انسان سے نجات کی خوشی میں اس نے سب کچھ بھلا ڈالا تھا، اگر نہیں بھلا
 سکتی تھی تو ڈاکٹر فوزیہ کا احسان عظیم..... ڈاکٹر فوزیہ کی بڑی سی عالیشان کوٹھی میں پہنچ کر بے
 جاری سدھوراں دنگ ہو کر رہ گئی، اس سادہ لوح اور دور افتادہ گوٹھ میں رہنے والی لڑکی نے
 تو کبھی خوابوں میں بھی ایسا شاندار گھر نہ دیکھا تھا۔

ڈاکٹر فوزیہ کے والد کا شہر کے نامی گرامی سرجنز میں شمار ہوتا تھا، وہ ہارٹ سرجن تھے،
 دل کی پیوند کاری کے انہوں نے کئی پیچیدہ آپریشن کئے تھے جو ایک ادھ کے سوا سارے ہی
 کامیاب ہوئے تھے، علاوہ ازیں انہیں بین الاقوامی سیمینار میں بھی بڑی عزت سے مدعو کیا
 جاتا تھا، ان کا نام حیدر شاہ تھا، وہ ایک سنجیدہ مزاج اور اپنے کام سے کام رکھنے والے انسان
 تھے، ڈاکٹر فوزیہ کی والدہ ڈاکٹر خورشید بھی ایک معروف گائکا کا لوجسٹ تھیں اور انتہائی پُر
 وقار شخصیت کی مالک تھیں۔

ڈاکٹر فوزیہ ان کی اکلوتی اولاد تھی اور دونوں میاں، بیوی کی آنکھوں کا تار تھی مگر
 انہیں اپنی اس اکلوتی اور لاڈلی بیٹی سے ہمیشہ ہی شکایت رہی تھی، وہ ڈاکٹر فوزیہ کے جذبہ
 انسانی ہمدردی سے سخت عاجز تھے اور اکثر وہ اس کے جذبہ انسانی ہمدردی کو سر پھر اجذہ کہہ
 کر ٹوکتے رہتے تھے، اس پر ڈاکٹر فوزیہ انہیں یہ کہہ کر لاجواب کر دیا کرتی تھی۔

”کتنے افسوس کی بات ہے پاپا! ہم ڈاکٹر بننے سے پہلے انسانی خدمت کے
 بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں مگر ڈاکٹر بن جا رہے ہیں تو ہماری نگاہ مریض کے مرض پر نہیں،
 اس کی جیب پر ہوتی ہے کہ آیا وہ ہماری بھاری فیس ادا بھی کر پائے گا یا یونہی وقت ضائع
 کرے گا اور وقت کے زیاں کی خاطر چیمبر سٹم اور پرچی سٹم راج کر لیا گیا ہے..... ذرا سا
 مشورہ بھی کرنا ہو تو پہلے پرچی کٹواؤ، چیمبر میں داخلے کا نوکن خریدو۔“

یہ تھے ڈاکٹر فوزیہ کے افکار..... جس کے سامنے اس کے دونوں ماما پاپا بھی جز بزنس ہو

کر رہ جاتے۔ فوزیہ چونکہ ان کی لاڈلی اولاد تھی چنانچہ وہ اسے ناراض کرنے کا خطرہ ہرگز مول
 لینا نہیں چاہتے تھے، یہی وجہ تھی کہ جب ڈاکٹر فوزیہ کے ساتھ انہوں نے سدھوراں جیسی ایک
 دیہاتی لڑکی کو دیکھا تو وہ اسے ملازمہ ہی سمجھے تھے تاہم انہوں نے اپنی مصروفیت کی بناء پر اپنے
 اس اندازے کی بیٹی سے وضاحت طلب کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔

یوں سدھوراں اس کی بہن بن کر رہنے لگی..... سدھوراں کو البتہ کبھی کبھی جہاں داد کی
 طرف سے خوف سا محسوس ہوتا تھا مگر فوزیہ اسے ہمیشہ حوصلے کی تلقین کرتی تھی۔ ایک دن
 موسیٰ نے ڈاکٹر فوزیہ کو تنہائی میں سدھوراں کے سلسلے میں ایک مشورہ دیا۔

”بیٹا!..... سدھوراں تو ماں پینے والی ہے، تم جانتی ہو اس کا کنواری ماں بننا گھر میں
 کتنا فساد کروا سکتا ہے..... بی بی جی اور صاحب کی بڑی عزت ہے، کہیں ایسا نہ ہو.....؟“
 ”میں تمہاری بات کا مطلب اچھی طرح سمجھتی ہوں موسیٰ! اب تم ہی بتاؤ نا کیا کیا
 جائے..... بے چاری سدھوراں کو اس طرح اب بچ مجدھار میں تو نہیں چھوڑا جاسکتا۔“
 ڈاکٹر فوزیہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

درحقیقت وہ خود بھی پریشان ہی ہو گئی تھی۔
 ”بیٹا!..... اس کی شادی کر دو بہت جلدی.....“ موسیٰ نے صائب مشورہ دیا۔
 ”تم ہی کوئی ایسا رشتہ ڈھونڈو جو اسے اس حالت میں قبول کر لے۔“
 ”ظاہر ہے بیٹا!..... اب کوئی جوان لڑکا تو اس سے شادی کرنے سے رہا اور ہمیں
 بددیانتی سے بھی کام نہیں لینا..... میرا خیال ہے کوئی بچوں والا رنڈ واہی ٹھیک رہے گا۔“
 موسیٰ نے کہا۔

”ہاں یہی بہتر رہے گا..... کم از کم سدھوراں اپنے گھر میں عزت کی زندگی تو
 گزارے گی، اس طرح اس کے ہونے والے بچے کو بھی باپ کا نام مل جائے گا لیکن
 سدھوراں مانے تباہ ناں.....“

”وہ کیسے نہیں مانے گی بیٹا!“ موسیٰ بولی۔ ”اسے ماننی ہی پڑے گی ہماری بات،
 اپنے لیے نہیں تو اپنے بچے کے لیے ہی سہی۔“

”ٹھیک ہے..... تم پہلے کوئی رشتہ ڈھونڈو پھر دیکھتے ہیں۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے ہامی
 بھرتے ہوئے کہا پھر یکدم بولی۔ ”مگر موسیٰ! تم ساری بات صاف صاف بتا دینا..... چھپانا
 کچھ نہیں، پہلے ہی انکار ہو جائے اچھا ہے بعد میں مصیبت ہو جاتی ہے۔“

”جی ہاں بیٹا!..... میں تو خود بھی چاہتی ہوں کہ کچھ نہ چھپایا جائے۔“ موسیٰ اس کا

مطلب سمجھتے ہوئے سر ہلا کر بولی۔

سدھوراں یہاں آکر بہت خوش تھی۔ وہ اب موسیٰ کے ساتھ بنگلے کا سارا کام خود کرتی تھی۔ یہ بنگلہ ایک پوش علاقے میں تھا۔ آزادانہ ماحول اور کھانا پینا اور آرام نے سدھوراں کا شہابی رنگ مزید نکھار دیا تھا۔ ڈاکٹر فوزیہ نے اسے اپنے کئی قیمتی سونے دیئے تھے جنہیں پہن کر سدھوراں دیہاتی لڑکی لگتی ہی نہیں تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ سدھوراں کی نشست و برخاست میں بھی قرینہ اور خوش سلیقگی آتی چلی گئی۔ وہ ڈاکٹر فوزیہ کے کمرے میں ہی رہتی تھی۔

ایک روز ڈاکٹر فوزیہ نے اس سے یونہی پوچھا۔ ”سدھوراں! تمہیں سانول یاد آتا ہے؟“

یہ سن کر سدھوراں کے شہابی چہرے پر دور تک اداسی کی گھٹا چھاتی چلی گئی پھر جب بولی تو اس کی آواز دور۔ بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

”بابی! یاد تو آتا ہے، سانول میری پہلی محبت تھا۔ مجھے یقین ہے اگر وہ زندگی کے کسی موڑ پر مجھے مل گیا تو نفرت سے میری طرف سے منہ موڑ لے گا۔“

”ہاں! یہ مردوں کا شیوا ہے، وہ اپنی مجبوری تو چھپاتے ہیں مگر عورت کی مجبوریوں سے سمجھوتہ نہیں کرتے۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے تلخ لہجے میں کہا پھر بولی۔ ”سدھوراں! دیکھو میں تمہاری بہن ہوں ناں۔ اس ناتے مجھے تمہاری اب فکر رہنے لگی ہے۔ تم یہ بتاؤ سانول کو ڈھونڈنے کی تمہارے اندر جستجو ہے یا پھر تم اب صرف اپنے ہونے والے بچے کی خاطر اپنی بقیہ زندگی گزارنا چاہو گی؟“

سدھوراں پھر بولی۔ ”بابی! آپ میری سگی بہنوں سے بھی بڑھ کر ہیں ضرور میرا بھلا ہی سوچیں گی پر جہاں تک سانول کو ڈھونڈنے والی بات ہے، وہ رہنے دیں، اس کا کوئی فائدہ نہیں اور ویسے بھی آپ کی بات ٹھیک ہے کہ مجھے اب اپنے ہونے والے بچے کی خاطر ہی زندگی کا شاپڑے لگی۔ آپ جو فیصلہ کریں، مجھے قبول ہوگا۔“

ڈاکٹر فوزیہ، سدھوراں کا یہی عندیہ لینا چاہتی تھی۔ اس نے خوش ہو کر اسے اپنے گلے لگا لیا۔

☆=====☆=====☆

آگلے روز صبح ملوکاں اور میراں ذرا دیر سے جا گئیں۔

ماما اللہ رکھو باہر جا چکا تھا البتہ سانول گھر پر ہی موجود تھا، وہ بے چارہ خاموشی سے باہر صحن کی چارپائی پر بیٹھا ان دونوں کے جاگنے کا منتظر تھا۔

”تم دونوں منہ ہاتھ دھو کر چائے وغیرہ پی لو پھر میں نے بھی باہر جانا ہے، ماما کے پیچھے۔“

ملوکاں شوخ لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”یہ عورتوں والے کام تو کیوں کر رہا ہے بس تو چلا جا۔ ہم خود چائے بنا کر پی لیں گے۔“

”اچھا! ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں۔“ سانول اس سے نظریں چراتے ہوئے اب رسوئی کی بجائے دروازے کی طرف بڑھنے لگا تو ملوکاں نے پھر اسے پکارا۔ ”ڑے سانول!۔۔۔۔۔!“

”اب کیا ہے۔۔۔۔۔؟“ وہ رکا مگر پلٹے بغیر پوچھا۔

”ٹوکب تک آجائے گا۔۔۔۔۔؟“ ملوکاں نے دھیرے سے بڑے گہرے لہجے میں اس سے پوچھا۔

”تم دونوں کے ماں، پیکو کو ہی تلاش کرنے جا رہا ہوں۔۔۔۔۔۔ پتہ نہیں کتنی دیر لگے، اب ماما کے ساتھ ہی لوٹوں گا، دیر ہو جائے تو رسوئی میں آنا، چاول اور پلی رکھی ہوئی ہے، بنا کر کھا لینا۔“ سانول نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

ملوکاں نے دروازے کو اوندھ سے کٹھمی چڑھائی، اس کے لیوں پر دھیمی مسکان چسپاں تھی۔

”ٹو بڑا اس کے گلے پڑ رہی ہے۔۔۔۔۔۔ آخر چاہتی کیا ہے تو اس سے۔۔۔۔۔؟“ میراں نے معنی خیز انداز میں چٹکی لیتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

”چاہتی تو بہت کچھ ہوں پر وہ ظالم رخ ہی نہیں دے رہا۔“ ملوکاں نے ایک لمبی سانس کھینچ کر گہرے لہجے میں جواب دیا۔

میراں مسکرا کر بولی۔ ”اڑی چری!۔۔۔۔۔۔ رخ کیسے دے گا، اس بے چارے کا دل تو اس چھو کر می سدھوراں میں اٹکا ہوا ہے۔“

میراں کی بات سن کر ملوکاں منہ بنا کر بولی۔ ”نہیں، سدھوراں نے سانول کے ساتھ بے وفائی کی تھی، اب وہ اس سے نفرت کرتا ہے، اس کی شکل بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔“

میراں خاموش ہو گئی۔ جانے کیا بات تھی سانول۔ کدھر پر میراں کو اپنا دکھ نہ آنے لگتا تھا، اس کی اچانک سوگوار سی خاموشی پر ملوکاں نے بھی گویا بدلہ چکاتے ہوئے چٹکی لی اور

معنی خیر انداز میں اسے اپنی کہنی کا ٹھوکا مارتے ہوئے بولی۔ ”کیوں ٹی منجھی.....! تیرے کو میرا ادا سارنگ تو یاد نہیں آ رہا؟“

میراں کا چہرہ مزید بجھ گیا، دونوں ایک دوسرے کی پچازاد کے علاوہ گہری اور رازدار سہیلیاں بھی تھیں، وہ اب ایک دوسرے کے حالی دل سے بخوبی واقف تھیں تاہم میراں بات بناتے ہوئے بولی۔ ”ملوکاں.....! دعا کرو ہمارے ماں، پیوئل جائیں..... پتہ نہیں وہ کتنا پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

”کاش..... ادا خالقو، بھاجائی اللہ وسائی کو نہ چھوڑتا تو ادا سارنگ بھی تم سے جدا نہ ہوتا..... تم تو جانتی ہوگی میراں، ادا بڑے بھائی کے برعکس کتنا درد مند اور رحمدل انسان ہے۔“

”اس نے جو کیا بالکل ٹھیک کیا..... بے چاری اللہ وسائی کے ساتھ یہ ظلم کم تو نہ تھا کہ ایک طرف قافلے والوں نے اسے الگ کر دیا، دوسرے خالقو نے بھی اسے چھوڑ دیا، یہ انسانیت تو نہیں ہوئی ناں.....! ایک گود کے بچے والی عورت کو جلتے سلگتے صحرا میں بھوکا پیاسا تنہا چھوڑ دیا جائے، میں سارنگ کے اس فیصلے پر خوش ہوئی تھی مگر اب نجانے وہ لوگ بے چارے کس حال میں ہوں گے۔“

”اللہ بہتر کرے گا میراں.....! سارنگ ایک گرو جوان ہے، ایک نہ ایک دن وہ ہم سے ضرور آن ملے گا۔“ ملوکاں نے رنجور میراں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”چل آرسوئی میں چل کر چائے پیتے ہیں۔“

ماما اللہ رکھیو اور سانول بعد دو پہر لوٹے اور خاصے خوش خوش نظر آ رہے تھے۔

”ماما.....! کیا ہوا.....؟ ہمارے ماں، پیو کا کچھ پتہ چلا.....؟“ میراں نے بے قراری سے پوچھا۔

سانول ملائمت سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ دھر کر بولا۔ ”ہاؤادی.....! تمہارے ماں، پیوئل گئے ہیں۔“

”کک..... کہاں ہیں وہ..... ہمیں اسی وقت لے چلو ان کے پاس..... پتہ نہیں ہمارے بغیر ان بے چاروں کا کیا حال ہو رہا ہوگا۔“ اس بار ملوکاں نے غم اور خوشی کے ملے جلے قرار انداز سے کہا۔

ماما اللہ رکھیو نے اس کے سر پر ہاتھ دھرتے ہوئے شفقت سے کہا۔ ”دھیو.....! تم کیوں فکر کرتی ہو اب..... وہ سب کھیریت سے ہیں بس ابھی ہم سب روٹی کھا کر چلے

ہیں۔“

”ماما سائیں.....! ہماری تو بھوک ہی اڑ گئی ہے، ہم سے روٹی نہیں کھائی جائے گی۔“ میراں نے مجبور لہجے میں کہا۔

ملوکاں اسے ٹوکے ہوئے بولی۔ ”اڑی چری.....! ان دونوں بے چاروں کو تو بھوک لگی ہوگی ناں.....! صبح سے باہر نکلے ہوئے تھے۔“

”دھی میراں.....! میں نے کہا ناں اب ٹو بالکل بے فکر ہو جا..... چل روٹی کھالے تو چلیں۔“

ان لوگوں نے جیسے تیسے کھانا کھایا پھر سانول ایک چھکڑا لے آیا، یہ سب اس میں سوار ہو کر پہلے کسی موجو نامی ہاری کے گھر اترے، اس نے ہی انہیں بتایا تھا کہ مٹھل اور سکھیو نامی دو بھائیوں کا خاندان تھر سے آنے والے لٹے پٹے قافلے میں شامل تھے جواب قریب کے ایک گوٹھ میں رہا کی کرتے ہیں۔

بہر طور اسے بھی چھکڑے پر سوار کیا گیا، میراں اور ملوکاں کی سارے راستے عجیب حالت ہوتی رہی..... ماں، باپ کے ملنے کی خوشی ان سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی، وہ یہی دعائیں مانگے جارہی تھی کہ خدا کرے موجو ہاری کی بات درست ثابت ہو۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ لوگ پندرہ بیس جھونپڑیوں پر مشتمل ایک چھوٹے سے بستی نما گوٹھ میں پہنچ گئے، میراں اور ملوکاں بے تابانہ انداز میں چھکڑے سے اتر کر متلاشی نگاہیں دوڑانے لگیں، لوگ حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے، ان کی حیرت کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ ایک ہی دھرتی تھر کے باشندے تھے چنانچہ ان سے پوچھ گچھ کرنے پر ایک شخص ان سب کو لے کر دو برابر برابر بنی جھونپڑیوں کے قریب لے گیا..... فرط جذبات سے میراں اور ملوکاں کی آنکھیں نمناک ہو گئی تھیں، جھونپڑی پر جھولنے ٹاٹ کے قریب آ کر اس شخص نے بیک وقت سکھیو اور مٹھل کو پکارا۔

دونوں بھائی شاید اس وقت ایک ہی جھونپڑی میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، آواز سن کر دونوں ہی ایک ساتھ باہر نکلے تو میراں اور ملوکاں ایک چیخ مار کر ان دونوں سے لپٹ گئیں۔

سکھیو اور مٹھل کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، انہوں نے اپنی اپنی لخت جگر کو گلے سے لگالیا اور وہ بے چارے دونوں بوڑھے، بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے، اس اثناء میں ان کی بیویاں بھی نکل آئیں، ان کے ضعیف چہروں پر اولاد کا غم کھنڈ کر رہ گیا

تھا، بیٹیوں کو پا کر ان دونوں ماؤں کے پڑ مردہ چہرے بھی کھل اٹھے۔
قصہ کوتاہ یہ رقت آمیز طوفان تھننے کے بعد مٹھل اور سکھیو کو سانول اور ماما اللہ رکھیو نے ساری تفصیل مختصراً بتانے کے بعد اجازت چاہی تو مٹھل اور سکھیو احسان مندی کے بوجھ سے مغلوب ہو کر اپنی ٹوپیاں اتار کر ان کے قدموں پر رکھنے لگے۔

سانول اور ماما رکھیو نے فوراً انہیں ایسا کرنے سے منع کرتے ہوئے ان دونوں کو اپنے گلے سے لگا لیا اور بعد میں ماما اللہ رکھیو ان سے بولا۔ ”اڑے بابا.....! ہم بھی بچپن والے ہیں..... یہ بھی ہماری دھیوں کے برابر ہیں..... اللہ سائیں ان کا پردہ رکھے، اب ہم کو اجازت دو۔“

”اڑے نا..... بھار رکھیو! مانی نکر تو کھاؤ نا، ایسے کیسے.....؟“ سکتے ہوئے کہا۔
”نہیں مانی تو تم کو میرے گھر کھانی پڑے گی..... کل صبح صادق میں تم سب کو لینے آؤں گا، مل بیٹھ کر روٹی بھی کھائیں گے اور کانجھ باندھ کر کچہرا بھی کریں گے، بڑی خالص بھنگ بھی منگواؤں گا۔“

مٹھل اور سکھیو، ماما اللہ رکھیو کے دوستانہ اور بے تکلفانہ لہجے سے بہت متاثر ہوئے پھر انہیں نے باری باری ایک بار پھر سانول اور ماما اللہ رکھیو کو بڑی محبت سے گلے لگایا اور جب وہ دونوں جانے لگے تو سانول کو جاتا دیکھ کر ملوکاں کے دل میں اچانک ایک مجھوری ہوک اٹھی..... وہ اسے پکارنا چاہتی تھی مگر نہ پکار سکی..... سانول بھی اس کی طرف آخری نظر ڈالے بغیر لوٹ گیا..... ملوکاں کو اس کی بے مروتی بری نہیں لگتی تھی، اس نے حسین اور خواب آگیز انتظار میں اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

”نن..... نہیں.....! کچھ نہیں.....“ یہ کہہ کر املی جلدی جلدی اس کے آگے سے برتن سینے لگی..... وہ گھبرا سی گئی تھی۔ سارنگ نے ایک داؤ کھلیا، اس نے املی کا ہاتھ پکڑ لیا، سارنگ کی مضبوط گرفت اپنی ناک کلائی پر محسوس کر کے اسے یوں لگا جیسے اس بائکے خیلے نے اس کے دل پر ہاتھ رکھ دیا ہو، اس نے کلائی چھڑانے کی بھی کوشش نہ کی اور سارنگ کا چہرہ تکتے لگی۔

”تو مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہی.....؟“ سارنگ نے دانستہ مسکرا کر کہا تو املی کو اپنے دل کی دھڑکنیں بے طرح انداز میں دھڑکتی محسوس ہونے لگیں۔

”اچھا برتن رکھ کر آتی ہوں پھر بتاتی ہوں۔“ اس نے دھیرے سے کہا اور سارنگ نے اس کی کلائی چھوڑ دی، وہ چلی گئی تو سارنگ سوچنے لگا کہ یہ لڑکی اس کے کام آسکتی ہے اور گاتریا کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتی ہے، اسے مصنوعی محبت سے رام کیا جاسکتا تھا لہذا جب املی دوبارہ آئی تو سارنگ چار پائی سے اٹھا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے دھیرے سے اس کے شانوں کو تھاما اور محبت پاش لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”املی.....! کیا تو مجھ سے کچھ چھپائے گی..... میرا دل تو اب تیرے نام پر دھڑکنے لگا ہے۔“

سارنگ کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ املی اس کے لہجے میں حلاوت پر پکھل گئی اور بے اختیار اس کے قریب آ گئی..... سارنگ کو کوفت تو ہوئی مگر اس نے مطلب برآری کی خاطر یہ

☆=====☆
سارنگ کھانا کھا چکا تو اس نے دیکھا کہ املی اس کے چہرے کی طرف بغور تنکے جا رہی تھی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہے.....؟“
”آں..... ہاں..... کک..... کچھ نہیں۔“ وہ خیالات سے چونکی پھر بولی۔ ”رے سارنگ.....! کیا تو اپنی بھابی اللہ وسائی سے اتنی محبت کرتا ہے کہ تو اس کی خاطر اپنے ماں، باپو سے بھی جدا ہو گیا اور اب اتنا کشت بھوگ کر یہاں تک آن پہنچا.....؟“

”ہاں.....!“ سارنگ نے کہا۔ ”بھابی اللہ وسائی نے مجھے سگی بہنوں جیسا پیار دیا

کڑوا گھونٹ پی لیا۔

”املی!..... مجھے تجھ پر پورا بھروسہ ہے، میں تیرے سے اب کچھ نہیں پوچھوں گا؛ یقیناً میرا برا نہیں سوچے گی۔“ اس بات پر املی تڑپ اٹھی اور لرزتی آواز میں بولی۔

”نہیں رے سارنگ!..... بھلا میں تیرا کیوں برا سوچوں گی تو مجھ سے نہیں بچ پوچھے تو تب بھی میں تجھے ساری بات بتا دوں گی..... سن! گاتریا میرے باپ کا دوست ہے وہ سرحد پار سے جوان عورتوں اور بچوں کو ورغلا کر اپنے ساتھ راجستھان لے جاتا ہے وہاں انہیں بردہ فروشوں کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے جو بعد راجوں، مہاراجوں کے محل میں یا ہندو سیٹھوں کے ہاں غلام بنائے جاتے ہیں..... گاتریا ادھر آیا تھا، اس کے ہمراہ ایک عورت، اس کا بچہ اور ایک نو دس سالہ لڑکا بھی تھا، وہ بے چارے رورہے تھے مگر گاتریا نے انہیں نجائے کسی نشہ آور دوا پلا رکھی تھی کہ وہ بالکل نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے، میرا باپ بھی گاتریا کی مدد کرتا ہے اور اسے سرحد پار کرانے میں مدد دیتا ہے بلکہ میرا باپ خود بھی یہی ذلیل دھندا کرتا ہے، اس نے اس گوٹھ کے بھی کئی بچوں اور جوان عورتوں کو جو اپنی غربت سے تنگ آئی ہوئی ہوتی ہیں، انہیں گاتریا کے حوالے کر دیا ہے اور گاتریا میرے باپ کو بہت سا روپیہ دیتا ہے، ادھر آ میرے ساتھ.....!“ املی نے صراحت سے کہا اور اسے اپنے ساتھ جھوپڑی کے اندرونی گوشے میں لے آئی، یہاں ایک کونے میں لوہے کا زنگ آلود صندوق رکھا ہوا تھا، اسے املی نے کھولا تو سارنگ کی آنکھیں پھٹ گئیں، وہ نوٹوں سے بھرا تھا، سارنگ ساری حقیقت جان کر غم و غصے سے بے حال ہو گیا اور اسے اب گاتریا کے ساتھ املی کے باپ پر بھی طیش آنے لگا جو اس گھناؤ نے اور مکروہ دھندے میں اس دغا باز گاتریا کے ساتھ ملا ہوا تھا۔

اس کے بعد املی نے اسے یہ بھی بتایا کہ گاتریا نے اس کے باپ کو یہ بھی ہدایت کر رکھی تھی کہ ہو سکتا ہے، میرا تعاقب کرتا ہوا ایک نوجوان یہاں تک آن پہنچے تو اسے زہر دے کر ہلاک کر دینا۔

سارنگ اس کی بات سن کر بری طرح ٹھنکا اور بغور املی کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔

”بھچھ..... پھر.....؟“ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

”پھر کیا.....! جب تو یہاں آیا اور میرے باپ نے مجھے تجھے روٹی دینے کو کہا تو ساتھ ہی مجھے زہر کی ایک، پزیا بھی تیرے کھانے میں ملانے کو دی تھی تاکہ تو روٹی کھاتے ہی مر جائے مگر میں نے وہ چھپالی۔“ املی نے کہا اور پھر اپنے دوپٹے کی گرہ کھول کر زہر کی پزیا

اسے دکھائی۔

سارنگ کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا معاملی کا باپ اندر داخل ہوا، وہ اب تک بھی سمجھ ہوئے تھا کہ اس کی بیٹی نے اپنا کام نمٹا دیا ہوگا مگر جب اس نے سارنگ کو اپنے سامنے جیتا جاگتا ہوا دیکھا تو بری طرح ٹھنکا، اس نے قہر آلود نظروں سے اپنی بیٹی املی کو دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کم بخت ٹوٹنے ابھی تک اپنا کام نہیں کیا۔

سارنگ غصے میں بھرا بیٹھا تھا لہذا اس بوڑھے کو دیکھتے ہی وہ زخمی شیر کی طرح اس پر چھینا۔

بوڑھا بوکھلا گیا۔ سارنگ نے اس کا گلا دبوچ لیا۔ ”بول خنزیر انسان!..... تیرا ساتھی گاتریا کہاں ہے..... بتا ورنہ ابھی تیرا گلا دبا دوں گا۔“ سارنگ نے غیظ آلود لہجے میں کہا، اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے، بوڑھے کے حلق سے خرخراتی ہوئی آواز برآمد ہونے لگی، سارنگ نے اسے بولنے کا موقع دینے کی غرض سے ذرا گرفت ڈھیلی کی تو بوڑھا پھنسی پھنسی آواز میں بمشکل بولا۔ ”مجھے..... نہیں..... مالوم!.....“

”جھوٹ بکتا ہے تو..... وہ تیرا ساتھی تھا، بتا ورنہ ابھی تیرا مینٹوا دباتا ہوں۔“ سارنگ غصیلے لہجے میں غرایا اور ایک بار پھر اپنی گرفت اس کی گردن پر سخت کر دی۔ سارنگ نے ویسے بھی اسے ختم کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ یہ انسانوں کی اسمگلنگ جیسے مذموم کاروبار میں گاتریا کا ساتھی اور دست راست تھا۔ بوڑھے کی حالت پھر غیر ہونے لگی، وہ گھٹی گھٹی آواز کے ساتھ کچھ بولنے کی سعی کرنے لگا تو سارنگ نے اسے کھینچ کر چارپائی پر دے مارا، وہ بلبلا گیا۔

”بول کمینے..... کم ذات!..... تو یہ بردہ فروشی کا دھندہ کب سے کر رہا ہے..... دیکھ مجھ پر اس وقت خون سوار ہے..... مجھے گاتریا کا پتہ بتاتا ہے یا نہیں..... اس بار میں تیری گردن نہیں چھوڑوں گا۔“ سارنگ قہر بار نظروں سے اسے گھور کر بولا۔

مگر بوڑھا بھی بڑا مکار اور ہٹ کا پکا تھا..... باوجود اس کے وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔

”میں..... صحیح کہہ رہا ہوں..... تم کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ بوڑھے کے جھوٹ نے سارنگ کو مزید چراغ پا کر دیا..... ویسے اگر اسے املی نے اپنے ”باپ“ کے بارے میں سب کچھ سچ سچ نہیں بتا دیا ہوتا تو شاید سارنگ اسے شک کا فائدہ دیتے ہوئے چھوڑ دیتا۔ بہر طور سارنگ نے بھی جھوٹے کو گھر تک پہنچانے کا عزم کر رکھا تھا..... اس نے قریب کھڑی املی کو بازو سے پکڑ کر بوڑھے کے سامنے لا کھڑا کیا اور اسے غراتے ہوئے بولا۔ ”اس نے

”بب..... بب..... بتاتا ہوں۔“ وہ ہانپتے ہوئے بولا تو سارنگ نے دوبارہ غصیلے

لہجے میں تہدید کی۔

”مجھے اگر ذرا بھی شبہ ہوا کہ تو جھوٹ بول رہا ہے تو تیری ایک نہیں سنوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ پاس کھڑی املی سے بولا۔ ”تو زمین کھودنے کے لئے کدال لے آ۔“ اس کے کہنے کی دیر بھی کہ املی ایک کدال اٹھا لائی۔

تب بوڑھے نے فر فر بتانا شروع کر دیا۔ ”وہ مشرق کی سمت جدھر جوار کے کھیت اور کھجور کے جھنڈ ہیں..... اس راستے سے سرحد پار گیا ہے، وہاں جیوش بابا نامی ایک جیوتشی ہے، اس کے پاس ٹھہرتا ہے، اسے سب معلوم ہے کہ گاتریا وہاں سے کدھر کا رخ کرتا ہے۔“ سارنگ نے چند ثانیے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا، اسے بوڑھے کی بات پر یقین سا ہونے لگا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا مگر اسی لمحے املی نے سارنگ سے کہا۔ ”سارو.....! مجھے جیوش بابا تک پہنچنے کا راستہ آتا ہے..... گاتریا نے ہی مجھے ایک روز دارو کے نشے کی پنک میں بتایا تھا تو بے فکر ہو جا، اس خبیث کو جان سے مار ڈال.....“

”نہیں..... اس کی ضرورت نہیں ہے..... میں بلاوجہ اپنے ہاتھ اس کے گندے خون سے نہیں رنگنا چاہتا تو ادھر ٹھہر، میں بستی کے کسی کھیا سے مل کر اسے اس خبیث کے کرتوتوں سے آگاہ کر کے آتا ہوں پھر وہی اس کا فیصلہ کریں گے۔“ سارنگ نے کہا پھر تیزی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ اسے لرزہ خیز چیخ سنائی دی، سارنگ ٹھٹک کر رکا اور پھر واپس مڑا، اندر پہنچا تو ایک لرزہ خیز منظر اس کا منتظر تھا۔

☆=====☆=====☆

ڈاکٹر فوزیہ، سدھوراں کا عندیہ پانے کے بعد مطمئن ہو گئی تھی..... سدھوراں نے بھی حالات اور اپنے ہونے والے بچے کی وجہ سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور اس نے موسیٰ کو بھی سدھوراں کے لیے کوئی موزوں رشتہ تلاش کرنے کی ہدایت دیدی تھی۔ موسیٰ اس گھر کی ایک صحیح معنی میں نمک حلال ملازمہ تھی، وہ اس گھر کا بھلا چاہتی تھی اور بھلائی اسی میں تھی کہ سدھوراں کا جلد سے جلد رشتہ طے ہو جائے لہذا وہ بڑی تندہی کے ساتھ اس کام میں لگ گئی۔

ایک روز ڈاکٹر فوزیہ ڈیوٹی سے واپسی اپنی آلتو میں لوٹ رہی تھی، اپنی گاڑی وہ خود ٹاؤن رانیو کرتی تھی البتہ اس کے ماما اور پاپا کی الگ الگ بی ایم ڈبلیو گاڑیاں تھیں جن کے

تیری بیٹی نے..... مجھے تیرے شیطانی کرتوتوں کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ گاتریا کی حقیقت بھی کھول دی ہے میرے سامنے..... بول اب کیا کہتا ہے؟“ سارنگ نے بات سن کر پہلے تو وہ بوڑھا بھونچکا رہ گیا پھر دوسرے ہی لمحے نفرت انگیز نظروں سے اپنی اپنی املی کو گھورنے لگا جیسے اس کی ٹکا ہوئی کر کے رکھ دے گا۔

”ذلیل.....! کمینی.....! ٹوٹنے..... ٹوٹنے.....!“ معا بوڑھا اسے قہر آلود نظروں سے گھورتا ہوا غرایا اور سارنگ کی پروا کئے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ غصے سے پاگل ہو کر اپنی بیٹی پر جھپٹتا، اچانک سارنگ نے اسے بڑھ کر دبوچ لیا اور اسے بری طرح جھنجھوڑ کر اپنا سوال دہرایا۔ اس بار وہ بوڑھا واقعی ڈھنکائی پر اتر آیا تھا۔ سرد سے لہجہ میں بولا۔ ”میں نہیں بتاؤں گا..... تو میرا کیا بگاڑ لے گا..... مجھے قتل کر کے تو بھی اس بستی سے زندہ سلامت نہیں نکل پائے گا۔“

”تو کیا سمجھتا ہے کہ تیری لاش کا میں پورے گوٹھ والوں کے سامنے کر یا کرم کروں؟ اڑے خبیث بدھے.....! تیری تلاش کو میں ادھر گاڑ دوں گا اور خود تیری بیٹی کے ساتھ آگے نکل جاؤں گا، مگر میں تجھے اس بار آخری موقع دے رہا ہوں..... بتا مجھے مردود گاتریا کدھر ہے؟“ سارنگ نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اس بوڑھے میں جانے کس طرح اچانک ہمت جاگئی، اس نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن سارنگ کے ہاتھ سے چھڑائی اور ایک دم باہر کی طرف بھاگا، سارنگ بھی یکدم چونک کر اس کے پیچھے لپکا..... دونوں جھوپڑی سے باہر نکل آئے تھے، بوڑھا زیادہ دیر سارنگ کی گرفت سے بچ نہیں سکتا تھا چنانچہ سارنگ چل بھر میں اس کے سر پر جا پہنچا اور اسے کاندھے پر اٹھا کر دوبارہ اندر لے آیا اور اسے کھری چارپائی پر بٹخ دیا۔ بوڑھے کے حلق سے گالیوں کا طوفان اند پڑا جو اگلے ہی لمحے سارنگ کے گلا دبوچنے پر خراہٹ میں بدل گیا..... اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابل پڑیں۔

”ختم کر دے سارنگ اس بے غیرت کو..... اس مردود نے مجھے بھی گاتریا کے حوالے کرنے کی کوشش کی تھی..... یہ میرا سوتیلا باپ ہے۔“ قریب کھڑی املی نے حیرت انگیز انکشاف کیا۔

”نہیں..... میں اس مردود کو اتنی آسان موت نہیں ماروں گا..... اسے میں زندہ زمین میں دفن کروں گا۔“ سارنگ غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ بوڑھے نے اپنے کپکپاتے ہاتھ جوڑے تو سارنگ نے اس کی گردن چھوڑتے ہوئے غرا کر کہا۔ ”اگر تو اپنی زندگی چاہتا ہے تو جیج بتا..... گاتریا کدھر گیا ہے؟“

شوفر بھی علیحدہ علیحدہ تھے، ڈاکٹر فوزیہ یہاں پیری فری کے ایک چھوٹے سے سرکاری ہسپتال میں میڈیکل آفیسر تھی، جو شہر کی ایک چھوٹی سی مضافاتی بستی چل گھومتی تھی۔

اس نے دانستہ انسانی خدمت اور بالخصوص ان نادار عورتوں کو طبی سہولت بہم پہنچانے کی خاطر اس دور افتادہ سرکاری ڈسپنسری میں اپنی تعیناتی کروائی تھی جدھر ہجرت سے متعلق کیس وہ خود ذیل کرتی تھی، ادھر ہی ڈاکٹر جوادی بھی تھا، وہ ملیہ کینٹ کے علاقے میں رہتا تو اگرچہ ڈاکٹر فوزیہ کے مماء پاپا نے اس کی بھی مخالفت کی تھی مگر ڈاکٹر فوزیہ کی ضد نے انہیں آخر خاموش ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ ڈاکٹر جوادی کو سدھوراں کی فکر لاحق تھی مگر ڈاکٹر فوزیہ نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ اب سدھوراں کی جلد سے جلد شادی کر چاہتی ہے، بہر طور ڈیوٹی سے آف ہوتے ہی ڈاکٹر فوزیہ اپنی آٹھویں یونیورسٹی روز سے واپس گھر لوٹ رہی تھی لہذا جیسے ہی وہ حسن اسکوائر کے سگنل پر رکی تو اچانک اس کی نگاہ ایک سفید رنگ کی لینڈ کروزر پر پڑی، وہ بری طرح چونک پڑی، اس کے چونکنے کی اصل وجہ لینڈ کروزر کی اگلی نشست پر براہمان ایک بھاری بھر کم شخصیت تھی، اس شخص کو دیکھ کر جانے کیوں ڈاکٹر فوزیہ زور سی ہونے لگی، وہ جہاں داد خان تھا۔

سگنل کی بتی سرخ ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر فوزیہ کی آٹھویں کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں گاڑیوں کا جم غفیر سا نظر آ رہا تھا اور وہ سفید رنگ کی لینڈ کروزر اس کی کار کے چند گاڑیوں کو چھوڑ کر عقب میں کھڑی تھی، ڈاکٹر فوزیہ نے جہاں داد کی اس لینڈ کروزر کو اپنی کار کے بیک ویو میں دیکھا تھا، گرمی اور دھوپ کی وجہ سے ڈاکٹر فوزیہ نے آنکھوں پر سیاہ گارڈ چڑھا رکھے تھے۔ ڈاکٹر فوزیہ کو یقین تھا کہ جہاں داد کی ابھی اس پر نظر نہیں پڑی تھی مگر وہ اس تصور سے ہی لرزاں ہوئی جا رہی تھی کہ اگر اس کا موٹر پر جہاں داد سے سامنا ہو گیا تو حالات مخدوش تر صورت حال اختیار کر سکتے تھے، اس کے دل کی رفتار ایک دم تیز تر ہو گئی تھی۔

اسی وقت سبز بتی جل اٹھی، ٹریفک کار کا ہوار یلا آگے رواں ہوا، ڈاکٹر فوزیہ نے دانستہ کار کی رفتار بڑھا دی اور ساتھ ہی وہ بیک ویو مرر پر بھی نگاہ ڈالتی رہی جہاں داد کی لینڈ کروزر ابھی تک ٹریفک کے اثر دھام میں پھنسی ہوئی تھی، ڈاکٹر فوزیہ اپنے اپنی چھوٹی سی آٹھویں کو گھما کر اوور ٹیک کرتی ہوئی خاصی رفتار کے ساتھ دوڑائے چلی جا رہی تھی اس نے دانستہ جیل چورنگی سے بائیں جانب نیوٹاؤن کی طرف کار موڑ لی، یہ نسبتاً ویران سڑک تھی مگر بہر حال یہاں بھی مٹی بسوں اور لاریوں کی ریل پیل تھی۔

اپنی کار موڑتے ہی اچانک ڈاکٹر فوزیہ نے غیر ارادی طور پر عقبی آئینے میں دیکھا

اسے اپنا خون رگوں میں جمتا ہوا محسوس ہونے لگا، وہ سفید رنگ کی لینڈ کروزر اب اس کے نقاب میں آرہی تھی، ڈاکٹر فوزیہ نے گھبرا کر اپنی آٹھویں کو اپنی بڑھانے کی کوشش کی مگر عقب میں آنے والی جہاں داد کی سفید لینڈ کروزر آندھی طوفان کی طرح تیزی سے دوڑتی ہوئی اس کی کار کے قریب سے گزرتی ہوئی نکلی اور اگلے ہی لمحے اس کے ٹائر زور سے چر چرائے، وہ اب ڈاکٹر فوزیہ کی آٹھویں کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی تھی، اس کی آٹھویں رفتار ویسے ہی ذرا کم تھی، فوزیہ نے فوراً بریک پر اپنے پیر کا دباؤ بڑھا دیا، اس کی کار لینڈ کروزر سے بس ٹکراتے ٹکراتے پیچی، فوزیہ نے ایک طویل سانس لے کر اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کی اور بدستور اسٹیرنگ سنبھالے سیٹ پر جمی رہی اور ہونٹ چباتی رہی، لینڈ کروزر کے دروازے دھماکے سے کھلے، جہاں داد خان غصے سے بھناتا ہوا اپنی لینڈ کروزر سے اترا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا آنا فنا ڈاکٹر فوزیہ کی کار کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور اسے گھورنے لگا، اس کے چار گن بردار حواری بھی ساتھ تھے۔ ”باہر نکلو ڈاکٹر ٹی صاحبہ.....!“ اس نے غصے سے ڈاکٹر فوزیہ سے کہا۔

ڈاکٹر فوزیہ کسی بھی قسم کے خوف اور گھبراہٹ پر اب بتدریج قابو پانے لگی تھی مگر کسی انجانے خطرے کے پیش نظر تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل پر قابو پانے کی یہ سعی لا حاصل ہی رہی، وہ دروازہ کھول کر باہر اتر گئی اور جہاں داد سے خاصے درشت لہجے میں بولی۔ ”یہ کیا بدتمیزی ہے..... میری کار کو اس طرح روکنے کا مطلب.....؟“

جہاں داد کے لبوں اور پر بڑی زہر خند مسکراہٹ ابھری تھی پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر ڈاکٹر فوزیہ کے چہرے سے سیاہ گارڈ اتار لیا اور استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ”گلتا ہے تم نے ہمیں پہچانا نہیں، کدھر ہے سدھوراں.....؟ تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا.....؟“ اس کے لہجے میں اچانک غراہٹ اتر آئی۔

”میں نے تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا ہے۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے متانت آمیز تلخی سے کہا اور پھر مزید بولی۔ ”سنو مسٹر.....! میں اس اندازِ مخاطب کی عادی نہیں ہوں۔“

”مجھے صرف سدھوراں چاہئے جسے تم علاج کے بہانے اپنے ساتھ شہر لے کر آئی تھیں اور پھر نجائے تم دونوں کدھر غائب ہو گئی تھیں۔“ جہاں داد نے حتی المقدور ضبط سے کام لیتے ہوئے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

”وہ بھلی چنگی ہو گئی تھی اور ایک روز ہسپتال سے اچانک غائب ہو گئی..... ہسپتال والوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے کسی رشتے دار کے پاس جانا چاہتی تھی۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے

اپنے متوحش ذہن میں جلدی سے ایک جھوٹ گھڑ کر اسے سنایا۔

”سدھوراں کو تم اپنی ذمہ داری پر لے کر گئی تھیں ڈاکٹر فی صاحبہ.....! اور اس لحاظ سے اور اس پر نظر رکھنا بھی تمہاری ہی ذمہ داری تھی۔“

”مجھے کیا معلوم تھا کہ تم نے اس کو اپنی باندی بنا رکھا تھا اور موقع پاتے ہی وہ فرار ہو جائے گی۔“ ڈاکٹر فوزیہ کی بات سن کر جہاں داد کو ایک جھٹکا لگا اور وہ اپنی آنکھیں سیکڑ کر اس کے چہرے کو گھورنے لگا..... اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں غصہ کا کینہ بھرا ہوا تھا۔

”دیکھو ڈاکٹر فی صاحبہ.....! وہ ہماری کیا تھی، اس سے تم کو کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہئے، تمہیں صرف اس بات سے مطلب رکھنا چاہئے کہ وہ ہماری ملکیت تھی اور سنو ڈاکٹر فی صاحبہ.....!“ اتنا کہہ کر جہاں داد نے اپنی مونچھیں مروڑتے ہوئے اسے سنسناتی نظروں سے گھور کر دانستہ طور پر توقف کرنے کے بعد کہا۔ ”تم ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکتیں۔“

شرافت سے مجھے سدھوراں کے بارے میں بتا دو کہ تم نے اس چھو کڑی کو کون سے دارالامان میں رکھا ہے۔“ ڈاکٹر فوزیہ اس کی زود فہمی پر دنگ رہ گئی۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری، ایک نگاہ جہاں داد کے متمماتے ہوئے چہرے پر ڈالی اور اس کے دائیں بائیں کھڑے اسلحہ بدست حواریوں کی طرف دیکھا، ان سب کے چہروں پر گھنی مونچھیں اور داڑھیاں تھیں اور وہ چاروں بڑے جارحانہ انداز میں کھڑے اس کی طرف خونخوار نظروں سے گھور رہے تھے۔

”دیکھو مسٹر.....! تم اپنے چھوٹے سے گوتھ یا اپنی اوطاق میں نہیں ہو، یہ شہر ہے شہر.....! سمجھے، ہنو میرے راستے سے.....!“ ڈاکٹر فوزیہ کے لہجے میں تلخی اتر آئی تھی، اس نے اسی غصے بھرے انداز میں جہاں داد کے ہاتھ سے اپنے گالز چھپے اور اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور اسے اشارت کر دیا۔

”ڈاکٹر فی صاحبہ.....! اس بھرے پُرے شہر میں بھی ہم بہت آسانی سے اپریں دشمنوں کو خوار کر کے رکھ دیتے ہیں۔“ جہاں داد اپنے قدرے جھک کر اس کی کھڑکی کے قریب سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ڈاکٹر فوزیہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سر دہری دوڑ گئی۔ اس نے کار اشارت کر کے یوٹرن لیا اور واپس مڑ گئی۔ وہ سخت مضطرب تھی، اس کا حلق سوکھ کر کاٹا ہو رہا تھا اور وہ بری طرح اعصابی خوشگئی کا شکار ہو رہی تھی، اسے جہاں داد کی دھمکی آمیز باتوں سے زیادہ اس کا سامنا کرنے پر پریشانی سی ہو رہی تھی، ڈاکٹر فوزیہ نے پریشان کن خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور پوری توجہ ڈرائیونگ پر دیتے ہوئے کار چلانے

گئی۔ اس روٹ پر رش تھا، یہ سبزی منڈی کا روڈ تھا، ٹریفک کے رش کے ساتھ ساتھ جام بھی ہو رہا تھا، اچانک ڈاکٹر فوزیہ نے عقبی آئینے میں دیکھا تو بری طرح ٹھکی، وہی سفید رنگ کی لینڈ کروزر اس کے تعاقب میں آرہی تھی، ڈاکٹر فوزیہ کا دل کپٹیوں میں دھڑکنے لگا، وہ سمجھ گئی تھی کہ جہاں داد اس کی کار کا تعاقب کرتے ہوئے اس کی رہائش گاہ کا پتہ چلانا چاہتا ہے، ڈاکٹر فوزیہ نے اپنے ہونٹ بھینچنے لئے پھر دوسرے ہی لمحے اسے اپنی کپٹیوں میں سنسنات کا احساس ہوا، اس نے لیکٹ اپنی اعصابی شوریدگی پر قابو پایا اور ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا، اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے ہولے سے سر کو اٹھاتی جنبش دی اور اپنی توجہ گاڑی کو ٹریفک کے اثر دھام سے نکالنے پر مرکوز کر دی۔

وہ اب سفید لینڈ کروزر والوں پر یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتی تھی کہ وہ اپنے تعاقب سے باخبر ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر فوزیہ کا ارادہ اپنے گھر جانے کی بجائے اب اپنا تعاقب کرنے والوں کو جمل دینا تھا لہذا وہ بے مقصد ایم اے جناح روڈ پر آ گئی، سفید رنگ کی لینڈ کروزر بدستور اس کے تعاقب میں تھی، ڈاکٹر فوزیہ نے رمپا پلازہ کے قریب اپنی کار روک کر اندر جا کر آ بیٹھیں، سولشن لیں اور گالز وغیرہ کا معائنہ کرنے لگی، وہ لگ بھگ گھنٹے بھر بعد پلازہ سے باہر نکلی اور ادھر ادھر نظریں دوڑائے بغیر اپنی گاڑی میں جا بیٹھی، گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے کن انکھوں سے عقبی آئینے میں دیکھا تو غصے سے دانت پیس لیے، سفید رنگ کی لینڈ کروزر آٹھ دس کاروں کے بعد کھڑی نظر آئی۔

ڈاکٹر فوزیہ نے کار آگے بڑھا دی اور اب خاصی پریشان ہو رہی تھی، گھر پہنچنا بھی ضروری تھا، اس کا اپنا وقت بھی قیمتی تھا مگر وہ اپنے تعاقب میں لگے ہوئے صحرائی لومڑی جہاں داد خان کو کسی بھی صورت اپنی رہائش گاہ کا پتہ نہیں لگنے دینا چاہتی تھی ورنہ وہ اس کے لیے مستقل درد سبب کا باعث بن سکتا تھا اور کوئی خطرناک حرکت بھی کر سکتا تھا، ڈاکٹر فوزیہ کے خیال کے مطابق کراچی جیسے بھرے پُرے شہر میں جہاں داد سے اچانک سامنا محض اتفاق ہی تھا، اب ایک بار اس سے پیچھا چھوٹ جاتا تو دوبارہ ان کا سامنا مشکل تھا۔

یہ محض ڈاکٹر فوزیہ کی خام خیالی تھی یا حد سے بڑھا ہوا اعتماد.....! بہر طور ادھر جب ڈاکٹر فوزیہ نے دیکھا کہ سفید لینڈ کروزر کو وہ جل دینے میں ناکام ہوئی جارتی ہے تو اچانک ایک ڈولہ انگیز خیال آیا، اس نے اپنی کار ایک قریبی تھانے کی طرف موڑ لی اور احاطے میں لے جا کر روک دی، کار سے باہر نکل کر اس نے عقب میں دائیں بائیں دیکھا تو سفید

لینڈ کروزر کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔

☆=====☆=====☆

شام کا جھپٹنا پھیلنا شروع ہو گیا تھا، دونوں بھائی سکھو اور مٹھل کا آج کام میں نہیں لگا تھا، یہی سبب تھا کہ وہ جلد ہی کھیتوں سے لوٹ آئے تھے بلکہ انہوں نے لوٹنے ورتے آچر خان کے چھپر ہوٹل میں تاش کی بازی بھی نہیں لگائی تھی اور سلفی کے دم بھی نہیں لگاتے تھے جس کے آچر خان پانچ روپے لیتا تھا، درحقیقت اس کی وجہ مٹھل کا رنجور ہونا تھا وہ اپنے چھوٹے بیٹے سارنگ کے ابھی تک گھر نہ پہنچنے کے دکھ میں آزرده تھا اور یہ دکھ اسے اب دل بدلنے پڑ پانے لگا تھا، اگرچہ اپنی بیٹی ملوکاں کے خیر خیریت سے گھر لوٹنے پر اسے کچھ سکون ملا تھا، اس کا بھائی سکھو بھی اپنی بیٹی میراں کی کشدگی کی وجہ سے پریشان تھا مگر اب چونکہ ملوکاں کے ساتھ وہ بھی واپس لوٹ چکی تھی اس لیے سکھو کو بھی اطمینان ہوا تھا مگر وہ اپنے بھائی مٹھل کا دکھ بانٹنے کی خاطر اس کے ساتھ جلدی گھر لوٹ آیا تھا، دونوں کی سرکنڈوں کی جھگیاں ساتھ ساتھ ہی بنی ہوئی تھیں، سکھو اپنے بھائی مٹھل کی اداسی کی وجہ سے اس کی جھگی میں ہی بیٹھا ہوا تھا، وہاں پہلے سے ہی اس کی بیوی نہالاں اور بیٹی میراں بھی موجود تھیں شاید وہ بھی اپنی جھٹانی مائی عجیباں اور بھتیجی ملوکاں کے ساتھ دکھ بانٹ رہی تھیں، ان سب نے مل کر بے دلی سے کھانا کھایا پھر جھگی کے ننگے فرش پر رلی بچھا کر بیٹھ گئے، اتنے میں ملوکاں چائے کے پیالے لے آئی، دونوں خاندانوں کے افراد وہیں براجمان تھے البتہ مٹھل کا بڑا بیٹا خالقو حسب معمول باہر اپنے دوستوں کے ساتھ مشغول تھا۔

”بھامٹھل.....! حوصلہ کر، اپڑیں دونوں دھیاں کھیریت سے آئی ہیں، اب اللہ سائیں کرے گا اپڑاں پٹ سارنگ بھی کھیریت سے ایک دن گھر آ پہنچے گا۔“ سکھو بھائی کے کا نہ دھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے تشفی آمیز لہجے میں بولا۔

مٹھل نے آزرده لہجے میں کہا۔ ”بس بھا.....! دعا کر میڈا پٹ جلدی گھر جائے..... میرے دل کا تو سکون ہی کٹ گیا ہے، آخر اسے ضرورت کیا تھی ہم سے جدا ہونے کی.....“

”پیو ادا.....! سارنگ کوئی خوشی سے تھوڑی ہم سے جدا ہوا تھا، وہ تو ادا خالقو نے بھابی اللہ وسائی اور معصوم منٹھار کو صحرا میں اکیلا چھوڑ دیا تھا تو.....!“ ملوکاں جو پہلے ہی اپنے بڑے بھائی خالقو سے نالاں تھی، یکدم بولی۔ مٹھل اس کی بات کاٹ کر جھڑکتے ہوئے بولا۔

”اڑی تو تیری بھابی کو بھی پین بلا کی بیماری لگ گئی تھی، اسے قافلے سے جدا نہ کرتے تو کیا ہم خود بھی سارے بیمار پڑ جاتے..... صرف اسے ہی نہیں بلکہ اور بھی لوگوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا تھا جن کو پین بلا جیسی کھترناک بیماری تھی۔“

”پیو.....! یہ تو ہم نے ان سب ہی پر ظلم کیا تھا ناں.....!“ ملوکاں اپنی فطری سرکشی کی وجہ سے سپر ڈالنے کو تیار نہ تھی۔ ”ہمیں چاہئے تھا ایسے بیمار لوگوں کا ایک علیحدہ ٹولہ بناتے مگر انہیں خود سے تو جدا نہ کرتے۔“

”مجھے تو اب یہ خوف آنے لگا ہے کہ میرا پٹ سارنگ، اللہ وسائی کے ساتھ رہ کر اپنے آپ کو کہیں کھترناک بیماری نہ لگا بیٹھے۔“ اچانک مائی عجیباں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو ملوکاں جیسے اب ماں کے پیچھے پڑ گئی اور قدرے تلخ لہجے میں بولی۔

”واہ امز.....! تجھے اپڑیں بیٹے کی تو فکر ہے مگر اس عورت اور معصوم بچے کی فکر نہیں ہے، جن معصوموں کو جلتے سلگتے ہوئے صحرا میں بے سہارا کر دیا گیا تھا..... آخر کو وہ بھی کسی کی اولاد تھی، بھابی اللہ وسائی کے ماں، پیو اگر زندہ ہوتے تو کیا وہ خود سے اسے علیحدہ کرتے..... ادا سارنگ نے بالکل ٹھیک کیا جو بھابی کا سہارا بنا اور مجھے پورا یقین ہے وہ ایک دن ضرور بھابی کو لے کر لوٹے گا۔“

”اڑی ٹو چپ کر.....!“ مٹھل نے اسے ڈپٹا۔ ”اللہ وسائی کو اگر سارنگ ادھر لے بھی آیا تو ہم اسے اپڑیں پاس بالکل نہیں رکھیں گے اور ویسے بھی خالقو اسے چھوڑ چکا ہے۔“

”اتنا بے حس نہ بن پیو.....!“

”اڑی ٹو ماٹھ کر دھی ملوکاں.....!“ اچانک سکھو نے مداخلت کرتے ہوئے اپنی بھتیجی ملوکاں کو جھڑکا اور پھر اپنے بھائی مٹھل سے بولا۔ ”بھامٹھل.....! حوصلہ کر اللہ وسائی ابھی گئی تو اس کا علاج کروائیں گے، دوسرے کے دکھ کو اپڑاں دکھ سمجھے گا تو تیرا بھی بیڑہ پار ہوگا اور سارنگ بھی کھیریت سے گھر پہنچ جائے گا۔“

ماحول میں سوگوار سی خاموشی چھا گئی پھر اس کے بعد سکھو اور نہالاں اپنی جھگی میں چلے گئے البتہ ان کی بیٹی میراں وہیں ملوکاں کے ساتھ موجود رہی، مائی عجیباں اپنے کام میں لگ گئی اور مٹھل وہیں رلی پر ہی دراز ہو گیا۔

”کیوں ٹی میراں.....! تیرے کو ادا سارنگ بڑا یاد آتا ہوگا؟“ ملوکاں نے میراں کو چھیڑا۔ یہ حقیقت تھی کہ میراں کی گلنار آنکھیں جانے کب سے اپنے محبوب سارنگ کی راہ دیکھ رہی تھیں۔

ملوکاں کے ٹھوکا دینے پر وہ مجبور سے لہجے میں بولی۔ ”ملوکاں.....! مجھے تیرے ادا کی ہی نہیں بلکہ اللہ وسائی اور اس کے معصوم بچے منڈھار کی بھی فکر ہے..... پتہ نہیں وہ لوگ کس حال میں ہوں گے۔“

”اللہ سائیں.....! تو ادا سارنگ، بھابی اللہ وسائی اور اس کے معصوم بچے کو اپنی حفظ و امان میں رکھ اور خیر خیریت سے انہیں واپس گھر پہنچا۔“

”آمین..... اللہ سائیں کرے ایسا ہی ہو۔“ میراں نے زیر لب کہا۔

اسی لمحے ملوکاں کا بڑا بھائی خالقو جھگی میں داخل ہوا تو دونوں جلدی سے سر پر چادریں درست کرنے لگیں..... خالقو نے میلی چپکٹ اسٹ پہن رکھی تھی، نیچے بھی اسی طرح کا تہبند باندھ رکھا تھا، بال کھجڑی اور میلے کچیلے چہرے پر چھدری چھدری دائرہ، آنکھوں میں سرخ سرخ تیرتے ہوئے ڈورے اسے ”گڑنگ“ (کڑک) موالی (نشئی) کی طرح بنا رہے تھے۔

وہ اللہ وسائی اور معصوم بچے کو خود سے دور کرنے کے بعد اور بھی لا پرواہ اور نکھٹو ہو گیا تھا، بوڑھے ماں باپ کی کمائی پر سارا دن جھگی میں ہی اینڈ تارہتا تھا۔

اندراخل ہوتے ہی اس نے تیز نظروں سے ملوکاں اور میراں کی طرف دیکھا پھر قریب پچھی جھنگا سی چار پائی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا جیسے بڑی محنت مزدوری کر کے آیا ہو۔

”اڑی ملوکاں.....! مانی دے میکوں۔“ (روٹی دے مجھے) وہ اپنی بہن سے جھٹکے دار لہجے میں بولا۔ ملوکاں کی آنکھوں میں تنگی اتر آئی، اتنے میں میراں رخصت ہوتے ہوئے اس سے بولی۔

”چنگوادی.....! میں اب چلتی ہوں۔“

اس کے جانے کے بعد ملوکاں کا منہ بناتی ہوئی رسوئی میں آگئی، اسے بھائی کا اس طرح حکم چلانا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا مگر وہ چپ رہتی تھی۔

بھائی کو روٹی دینے کے بعد ملوکاں جھگی کے شکستہ صحن میں آگئی، یہاں ایک چھوٹے سے چھپر نما برآمدے کے بدنما بانس سے چھوٹی لائین روشن کی پھر اندر رسوئی میں بیٹھ کر برتن دھونے لگی، اندراکھوتی کوٹھری نما گوشے میں مٹھل اور مائی عجیباں سے تمباکو کی گڑ گڑی پی رہے تھے۔

روٹی کھا چکنے کے بعد چار پائی پر بیٹھے خالقو نے بے ہنگم ڈکاری اور ملوکاں کو آواز

دی۔ ملوکاں بے دلی سے انھی اور چار پائی کے قریب آکر خالی برتن سمیٹنے لگی۔

”بیو کو بھیج ذرا میرا پاس.....!“ خالقو نے اپنی دونوں ہتھیلیاں آپس میں رگڑ کر پونچھنے کے انداز میں اپنے سر کے بالوں پر پھیرتے ہوئے اس سے کہا اور ملوکاں کوئی جواب دینے بغیر برتن اٹھا کر رسوئی میں چلی گئی پھر وہاں سے کوٹھری میں آئی اور سامنے شکستہ فرش پر بیٹھے باپ سے بولی۔ ”بیو.....! خالقو تجھے بلارہا ہے۔“

”کیوں بلارہا ہے..... کیا کوئی کام ڈھونڈ لیا ہے اس ہڈ حرام نے.....؟“ اس کا باپ مٹھل کھانتے ہوئے بولا۔

”مجھے پتہ نہیں کیوں بلارہا ہے۔“ یہ کہہ کر ملوکاں باہر نکل گئی۔

جب کافی دیر گزر گئی اور مٹھل نہ آیا تو خالقو نے باپ کو پکارا۔ ”بیو.....! ذرا ادھر آتیرے سے بات کرنی ہے ایک ضروری.....“

”آتا ہوں..... آتا ہوں ماٹھ کر ذرا.....!“ مٹھل ناگواری سے بولا اور پھر تلخی سے بڑبڑایا۔ ”میرا بیو بننے کی کوشش کرتا ہے، بڑا آیا ہے بلانے والا ہنہ.....!“

”جا..... جا کر اس کی بات سن لے، آخر تیرا وڈا پٹ ہے۔“ پاس ہی بیٹھی اس کی بیوی کی عجیباں نے شوہر سے کہا۔

مٹھل اسے ڈپٹ کر بولا۔ ”ٹوچ کر کے بیٹھ..... بڑا آیا وڈا پٹ..... کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا.....!“ پھر وہ دو چار مرتبہ گشت لینے کے بعد اٹھا اور صحن میں آگیا۔

”کیا بات ہے کیا کوئی کام ڈھونڈ لیا ہے یا پھر میرے ساتھ صبح تڑکے کام پر جانے کا ارادہ ہے؟“ باپ نے طنز یہ لہجے میں اس سے پوچھا۔

”کام بھی مل جائے گا، آخر کو جوان ہوں، کوئی نہ کوئی مزدوری تو مل ہی جائے گی۔“ خالقو بڑی ڈھٹائی سے بولا۔

”مجھ بڈھے کو تو کام فوراً مل گیا، تیرے جیسے جوان کو کیوں نہیں مل رہا.....؟“ مٹھل بدستوری سے بولا اور خالقو کے قریب ہی چار پائی پر بیٹھ گیا۔

”پہلے میری ایک بات سن لے، یہ بھی کام ہی کی بات ہے۔“ خالقو نے قدرے چالوسی سے کہا۔

اس کا باپ بیزار سی سے اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”ہاں..... ہاں بول سن رہا ہوں میں.....!“

”بیو.....! وہ ہے ناں اپڑاں آچر خان ہوٹل والا، وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔“

سارا دن کام کر کے۔“

مٹھل کا غصہ ابھی تک آسمان کو چھو رہا تھا، باپ بیٹے کی گرما گرمی پر اندر سے مائی عجیباں حیران پریشان سی صحن میں آگئی، ملوکاں بھی رسوئی سے نکل آئی اور ناگواری سے اپنے لاپچی اور خود غرض بھائی کی طرف دیکھنے لگی۔ ”سن لے عجیباں.....! کیا کہہ رہا ہے تیرا پٹ خالقو..... روپے کے لالچ میں کہتا ہے اپڑیں معصوم ملوکاں کا بیاہ اس بڈھے آچر خان سے کر دے..... سمجھا اس کو میرا پو بننے کی کوشش نہ کرے۔“ یہ کہہ مٹھل غصے سے پاؤں پختا ہوا دوبارہ کوٹھری کی طرف چلا گیا۔

☆=====☆=====☆

سامنے چار پائی پر وہ بوڑھا خون میں لت پٹ پڑا تھا اور چار پائی کے قریب املی ہاتھوں میں خون آلود کدال اٹھائے وحشا نہ نظروں سے اپنے باپ کی لاش کو گھور رہی تھی۔ یہ لرزہ خیز منظر دیکھ کر سارنگ جیسے بت بن گیا پھر دوسرے لمحے وہ آگے بڑھا۔

”یہ تُو نے کیا کر دیا املی.....!“

”میں نے وہی کیا جو مجھے اسی وقت کر دینا چاہئے تھا جب یہ خبیث انسان مجھے مردود گاتریا کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔“ املی نے خون آلود کدال کو پرے پھینکتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت بھرے شعلے پھوٹ رہے تھے پھر وہ اپنی پھولی پھولی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بتانے لگی۔

”تیرے باہر نکلتے ہی یہ خبیث مجھ پر چڑھ دوڑا تھا اور دھمکی دینے لگا کہ اس بار گاتریا آیا تو تجھے اس کے حوالے کر کے ہی چھوڑوں گا ہنہ.....! گاتریا تو نہ آیا اس کی موت آگئی۔“ املی کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔

سارنگ اپنی جگہ گم صم سا کھڑا اس عجیب لڑکی کو دیکھنے لگا پھر وہ املی سے بولا۔

”اتنی بہادر تو تو نظر نہیں آتی تھی تُو..... چلو اچھا کیا اس شیطان کے خون سے تُو نے ہی اپنے ہاتھ رنگ ڈالے..... جب وہ مردود گاتریا ادھر آیا تھا تو کاش اسے بھی اسی طرح ختم کر ڈالتی۔“

”سارنگ.....! یہ بہادری تو میں نے تیری وجہ سے کی ہے، اب میں تیرے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“ املی نے غمور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو بے چارہ سارنگ یکدم گھبرا گیا۔ وہ یہ سوچ کر پریشان ہونے لگا کہ یہ پاگل چھو کر ی خواہ مخواہ اس کے گلے کا

خالقو نے بتایا تو مٹھل ذرا سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ آچر خان کس بلا کا نام ہے، گوٹھ میں ایک واحد ہوٹل اس کا ہی تھا جو تھا تو چھپر نما مگر چہرہ خوب تھا، اس کے ہوٹل میں ٹی وی تھا، تاش کی بازی بھی وہیں جیتی تھی، مٹھل اور سکھ کھیتوں سے واپسی پر وہیں چائے پینے بیٹھتے تھے اور تاش بھی کھیلتے تھے، آچر خان کی عمر پچاس کے قریب تھی، وہ شادی شدہ بھی تھا مگر اس کی کوئی اولاد نہ تھی مگر مٹھل کو اپنے بیٹے خالقو کی بات پر قدرے تعجب ہوا تھا کہ آخر اسے اس کی شادی کی فکر کیوں لاحق ہوگی۔

”اڑے بابا.....! وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو کرے، ہم نے کب روکا ہے اسے.....“ مٹھل بولا۔

”اڑے پو..... تُو سمجھتا کیوں نہیں، بڑا پیسے والا ہے، وہ کہہ رہا تھا کوئی اچھا سنگ (رشتہ) ملے تو پورے ڈیڑھ لاکھ عوضانہ دوں گا اور دونوں طرف کا خرچا بھی خود بھی اٹھاؤں گا۔“ خالقو نے صراحت سے بتایا۔ مٹھل کچھ سمجھے بغیر بولا۔

”ہاں تو ٹھیک ہے پھر ڈھونڈ لے اپنی عمر کی کوئی کچی پانھی عورت.....!“

”اڑے پو! تُو سمجھتا کیوں نہیں.....!“ خالقو چڑ کر بولا۔

بالآخر مٹھل بھی بھنا کر بولا۔ ”اڑے تو پھر تُو ہی سمجھا میرے پو.....!“

”پو.....! اپڑیں ملوکاں جو ہے، اس کا سنگ (رشتہ) دے دیتے ہیں اسے بہت عیش.....!“ خالقو کی بات حلق میں ہی رہ گئی کیونکہ اگلے ہی لمحے مٹھل اپنے لاپچی بیٹے کی بات سن کر فوراً غصے سے چار پائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ادھر قریب ہی رسوئی میں بیٹھی برتن دھوتی ہوئی ملوکاں کے کانوں تک بھائی اور باپ کی آواز صاف پہنچ رہی تھی، اپنے خود غرض بھائی کی بات سن کر اس کا دل بھی دھک سے رہ گیا اور اس کے ہاتھ سے پیلا چھوٹ گیا۔

”اڑے بے غیرت، تیری عقل کو نشہ چڑھ گیا ہے جو تُو اپڑیں جو ان گڈی جیسی معصوم ملوکاں کا سنگ ایک بڈھے اوباش سے کرنا چاہتا ہے..... ہمت کیسے ہوئی اس جواری کی، اس نے میری پھول سی بچی پر گندی نظر رکھی۔“ مٹھل غصے سے لال پیلا ہوتے ہوئے بولا۔

خالقو بھی قدرے ترخ کر بولا۔ ”پو.....! کیوں غصے میں اپنی بوڑھی ہڈیوں کو ہلکان کر رہا ہے، اس نے تھوڑی اپڑیں ملوکاں پر نظر رکھی ہے بلکہ اس نے تو دیکھا بھی نہیں ہے اسے..... تُو، تُو بھی خواہ مخواہ غصے میں آ گیا، تُو خود بھی تو اس کے ہوٹل میں تاش کھیلتے جاتا ہے۔“

”اڑے تو میں جو اتھوڑا ہی کھیلتا ہوں..... سادی بازی لگاتا ہوں..... تھک جاتا ہوں

بار بنے لگی ہے۔

”میرے ساتھ رہ کر تو کیا کرے گی..... میں تو خود بے گھر ہوں، اب تو اس کی لاش کا کرایہ کر کم کر، میں جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر سارنگ جلدی سے پلٹا اور فوراً جھوپڑی سے باہر نکل گیا۔

وہ رکے اور پیچھے دیکھے بغیر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا، اچانک اسے اپنے عقب سے اٹلی کی آواز سنائی دی۔ ”ارے او بے مروت.....! تیری خاطر میں نے اس شیطان کو ہلاک کر ڈالا..... اب تو بھی مجھے چھوڑ کر چلا ہے..... رک تو ذرا میں آئی۔“

سارنگ نے قدرے گھبرا کر اور رکے بغیر عقب میں دیکھا تو اٹلی دیوانہ وار اس کی طرف دوڑی چلی آرہی تھی، وہ بھی بے چارہ یکدم بدحواس ہو کر دوڑا، بڑی مضحکہ خیز صورت حال ہو گئی تھی، سخت گرمیوں کے موسم کی وجہ سے اس پاس سناٹا طاری تھا، اکا دکا لوگ سروں پر گیلے انگو پیچھے دھرے گھروں کو لوٹ رہے تھے، سارنگ دوڑتا ہوا بہت دور نکل آیا اور پھر ایک جھل میں داخل ہو گیا، یہاں کھجوروں کے درختوں کی بہتات تھی، اکا دکا صحرائی پالہر بھی ابستادہ تھے، وہ یہی سمجھا تھا کہ اس دیوانی لڑکی کو وہ بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے مگر جب اس نے ایک چوڑے تنے والے پالہر کے سائے میں رک کر اپنے عقب میں دیکھا تو ششدر رہ گیا، اٹلی ہانپتی کانپتی بہت دور سے آتی دکھائی دی، سارنگ بہت تھک چکا تھا، گرمی سے اس کا برا حال ہو رہا تھا، پسینے میں شرابور ہو رہا تھا، وہ بے دم سا ہو کر پالہر کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر بعد اٹلی بھی گرتی پڑتی اور ہانپتی ہوئی اس کے قریب آ کر نڈھال سی ڈھیر ہو گئی۔ دونوں میں بولنے کی ہمت نہیں تھی، ذرا دیر دونوں ہانپتے رہے پھر اس کے بعد سارنگ نے قدرے سخت لہجے میں اٹلی کو مخاطب کر کے کہا۔ ”چھو کر.....! تو پاگل تو نہیں ہو گئی، خواہ مخواہ میرے گلے کا ہار بن رہی ہے؟“

سارنگ کے سرد رویے پر اٹلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ قدرے تنک کر بولی۔ ”کیوں رہے.....! اتنی جلدی مجھے بھول گیا تو مجھے پسند کرتا تھا اور یہ تو مجھے چھو کر کا ہے کو کہتا ہے، میرا نام تجھے نہیں معلوم.....؟“ سارنگ اس کی جوابی کارروائی پر زچ ہو کر رہ گیا۔ وہ آفت ناگہانی سے چھٹکارا پانے کی سوچنے لگا، وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ بیٹی اتنی آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی، اسے پیار سے رام کر کے ہی چھٹکارا پایا جاسکتا تھا لہذا وہ ناچار اپنے لہجے کو نرم بناتے ہوئے اسے سمجھانے کی غرض سے بولا۔

”دیکھ اٹلی.....! میرا یہ مطلب نہیں تھا دراصل میں تجھے اپنے ساتھ خوار نہیں

کرنا چاہتا، پتہ نہیں مجھے اس مردود گاتریا کی تلاش میں کتنی دور جانا پڑے اس لئے میں چاہتا تھا کہ اپنی بھالی اللہ وسائی کو تلاش کرنے کے بعد میں ادھر ہی تیرے پاس لوٹوں۔“

سارنگ کی جادو بھری گفتگو نے کام کر دکھایا اور وہ بھی اس کی طرف مخمور نگاہوں سے ہنستے ہوئے گہرے لہجے میں بولی۔ ”دیکھ رہے.....! میں تیرا ساری زندگی انتظار کرنا چاہتی ہوں، پر مجھ پر تو بھروسہ کیوں نہیں کرتا، میں تجھ پر بوجھ نہیں بنوں گی، دیکھ سارو.....! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چل، مجھے اس منحوس گاتریا کے سارے ٹھکانوں کا علم ہے، میں تیری اس کام میں مدد کرنا چاہتی ہوں۔“

سارنگ کا اس کی بات سن کر اپنا ماتھا پیٹنے کو جی چاہا مگر وہ سردست بیزاری کا کوئی تاثر اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا، وہ دل ہی دل میں اس سے پیچھا چھڑانے کا آسان راستہ سوچ چکا تھا اس لئے وہ خاموش ہو رہا، اٹلی اسے پیار بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

وقت دھیرے دھیرے سرکنے لگا، سارنگ نے آگے بڑھنے کا قصد کیا اور پھر دونوں آگے ہوئے۔ وہ مسلسل چلتے رہے، نخلستان اور آبادی بہت پیچھے چھوڑ آئے اور اب وہ ایک بار پھر ریت کے حدنگاہ ویرانے میں نکل آئے۔ اٹلی، سارنگ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اسے جیوش بابا کے ٹھکانے کے بارے میں بتانے لگی۔

اٹلی کی یہ معلومات خاصی کارآمد ثابت ہوئیں جس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ بہت جلد ”ڈالی“ سے گزرنے کے بعد سرحد پار کے گاؤں ”گورا“ کے قریب پہنچ گئے ورنہ سارنگ نے یہی تہیہ کر رکھا تھا کہ اٹلی کو سوتا چھوڑ کر آگے نکل پڑے گا، اگرچہ اب بھی وہ اپنے فیصلے پر قائم تھا، وہ موقع کی تلاش میں تھا مگر جیسے جیسے صحرائیں آگے بڑھتا جا رہا تھا، اسے بار بار اپنے راہ سے بھٹک جانے کا ڈر محسوس ہونے لگا تھا لیکن ایسے میں اٹلی کا ساتھ اسے غنیمت محسوس ہوتا۔

رات سر پر آگئی تھی۔ سامنے تھوہر کے گھنے ڈھینگر تھے۔ ایک اجڑا بجزا..... پالہر کا درخت بھی طلسمی چاندنی میں عجیب سوگوار سا تاثر دے رہا تھا۔ انہیں اب بھوک ستانے لگی تھی۔ سامنے بہت دور انہیں عثمانی ہوئی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ اٹلی نا خیال تھا یہاں سے بدلی سرحدی پٹی شروع ہوتی ہے، یہاں خاردار باڑھ بھی تھی اور دونوں اطراف کی بارڈر سیکورٹی فورسز کی نظروں میں آنے کا بھی احتمال تھا۔

”اب کیا کریں..... پٹی عبور کئے بنا ہم آگے کس طرح بڑھ سکتے ہیں۔“ سارنگ نے سب اختیار ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اٹلی سے پوچھا۔ وہ اب اس پر اعتماد کرنے

لگا تھا۔

”نہیں..... یہ ممکن ہے مگر اس میں بھی بڑا کشت (تکلیف) بھوگنا پڑے گا۔“ املی نے پُر خیال لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب..... کیا کاشت.....؟“

”ذرا ٹھہر بتاتی ہوں۔“ املی نے کہا اور پھر نفرتی چاندنی میں ریت پر اپنی سانولی انگلیوں سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے لگی۔ سارنگ خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے سارنگ کو اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ ”ادھر آ..... تیرے کو بتاؤں۔“ سارنگ اس کے قریب سرک آیا۔ وہ بولی۔ ”یہ دیکھ..... اس وقت ہم بدلیسی سرحد کے پورب تھوہر کے جھل میں موجود ہیں۔“ املی بڑے ماہرانہ انداز میں ریت پر کھینچی ہوئی لکیروں پہ انگلی کے اشارے سے اسے سمجھانے لگی۔ سارنگ بڑے انہماک سے سن اور دیکھ رہا تھا۔

”اگر ہم یہاں سے پورب کی بجائے پچھم کا راستہ اپنائیں تو یہاں سے کوئی لگ بھگ آٹھ دس کوس کے فاصلے پر بھیل اور میگھواڑ قبیلے کا قصبہ آئے گا۔ یہ قبیلہ چونکہ دونوں طرف کی سرحدی پٹی پر واقع ہے اس لیے یہ ایک خاص تہوار پر قافلوں کی صورت میں آتے جاتے رہتے ہیں۔“ اتنا بتا کر املی تھمی۔

سارنگ جیسے فوراً اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے خیال ہے ہمیں پوندوں کی اس بستی تک پہنچ کر ان کا بھیس بھرنا ہوگا۔“

”ہاں..... پھر ہی ہم باسانی اور بے خطر سرحد پار کر سکتے ہیں۔“ املی نے اثبات میں سر ہلا کر کہا اور سارنگ چند ثانیے پُر سوچ خاموشی میں مستغرق ہو گیا۔ اسے یوں تو املی کی بات سے اتفاق تھا مگر وہ سوچ رہا تھا کہ اس طرح سرحد پار کرنے اور جیوش بابا تک پہنچنے کے بعد گاتریا کو تلاش کرنے میں کافی وقت لگ جائے گا تب تک وہ مردود گاتریا اللہ دسانی، اس کے معصوم بچے اور فریاد کا جانے کیا حشر کر چکا ہو لیکن اگر وہ املی کی تجویز کو رد کر کے خاردار باڑھ تک پہنچ کر سرحد پار کرنے کی کوشش کرتا تو دھر لے جانے کا خطرہ تھا اور ایسی صورت میں پھر وہ جہاں سے بھلا تھا، اس سے بھی پیچھے چلا جاتا۔ لہذا اس نے املی کی تجویز پر ہی عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

”کیوں رے..... کیا سوچتا پڑا ہے۔“ املی نے اسے ٹھوکا دے کر پوچھا۔

سارنگ نے طویں سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے..... مجھے تیری تجویز سے اتفاق ہے، اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔“

”پر چلنے سے پہلے پیت کا دوزخ بھرنا پڑے گا۔ مجھ سے تو اب ایک قدم بھی خالی پیت نہیں چلا جا رہا۔“ املی نے کہا پھر دوسرے ہی لمحے اچانک جیسے کچھ سوچ کر بولی۔ ”دیکھ رے سارنگ..... اٹھا اگر کسی چھوٹے موٹے جانور کا شکار کر لے تو اسے بھون کر پیت کی آگ بجھائی جاسکتی ہے۔ میرے پاس ماچس ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے گریبان سے ناخس کی ڈبیا نکال کر اسے دکھائی۔

”پر..... یہاں..... ریت کے سمندر میں کیا شکار ملے گا۔“ سارنگ بولا۔

”کوشش کر کے دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ کوئی جنگلی خرگوش تو نظر آ ہی جائے گا۔“ املی نے کہا۔

سارنگ نے ایک لمحہ بغور اس کے کٹیلے سلونے چہرے کی طرف دیکھا، جو مدھم چاندنی میں بڑی ملاحظہ بکھیر رہا تھا۔ سارنگ کو اچانک اس کے چہرے میں اپنی محبوبہ دل نواز میراں کا چہرہ نظر آنے لگا۔ دونوں میں اسے خاصی مشابہت سی محسوس ہونے لگی۔ املی کے چہرے پر اپنی میراں کا صبح چہرہ دیکھ کر سارنگ کے چہرے پر ایک وارفتگی چھانے لگی۔ وہ جیسے ارد گرد سے بیگانہ ہو گیا۔ ادھر املی نے..... جو پہلی بار سارنگ کو اپنے چہرے کی طرف عالم محویت میں دیکھتے ہوئے پایا تو جیسے اس کی مراد برآئی۔ وہ سارنگ کے والہانہ پن کو اپنی ”میراث“ سمجھتے ہوئے اپنے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھیر کر اسے مخمور نگاہوں سے تنکے لگی۔

سارنگ پر سرشاری طاری ہونے لگی۔ وہ خود سے بیگانہ ہو کر املی کی طرف جھکا۔ املی نیم باز آنکھوں سے اسے اپنے قریب آتا دیکھنے لگی۔ تب اس نے فوراً جذبات سے اپنی آنکھیں موند لیں۔ لب تر ساں وا ہو گئے۔ پھر املی کو سارنگ کی عالم سرشاری میں زیر لب بولنے کی آواز سنائی دی۔ ”میراں.....“

املی کے اندر چھنکا ہوا اور جیسے اس کے اندر کا تاج محل ٹوٹ کر نکھر گیا۔ اس کا دماغ ٹھوم گیا۔ سرشاری کی جگہ اچانک رقابت کی جھڑکتی ہوئی آگ نے لے لی۔ اس نے قریب آتے سارنگ کو زور سے پرے دھکا دے دیا۔

☆=====☆=====☆

اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد ڈاکٹر فوزیہ واپس اپنی کار کی طرف لوٹی تو ایک باوردی پولیس والا فوراً اس کی طرف بڑھا اور شائستہ لہجے میں پوچھا۔ ”کیا بات ہے محترمہ..... خیریت تو ہے؟“

”ہاں..... کچھ غنڈے میری گاڑی کا تعاقب کر رہے تھے۔ شاید اب ڈر کر لوٹ گئے ہیں۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے جواباً اس سے کہا۔

پولیس والے کا سینہ فخر سے پھول گیا اور جو شیلے لہجے میں بولا۔ ”ہاں..... ہماری دھاک ہی کچھ ایسی ہے، آپ کہیں تو پولیس کی موبائل آپ کے ساتھ کر دوں۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ..... میں اب خود چلی جاؤں گی۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر فوزیہ دوبارہ اپنی کار میں آ بیٹھی اور تھانے کے احاطے سے نکل کر سڑک پر آ گئی۔ پھر جب اس نے عقب میں اچھی طرح تسلی کر لی کہ جہاں داد کی لینڈ کروزر اس کے تعاقب میں نہیں ہے تو اس نے گاڑی بڑی شاہراہ پر موڑ دی۔

اپنی کٹھنی کے وسیع احاطے میں داخل ہونے کے بعد اس نے سکون کی سانس لی اور اندر آ گئی۔ اس نے اس کا ذکر سدھوراں سے کرنا مناسب نہ سمجھا البتہ موسیٰ اس کی شدت سے منتظر تھی۔

”بیٹا.....! سدھوراں کے لیے میں نے ایک رشتہ ڈھونڈا ہے۔“ اس نے بتایا۔
”اچھا..... یہ تو بڑی اچھی خبر ہے، کون ہے وہ، کیا کرتا ہے؟“ ڈاکٹر فوزیہ نے پوچھا۔

”پرویز نام ہے اس کا چھوٹا سا ہوٹل ہے۔“ موسیٰ بتانے لگی۔ ”چالیس پینتالیس کے قریب عمر ہے اس کی..... پہلی بیوی سے اس کی بیٹی نہیں..... وہ اپنے دونوں بچے لے کر چلی گئی تھی۔ اب وہ اکیلا ہے اور دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔“

”مگر موسیٰ..... وہ رہتا کہاں ہے..... اور پہلی بیوی اسے چھوڑ کر کیوں چلی گئی؟“
”وہ آوارہ تھی جبکہ پرویز خود ایک غیرت مند اور شریف انسان ہے۔ قیوم آباد میں اس کا اپنا دو کمروں کا گھر ہے۔“

”تجھے کسی نے یہ رشتہ بتایا ہے..... یا تو بذات خود اسے جانتی ہے۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے کسی خیال کے تحت موسیٰ سے پوچھا۔

”میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں ہے۔ وہ دوسری میں ایک پہلوان دودھ، دی والا ہے ناں..... اس کی بیوی کلثوم نے بتایا ہے، پرویز اس کے شوہر کا گہرا دوست ہے۔“

”اچھا..... تو نے پھر کلثوم کو کیا جواب دیا؟“
”ابھی تو میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ سوچ پہلے آپ سے بات کر لوں۔“

”اچھا ٹھیک ہے پر.....“ ڈاکٹر فوزیہ نے کہا پھر لمحہ بھر توقف کے بعد کچھ سوچے

ہوئے دوبارہ بولی۔ ”میں پہلے پرویز کے ماں باپ سے ملنا چاہوں گی..... انہیں کبھی لے کر آ میرے پاس.....“

”وہ جی..... اس کے ماں باپ تو گزر گئے دنیا سے..... اس بے چارے کا تو کوئی نہیں۔“ موسیٰ بولی۔

”اور..... کوئی دور پرے کا رشتہ دار؟“
”نہیں جی..... اس کا کوئی نہیں اور..... بس پہلوان دودھ والے کے گھر ہی اس کا آنا جانا ہے۔“

”اچھا.....“ ڈاکٹر فوزیہ گولگو سے لہجے میں بولی۔ پھر اچانک جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ وہ بولی۔ ”موسیٰ.....! تو نے کلثوم سے سدھوراں کے بارے میں ذکر کیا تھا، ایسا نہ ہو وہ بعد میں انکار کر دے اور بلاوجہ بد مزگی پیدا ہو اور وقت کا بھی زیاں ہو۔“

”ہاں جی..... میں نے آپ کی ہدایت کے مطابق پہلے ہی ساری بات بتا دی تھی۔“ موسیٰ نے کہا۔ ”کلثوم بتا رہی تھی کہ پرویز بڑا نیک اور بہتر انسان ہے، وہ خود بھی چاہتا ہے..... کسی مجبور اور بے سہارا غریب عورت کا سہارا بنے۔“

”یہ تو اور اچھی بات ہے۔“ ڈاکٹر فوزیہ یکدم خوش ہو کر بولی۔ ”تو ان دونوں میاں بیوی کو پیغام دے آ جا کر کہ وہ لوگ پرویز کو لے کر کسی وقت یہاں آ جائیں۔“

”جی بہت اچھا۔“ موسیٰ نے اثبات میں سر ہلایا۔
دو دن بعد ڈاکٹر فوزیہ نے اپنی کٹھنی میں رات کے وقت ایک فون اٹینڈ کیا۔ تعارف کروانے کے بعد دوسری جانب سے ایک کھر کھراتی ہوئی جانی پہچانی آواز ابھری۔

”ہاں بابا..... جہاں دامخض کرتا پڑا ہوں۔“
جہاں داد کی آواز سن کر ایک لمحے کو ڈاکٹر فوزیہ سن ہو کر رہ گئی مگر فوراً ہی وہ درشت لہجے میں بولی۔ ”تم.....! تم نے جرات کیسے کی مجھے فون کرنے کی.....؟“

”ڈاکٹر فی صلاب.....! مجھ سے دشمنی مول لے کر تم خود کو بہت بڑے جنجال میں ڈال رہی ہو۔ دوسری طرف سے جہاں داد کی پچا کر رہی ہوئی آواز ابھری تو ڈاکٹر فوزیہ کو اپنی ریڑھ ہڈی میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی تاہم وہ اس کی دھمکی سے مرعوب ہوئے بغیر برستور درشت لہجے میں بولی۔

”دیکھ مسٹر.....! اگر تم نے میرا پیچھا نہ چھوڑا تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“
دوبارہ مجھے فون کرنے کی جرات مت کرنا۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر فوزیہ نے فون پٹخ

دیا۔ اس کی سانس تیز چل رہی تھی، وہ چند ثانیے بیجانی کیفیت میں مبتلا رہنے کے بعد نیلیوں سیٹ پر نصب سی ایل آئی اسکرین پر جہاں داد کا نمبر پڑھنے لگی، جب اس نے اس نمبر پر ڈائل کیا تو وہ نمبر کس پبلک بوتھ کا نکلا۔

”کیا ہوا باجی.....! خیریت ہے، کس کا فون تھا؟“ سدھوراں نے قدرے تشویش سے پوچھا۔ وہ اس وقت اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔

ڈاکٹر فوزیہ نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی پھر سر جھٹک کر بولی۔ ”تھا کوئی پاگل.....! خیر چھوڑو..... آؤ میں نے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”جی باجی.....!“

”آؤ بیٹھو یہاں، آرام سے.....“ ڈاکٹر فوزیہ نے ایک صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے سدھوراں کو بھی اپنے قریب بیٹھنے کو کہا۔ سدھوراں جھکے جھکے سر کے ساتھ ڈاکٹر فوزیہ کے قریب بیٹھ گئی۔

”سدھوراں.....! موسیٰ نے ایک رشتہ دیکھا ہے، مجھے بہتر محسوس ہوا ہے۔“

جواباً سدھوراں گردن جھکائے خاموش رہی۔ شادی سے متعلق جب بھی ذکر ہوتا، سدھوراں کی آنکھوں کے سامنے جانے کیوں سانول کا چہرہ گھوم جاتا۔

”سدھوراں.....! کہاں کھوئی ہو۔ تم نے پوچھا نہیں کون تم سے شادی کرنا چاہتا ہے؟“ اسے سوچ میں گم پا کر ڈاکٹر فوزیہ نے اس سے پوچھا۔

سدھوراں نے قدرے چونک کر سر اٹھایا اور ڈاکٹر فوزیہ کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی تو جانے کیوں فوزیہ کو سدھوراں کی اداس آنکھوں میں جلتے دھمکے کی پیش محسوس ہوئی۔

”باجی.....! میں نے سب کچھ اپنے خدا پر چھوڑ رکھا ہے، آپ کو رشتہ پسند ہے تو ٹھیک ہے، میں کیا پوچھوں.....؟“ سدھوراں نے کہا تو اس کی آواز نرم نہاں سے بوجھل ہو رہی تھی، یا سیت بھرے غم نے اسے مروڑ کر رکھ دیا تھا، وہ جانتی تھی کہ اس کی حیثیت کیا تھی، یہی کیا کم تھا کہ اس کے گناہ آلودہ وجود کو ایک شریف النفس نے سہارا دے رکھا تھا۔

ڈاکٹر فوزیہ نے ازراہ ملائمت اس کے کاندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے نرمی سے کہا۔

”سدھوراں! موسیٰ نے ایک رشتہ دیکھا ہے، پرویز نام سے اس کا۔ ہے تو کچی عمر کا مگر اچھا کھاتا کھاتا ہے، پہلی بیوی سے اس کی بیٹی نہیں، بال بچہ بھی کوئی نہیں، دوسری شادی کرنا چاہتا ہے اب، میں نے موسیٰ سے کہا ہے کہ اسے کبھی یہاں لے کر آئے۔“

”باجی! کیا اسے میرے بارے میں سب بتا دیا گیا میرا مطلب ہے ایسا نہ ہو کہ بعد میں.....!“ سدھوراں کچھ کہتے کہتے دانستہ چپ ہو گئی۔

”ہاں.....! ظاہر ہے، ہم کسی کو دھوکے میں بھلا کیوں رکھیں گے۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے کہا اور ازراہ تشفی مزید بولی۔ ”مجھے تو وہ شریف اور خدا ترس انسان ہی لگتا ہے جو تمہارے سارے حالات جانتے ہوئے بھی تم سے شادی کے لیے راضی ہے۔“

”ہاں باجی.....! مجھے اب کوئی خدا ترس ہی اپنا سکتا ہے جبکہ میں ہمدردی کے بھی لائق نہیں۔“ سدھوراں نے غم سے چور لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر فوزیہ کا دل کٹ کر رہ گیا، وہ سدھوراں کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ ”ما یوسیٰ گناہ ہے سدھوراں.....! اللہ تعالیٰ نے ہر کسی کا جوڑا بنایا ہے، تمہاری قسمت میں اگر یہی شخص لکھا ہے تو تم اس کے ساتھ ضرور اپنی خوشی کی زندگی بسر کرو گی۔“ جواباً سدھوراں خاموش رہی۔

پھر ایک روز پرویز، پہلوان دودھ والے اور اس کی بیوی کلثوم کے ہمراہ آیا، موسیٰ انہیں اپنے ساتھ لے کر آتی تھی۔ وہ چھٹی کا دن تھا اور صبح کے گیارہ بجے تھے، ڈاکٹر فوزیہ نے انہیں اپنے کمرے میں ہی بلا لیا تھا اور سدھوراں البتہ دوسرے کمرے میں تھی۔

دیکھنے میں پرویز بھلا مانس نظر آیا تھا، اس کی عمر پینتالیس برس رہی ہوگی، وہ قدرے سانولی رنگت اور دبے ہوئے قد کا مگر خاصا صحت مند آدمی تھا، اس نے اچلے کپڑے پہن رکھے تھے، مونچھوں اور سر کے بال کلر کئے ہوئے لگ رہے تھے، بائیں ہاتھ کی ایک انگلی میں چاندی کی قدرے موٹی انگشتی نظر آ رہی تھی۔

”لو جی بیگم صاحبہ.....! لڑکا حاضر ہے، آپ نے جو اس سے پوچھنا ہے، پوچھ لیں۔“ شمالاً جنوباً پھیلے ہوئے تو ندیل دودھ والے پہلوان جی نے ڈاکٹر فوزیہ سے کہا۔

ڈاکٹر فوزیہ نے پہلو بدلا اور پرویز سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”کیا تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جس لڑکی کے ساتھ تمہاری بات چل رہی ہے، وہ کس حالت میں ہے؟“

”وہ جی بیگم صاحبہ.....! آپ بے فکر ہیں، میں نے اپنے یار پرویز کو سب کچھ بتا دیا ہے۔“ پہلوان جی نے لقمہ دیا تو برابر میں بیٹھی اسی جیسی موٹی تازی بیوی نے شوہر کو کہنی مار کر کہا۔

”تم چپ رہو..... بیگم صاحبہ خود جو پوچھ رہی ہیں۔“

”جی؟“ ڈاکٹر فوزیہ نے پرویز کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے گہری سنجیدگی

سے کہا۔

سدھوراں اور پرویز کو بھی آنے سامنے کر دیا پھر اس کے بعد شادی کی تاریخ طے پا گئی۔
سدھوراں کی پرویز سے نسبت طے کرنے کے بعد ڈاکٹر فوزیہ خود کو ایک دم ہلکا چھلکا محسوس کرنے لگی، موسیٰ نے بھی اطمینان کی سانس لی۔

☆=====☆=====☆

پرویز ہولے سے ہولا۔ ”جی..... جی..... بیگم صاحبہ.....! مجھے بھائی اور پہلوان جی نے لڑکی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔“

”تم پھر بھی ایسی لڑکی سے شادی کرنا کیوں چاہتے ہو.....؟“ ڈاکٹر فوزیہ نے اچانک چبھتا ہوا سوال داغا تو بجائے پرویز کے پہلوان جی اور ان کی اہلیہ کے چہرے پر یکدم بدحواسی کے آثار پھیل گئے مگر پرویز بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بولا۔

”بیگم صاحبہ.....! اللہ تعالیٰ سب کا پردہ رکھے، دراصل شادی کرنا ایک تو میرے گھر بسانے والی مجبوری ہے، دوسرا میں خود ایک گناہگار شخص ہوں، چاہتا ہوں کسی ایسی لڑکی کو اپنی شریک حیات بناؤں جو حالات کی ستانی ہوئی ہو تاکہ کچھ ثواب کمالوں، ویسے میرا دعویٰ ہے کہ ایسی عورت آگے چل کر بہت اچھی گھریلو عورت اور خدمت گزار بیوی ثابت ہو گی۔“

ڈاکٹر فوزیہ کو پرویز کی صاف گوئی بہت پسند آئی اور وہ اس سے متاثر نظر آنے لگی۔
”ہوں..... تمہاری اپنی پہلی بیوی سے کیوں نہیں بن سکی.....؟“ ڈاکٹر فوزیہ نے اگلا سوال کیا۔

”جی.....! اس میں بھی میرا ہی قصور تھا۔“ وہ جھینپ کر کر بولا۔ ”کیا کروں بیگم صاحبہ.....! ہوٹل میں کام ہی اتنا ہوتا ہے، آپ کو تو معلوم ہے صبح پانچ بجے سے رات کے بارہ بجے تک ہوٹل کھلا رہتا ہے، میرا اپنا ہوٹل ہے ناں جی، اس لئے نگرانی بھی خود ہی کرنی پڑتی ہے ورنہ گاڑی ٹوٹنے لگتی ہے، میں نوکروں کے حوالے تو کرنے سے رہا، نوران کو اسی بات کی چڑ رہتی تھی۔“ اتنا بتا کر اس نے نہایت سعادت مندی سے اپنا سر جھکالیا۔

ادھر وہ دونوں دو پہلوان مار کہ میاں، بیوی پرویز کی صاف گوئی سے پریشان نظر آرہے تھے، ان کا خیال تھا کہ اب لڑکا زبانی امتحان میں فیل ہو جائے گا۔

ڈاکٹر فوزیہ نے سوچا، یہ شخص کچھ نہیں چھپا رہا اور صاف گوئی اور انصاری سے اپنے عیب بھی گنوا جا رہا ہے، پہلی بیوی سے نبھانہ ہونے کی وجہ بھی ڈاکٹر فوزیہ کے دل کو لگی تھی کہ اس میں پرویز کا بہر حال کوئی قصور نہ تھا، ظاہر ہے اس کا اپنا ہوٹل تھا اور وہ خود محنت کرتا تھا، کام سے جی تو نہیں چراتا تھا، بعض بیویاں چاہتی ہیں کہ ان کا مرد ان کے گھٹنوں سے بندھا رہے۔

رچی گھٹنگو کے بعد ڈاکٹر فوزیہ نے رضا مندی ظاہر کر دی اور پھر ایک دو روز کے بعد

اس نے اس نے اس بار ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹایا تو تب کہیں جا کر اندر کسی کوٹھری سے نجف سی آواز آئی سنائی دی۔ ”کون ہے..... اندر آ جاؤ..... دروازہ کھلا ہے۔“

ملوکان پہلے تو اس کمزوری آواز کو پہچان ہی نہ پائی پھر دوسرے ہی لمحے وہ بری طرح چونکی، اندر کوئی بری طرح کھانسنے رہا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بیمار پڑا ہو، ملوکان کے چہرے کے تاثرات متغیر ہو گئے، وہ فوراً دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہو گئی، کچا صحن ویران پڑا تھا، سامنے کوٹھری کا دروازہ کھلا تھا، اندر ایک کھری چار پائی پر اسے کوئی لینا ہوا دکھائی دیا، ملوکان گھڑا کچے فرش پر رکھے بے تابانہ آگے بڑھی، کوٹھری میں داخل ہوتے ہی وہ دھک سے رہ گئی، کھری چار پائی پر سانول نڈھال سا لینا ہوا تھا، وہ کافی کمزور نظر آ رہا تھا، اس تنگ و تاریک کوٹھری میں عجیب سی گھنٹی آمیز بو پھیلی ہوئی تھی، سانول ہولے ہولے کراہ رہا تھا، اس نے ملوکان کو اپنی نیم وا آنکھیں کھول کر دیکھ لیا تھا۔

”ہائے ڈے سانولے.....! تیرے کو کیا ہو گیا یہ، تُو نے اپڑیں کیا حالت بنا رکھی ہے؟“ ملوکان کرب سے تڑپ اٹھی۔ وہ اس کے قریب چار پائی کی پانٹی پر بیٹھ چکی تھی اور اس نے جب اپنا ایک ہاتھ سانول کی پیشانی پر رکھا تو اس کی پریشان کن تشویش مزید بڑھنے لگی۔ ”اڑے تیرے کو تو بڑا تیز بخار ہے..... ڈے کب سے تو بیمار پڑا ہے؟“ اس نے فکڑ بھرے لہجے میں کہا۔ اپنے محبوب کو ایسی حالت میں دیکھ کر اس کی سرگیں آنکھیں نمناک ہونے لگی تھیں۔

”تت..... تت تُو ادھر کیوں آئی ہے، تیرا اب یہاں کیا کام، جا جا چلی جا واپس اپڑیں گھر.....“ سانول نے ہانپتی ہوئی سی آواز میں کہا تو ملوکان کو محبوب کی یہ بے مروتی گھائل کرنے لگی لیکن وہ اسے کوئی اہمیت دینے بغیر اپنے مخصوص انداز میں بولی۔

”کیوں ڈے اتنا کٹھور کیوں بنتا ہے..... ماما کدھر ہے، کیا تُو نے کوئی دوا دارولی ہے.....؟“

”ماما کام پر گیا ہے، دوا لایا تھا میں حکیم سے، کھارہا ہوں، ٹھیک ہو جاؤں گا، پر تُو جا یہاں سے.....“ سانول نے پھر اسے دھتکارا۔

ملوکان بھی ایک مٹی کی تھی، وہ اسے سنگدل محبوب کی ایک ادائے بے رخی پر محمول کرتے ہوئے اپنے مخصوص ضدی لہجے میں بولی۔ ”نہیں..... میں ایسے نہیں جاؤں گی، چل تیرے کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں، وہ تیرے کو جب تک سوئی نہیں لگائے گا، تیرا بخار ٹھیک نہ ہو گا۔“

ملوکان کو اپنے چری بھائی خالقو سے اسی دن سے نفرت ہو گئی تھی جس دن وہ اس کی شادی کی بات کسی آچر خان نامی بڑھے سے روپوں کے لالچے میں طے کرنا چاہتا تھا مگر وہ خوش بھی تھی کہ اس کے باپ نے لالچی خالقو کو خوب کھری کھری سنائی تھیں لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ ملوکان کے سینے میں اندیشوں کے سنبو لیے بھی کلبلائے لگے تھے اور اس بائے جیلے نوجوان سانول کا حسین تصور اسے بے چین سا کرنے لگا، دن بھی تو بہت گزرے تھے اسے دیکھے ہوئے، وہ دل ہی دل میں اس سے شکوہ کرنے لگی۔ ایسی بھی کیا بے مروتی، دوبارہ آیا ہی نہیں، ٹھیک ہے میں ہی مل آتی ہوں۔ اس نے دل میں تہیہ کیا اور پھر ایک روز وہ پاس کی نہر سے پانی بھرنے لگی تو اس نے ایک بوڑھے سے بیل گاڑی والے کو دیکھا، وہ سوکھی گھاس لادے اس طرف ہی جا رہا تھا جدھر سانول کے ماما اللہ رکھو کا گھر تھا، دونوں گوٹھ آپس میں رلے ملے ہوئے تھے بس درمیان میں چاولوں، جوار، باجرے کے کھیت تھے، بیل گاڑی والے بابے کو چاچا سائیں کا لقب دے کر وہ خالی گھڑے سمیت اس پر سوار ہو گئی، وہ جانتی تھی اس کا باپ اب شام گئے ہی لوٹے گا، ماں تو اس کی ویسے ہی سہیلی تھی، بھائی خالقو رات کو ہی اپنا چہرہ کھاتا تھا، وہ پوری طرح مطمئن تھی۔ تھوڑی سی دیر بعد وہ در محبوب کے قریب پہنچ کر بیل گاڑی سے چھلانگ لگا کر اتری اور ہاتھ ہلا کر گاڑی بان کا شکریہ ادا کیا، وہ مسکراتا ہوا آگے ہو گیا۔

یہ کچے گھروں کی میزھی میزھی سی گلی تھی، محبوب کی گلی پہنچ کر ملوکان کا دل میٹھی میٹھی چٹکیاں لینے لگا، تین گھر چھوڑ کر سانول کے ماما اللہ رکھو کا گھر تھا، گلی ویران تھی، وہ خالی مٹکا پہلو سے نکائے ہوئے منک منک کر آگے بڑھ رہی تھی، منک رکھنے کا ایندھا اس نے سر پر ہی رہنے دیا تھا، دوسرے ہی لمحے وہ محبوب کے دروازے پر تھی، اس نے اپنے بے طرح دھڑکتے دل پر مقدور بھر قابو پاتے ہوئے دروازہ کھٹکھٹایا۔

وہ دل میں یہی دعا مانگنے لگی کہ سانول گھر پر ہی ہو لیکن اندر سے کوئی آواز نہ ابھری۔

سانول کو اچانک کھانسی کا شدید دورہ پڑا، ملوکاں نے ادھر ادھر دیکھا، قریب تر اسے پانی کی صراحی جس پر جست کا گلاس اوندھا دھرا تھا، نظر آئی، اس نے جلدی سے صراحی سے گلاس میں پانی انڈیلا اور دوبارہ سانول کی کھری چار پانی کے قریب آکر اسے ایک ہاتھ سے سہارا دیتے ہوئے اٹھایا پھر گلاس اس کے لرزتے ہونٹوں سے لگا دیا، چند گھونٹ پانی کے پینے کے بعد سانول کو سکون ملا۔

”کیا یہ ملوکاں کی قربت کا اثر ہے؟“ اس نے پہلی بار چور دل سے سوچا مگر پھر اس کے اندر صحرا کی بادِ موسم چلنے لگی۔

”تیری کوئی دوا دار تو بھی رکھی ہوئی ہے یا نہیں؟“ اچانک ملوکاں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”حکیم جی نے دی تھی، ختم ہو گئی۔“ سانول نے نحیف سی آواز میں کہا۔

ملوکاں اپنے ہونٹ کاٹنے لگی، اسے اب ماما اللہ رکھو پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”دوا ختم ہو گئی تھی تو اور لانی تھی، کیوں نہیں لائے..... اچھا چل چھوڑ، اللہ بہتر کرے گا، میں جا کر کسی ڈاکٹر، حکیم کو دیکھتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ہلٹی۔

سانول نے اسے کمزور سی آواز میں پکارا۔ ”ملوکاں!..... تو کیوں مجھ بیمار کو تنگ کرنے آگئی ہے، تیرے کو اللہ کا واسطہ تو یہاں سے چلی جا چلی..... یہاں سے.....“ یہ کہتے ہوئے سانول کو ایک بار پھر کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔

ملوکاں کا دل اپنے محبوب کی بے رخی پر کٹ کر رہ گیا، وہ پلٹ کر سانول کی طرف بڑھی اور فرش پر رکھا پانی سے بھرا گلاس اٹھایا پھر جب اس نے دوسرے ہاتھ سے اسے سہارا دینے کی غرض سے چھو تو سانول نے بری طرح اس کا ہاتھ جھٹک دیا، پانی کا گلاس ملوکاں کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔

سانول کھانسی کے درمیانی وقفے کے درمیان دوبارہ اس سے غصیلے لہجے میں بولا۔ ”جا چلی جا یہاں سے..... اور ادھر بھی مت آنا..... جا.....“

ملوکاں دل موس کر رہ گئی پھر کوٹھری سے باہر صحن میں آکر سسک سسک کر رونے لگی، اس نے اپنی چادر سے آنسو پونچھے اور جب قریب رکھے اپنے گھرے کو اٹھایا اور دروازہ کی طرف بڑھی تو اچانک دروازہ کھلا، وہ جھٹک کر رکنی، سامنے ماما اللہ رکھو کھڑا اس کے آنسو بھرے چہرے کو حیرت سے تنکے لگا۔

”دھیئے.....! تو یہاں..... خیر تو ہے؟“ وہ حیرت سے اس کے چہرے کو تنکے لگا۔

اندرا داخل ہو کر بولا۔

”ماما!.....! وہ..... وہ اندر سانول کو تو بہت تیز تاپ (بخار) چڑھا ہوا ہے، کوئی دوا بھی نہیں ہے۔“ ملوکاں نے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

ماما اللہ رکھو بغور اس کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ تنکے لگا، اس کی باراں دیدگی نے ملوکاں کی چشم تر کو دیکھ کر بخوبی اندازہ لگالیا تھا کہ یہ آنسو کسی تعلق خاطر ہی کے غماز ہیں۔ بہر طور وہ ملوکاں کے سر پر اپنا دست شفقت دھرتے ہوئے بولا۔ ”دھیئے! میں اس کی دوائی ہی لینے گیا تھا۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی قمیض کی جیب سے تھیلی میں لپٹی چند پڑیاں نکالیں اور دوسری جیب سے ایک چھوٹی سی دوا کی بوتل بھی۔

”ماما! حکیم کی دوائی سے تو لگتا ہے سانول کو کوئی فائدہ نہیں ہو رہا، تو اس کو کسی ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتا، اسے سوئی کے بغیر آرام نہیں آئے گا۔“ ملوکاں نے قدرے تفکر سے کہا۔

ماما اللہ رکھو سر ہلاتا ہوا اندر کوٹھری کی طرف چلا گیا، ملوکاں وہیں کھڑی رہی، چند لمحوں بعد ماما اللہ رکھو اس کے قریب آیا، ملوکاں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، ماما کے چہرے پر گہری سنجیدگی کے تاثرات چھائے ہوئے تھے، ملوکاں کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہو، کوئی گہری بات.....!

”دھیئے.....! تو ایک سمجھدار چوکرا، ہے، میری بات کا برا نہیں منائے گی۔“ وہ کہنے لگا۔ ”تیرا اس طرح اکیلے ادھر آنا اچھا نہیں، تیرے ماں، پوہوتے تیرے ساتھ تو اور بات تھی۔“

وہ خاموش ہوا تو ملوکاں نے ایک نظر ماما کے چہرے پر ڈالی پھر خاموشی سے ہولے سے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

تب پھر ماما اللہ رکھو نے اس کے سر پر دھیرے سے اپنا ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں کہا۔ ”دھیئے!.....! میں سمجھ رہا ہوں تیرا دکھ، تو مجھے اچھی لگتی ہے بالکل دھیوں کی طرح..... تو فکر نہ کریں میں سانول کو سمجھا دوں گا اور میں کوشش کروں گا کہ تیرے ماں، پوہ سے بھی آکر ایک ملاقات کروں۔“

ماما کی بات سن کر ملوکاں کا دل زور سے دھڑکا، اس نے دیپ جلی آنکھوں سے ماما کے چہرے کی طرف دیکھا پھر موم سی شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ لوٹ گئی۔

ملوکاں چاہتی تھی کہ کسی طرح اس کے دل کا راز ماما تک پہنچ جائے، وہ خود بعد کے حالات سنبھال لے گی۔ درحقیقت ملوکاں نے جب سے اپنے لالچی اور خود غرض بھائی خانہ

کے خطرناک ارادے جان لئے تھے، وہ پریشان ہو گئی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح سانول کی دلہن بن جائے مگر چونکہ وہ ایک شریف لڑکی تھی اسی لئے خود سے کبھی بھی اپنے کا حال نوک زباں پر نہیں لاسکتی تاہم اب وہ خوش تھی کہ اس کے حال دل سے ماما اللہ واقعہ ہو گیا تھا لیکن پھر جب وہ سانول کی بے اعتنائی محسوس کرتی تو اس کا دل کڑکڑاتا جاتا۔

”میں نے تیرے ساتھ کوئی چھل فریب نہیں کیا، تو خود میرے گلے کا بار بنی ہے۔“ سارنگ نے رکھائی سے کہا اور ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑایا۔ اہلی کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی، اس نے طیش میں آکر سارنگ کے چہرے پر تھپڑ رسید کرنا چاہا تو سارنگ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور نفرت سے اسے پرے دھکیلتے ہوئے غصے سے غرا کر بولا۔ ”اپنی اوقات میں رہ چھو کر۔ اور نہ تجھے مزہ چکھا دوں گا۔“

”نو مجھے کیا مزہ چکھائے گا، فرجی انسان! مزہ تو میں تجھے چکھاؤں گی۔“ اہلی اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے چھڑاتے ہوئے نفرت بھرے لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھوں سے نفرت اور انتقام کی چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔ ”میں نے..... میں نے تیری کھاتر (خاطر) اپنے باپ کو ہلاک کیا اور تیری مدد کے لئے یہاں تک آئی..... اور تھو نے..... تو نے..... وہ دھت سے ہانپنے لگی۔

”میں نے تو تجھے نہیں کہا تھا کہ تھو اپنے باپ کو قتل کر دے اور میرے ساتھ چل پڑ، تھو تو خود اپنے سوتیلے باپ پر، سارنگ کھائے جیسی تھی۔“ سارنگ نے بدستور سرد لہجے میں کہا۔

اہلی چند ثانیے سارنگ کو قہرناک نگاہوں سے گھورتی رہی پھر منتظرانہ لہجے میں بولی۔ ”ٹھیک ہے، پر میں دیکھتی ہوں تو کس طرح سرحد پار کر کے گاتریا تک پہنچتا ہے۔“

اس کی دھمکی پر سارنگ کو بھی غصہ آ گیا اور آنکھوں میں اس کی معاندانہ چمک نمودار آئی۔ وہ دانستہ مہیتے ہوئے اس پر چھینا اور اس کی نازک گردن دیوچ کر خونخوار لہجے میں بولا۔ ”دیکھ چھو کر۔ اگر تھو نے میرے راستے میں آنے کی کوشش کی تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا کبھی.....! جا اب بھی وقت ہے، لوٹ جا واپس اپنے گھر کی طرف.....! اس کی دھمکی کا اثر ثابت ہوئی کیونکہ اگلے ہی لمحے جب سارنگ نے اس کی تپیں نہ اتنی وار مژدن چھوڑی تو اہلی نے بھل بھل آنسو بہانے شروع کر دیئے، اب سارنگ کے پریشان غصے کی باری تھی۔ وہ بہر حال فطرتاً ایک نرم دل انسان تھا تاہم وہ چپ چاپ کھڑا اہلی کو دیکھتا رہا۔

رات اپنے نصف پہر میں داخل ہو چکی تھی، چاند کی طلسماتی روشنی میں لاق و دوق صحرا بڑا

کے خطرناک ارادے جان لئے تھے، وہ پریشان ہو گئی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح سانول کی دلہن بن جائے مگر چونکہ وہ ایک شریف لڑکی تھی اسی لئے خود سے کبھی بھی اپنے کا حال نوک زباں پر نہیں لاسکتی تاہم اب وہ خوش تھی کہ اس کے حال دل سے ماما اللہ واقعہ ہو گیا تھا لیکن پھر جب وہ سانول کی بے اعتنائی محسوس کرتی تو اس کا دل کڑکڑاتا جاتا۔

بہر طور ملوکاں آس و نر اس کی کیفیت میں غلطیاں نہر پر پہنچی، گھڑا پانی سے لبالب پرانے کپڑوں کی دھجیوں اور کتروں سے بنایا ہوا ایندھن پر رکھا اور ملوکا اس پر دھڑاپے گھر کی طرف ہوئی۔ نہر سے اس کے گھر کا فاصلہ زیادہ دور نہ تھا، آس پاس چاول، جو اور باجرے کے کھیتوں کا سلسلہ تھا، نہران سلسلوں سے نصف فاصلے پر بھی جدھر لکڑی آسریں کے درختوں کے جھنڈ تھے، یہاں سے تیلی بل کھاتی پگڈنڈی سامنے کچے گھروں کی طرف جاتی تھی، ملوکاں اسی پر چلی جا رہی تھی، پگڈنڈی کے اختتام پر گھسی جھاڑیوں اور ڈھینگروں کا سلسلہ تھا۔

پھر جیسے ہی ملوکاں نے ایک موڑ کاٹا تو اسے سامنے سے ایک شخص آتا دکھائی دیا۔ ملوکاں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور اپنے راستے پر چلتی رہی البتہ وہ شخص ملوکاں دیکھ کر ایک دم ٹھٹھک کر رکا پھر دوسرے ہی لمحے وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا، ملوکا ٹھٹھک کر رک گئی۔

☆=====☆

دھکا لگنے سے سارنگ جیسے اچانک ہوش میں آ گیا، میراں کا دلکش چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے محو ہو چکا تھا بلکہ اب اس کی جبکہ اہلی کا غصیلہ چہرہ نظر آ رہا تھا، وہ ہڑکراٹھ کھڑا ہوا تھا، اہلی اسے بدستور تندہ نظر دوں سے گھورے جا رہی تھی، بیچارہ سارنگ سمجھا شاید اس سے میراں کے دھوکے میں کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے جبکہ صورت حال اس کے برعکس تھی، اہلی تو خود اس کی طرف مائل تھی لیکن سارنگ کے ہونٹوں سے بے اختیار میراں نام نکلتے ہی اہلی کا وجود رقابت کی آگ سے بھر گیا تھا۔

”یہ میراں کون ہے رے جس کا ابھی تھو نے نام لیا.....؟“ وہ اپنے دونوں ہاتھ پیادوں پر نکائے غار حانہ انداز میں سارنگ کو گھورتے ہوئے بولی تو سارنگ کو صورت کی نزاکت کا علم ہوا۔ تیرکمان سے نکل چکا تھا، اب چھپانا بے سود تھا چنانچہ سارنگ نے آہ

پراسرار منظر پیش کر رہا تھا، ہر سو ویرانی مسلط تھی، اٹلی نے اب تک رونا بند نہیں کیا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپنے روئے چلی جا رہی تھی، اگرچہ سارنگ کو ایک طرف اٹلی پر ترس آ رہا تھا تو دوسری طرف وہ اس سے خائف بھی ہونے لگا تھا، اس کی چھٹی حس رہی تھی کہ اٹلی اس کے لیے کسی بھی وقت مصیبت کھڑی کر سکتی ہے، اس کے یہ آنسو مگر پڑنے کے آنسو بھی ہو سکتے تھے، اس نے یکدم اپنی کپٹل بدلنے کی کوشش کی ہے اور موقع ملنے پر اسے ڈس لے گی لہذا بہتر یہی ہے کہ وہ اس چند لمہ کو ادھر ہی روتا چھوڑ کر آگے نکل جائے۔ یہ سوچ کر وہ چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

ابھی وہ چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اچانک عقب سے اسے اٹلی کی روبانسی آواز سنائی دی۔ ”سارنگ.....! رک جا..... میں آ رہی ہوں۔“

لیکن سارنگ نہیں رکا، وہ بدستور مدہم چاندنی میں ریت پر آگے بڑھتا رہا، اتنے میں اٹلی بھی دوڑتی ہوئی اس کا راستہ روک کے کھڑی ہو گئی اور آنسوؤں بھرے چہرے کے ساتھ ملتجیانہ لہجے میں اس سے بولی۔ ”سارنگ.....! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چل، بیشک مجھے اپنی باندی بنالینا، پر مجھے اکیلا نہ کر کے جا، میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“

مگر سارنگ رکا نہیں اور کوئی جواب دینے بغیر برابر آگے بڑھتا رہا، اٹلی بھی گرتی پڑتی اس کے ساتھ بولی اور بدستور گڑ گڑانے لگی۔

”سارنگ.....! میں نے..... میں نے غصے میں تجھے جانے کیا کچھ کہہ ڈالا دیکھ..... دیکھ مجھے معاف کر دے..... میں قسم کھاتی ہوں کہ تیرا راستہ کھونا کرنے کی کوشش کبھی نہیں کروں گی۔“

اس کی بات سن کر اچانک سارنگ چند لمحے رک کر اس کے چہرے کو گھورتا رہا۔ درشت لہجے میں بولا۔ ”تو نے اگر میرا راستہ کھونا کرنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا کبھی.....؟“ یہ کہہ کر سارنگ آگے بڑھ گیا۔ اٹلی اس کے عقب میں چڑ آ رہی تھی۔

صبح دم وہ سرحد کے قریب کو لمبی قبیلے کی بستی کے قریب پہنچ گئے، یہ بستی تقریباً بڑے خانوں پر مشتمل تھی، یہیچو از عورتوں نے خالص تھری طرز کے لباس زیب تن کر رکھے تھے عورتوں اور لڑکیوں کے رنگ کھلتے ہوئے تھے مگر مردان کے دبلے پتلے اور خاکستری رنگوں کے تھے، وہ ان دونوں کو حیرت سے دیکھنے لگے پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کے گردلوں کا جھوم اٹھا، ان کے قبیلے میں انہی کی طرح دیگر خانہ بدوش بھی تھے۔

سارنگ اور اٹلی نے خود کو میاں، بیوی ظاہر کیا تھا، نیز اپنے متعلق یہی بتایا تھا کہ وہ دونوں راستہ بھٹک کر ادھر آ نکلے ہیں اور درحقیقت ان کا تعلق سرحد پار کے علاقے سے تھا، وہ خود بھی پوندے ہی تھے۔

بستی کے لوگ اسے کھیا (سردار) کے پاس لئے گئے جو ایک خاصے بڑے سرکنڈوں کے جھوپڑے میں اپنی بیوی، بچوں کے ساتھ رہتا تھا، اس کا نام کھڑوں کو لمبی تھا، وہ ایک مونا تازہ اور گھٹھے ہوئے جسم کا مالک شخص تھا، رنگ الٹے لٹوے کی طرح سیاہ تھا، گینڈے جیسی موٹی سی گردن تھی اور سرانڈے کے چھلکے کی طرح بالوں سے بے نیاز تھا، کانوں میں بالے جمبول رہے تھے، آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور ان میں ایک خاص قسم کی چمک بلکورے لے رہی تھی، اس کے گینڈے جیسے جسم پر صرف ایک کھلے بنوں والی واسکٹ اور کھلے پانچوں والی گھیرا دار شلوار تھی، سارنگ کو پہلی نظر میں یہ شخص کسی بستی کے کھیا کی بجائے صحرائی لیٹروں کا سردار محسوس ہوا، وہ چند ٹائیپ گھورتی ہوئی نظروں سے ان دونوں کو دیکھتا رہا پھر اس کی نظریں بالخصوص اٹلی کے چہرے پر جم گئیں، دوسرے ہی لمحے وہ ایک سنسنائی ہوئی سانس بھرتے ہوئے بیک وقت دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے گونجا دیا۔ ”تم دونوں کو حق ہو اور کہاں سے آئے ہو؟“ اسے شاید ابھی تک ان کے بارے میں پوری طرح آگاہ نہیں کیا گیا تھا یا پھر کسی اور مقصد کے تحت ان سے براہ راست معلومات چاہتا تھا۔

”ہم دونوں میاں، بیوی ہیں ادھر سرحد پار (راجستھان) کے ایک پوردائی (گوٹھ) ”گدا“ سے بھٹک کر یہاں آ نکلے ہیں۔“ سارنگ نے مقدور بھر اپنا لہجہ خجاریوں جیسا بنانے کی کوشش کی تھی۔ راجستھان اور تھر میں ویسے ہی خجاریوں کی بہتات تھی اور سارنگ ان کے بچ رہا تھا، سندھ میں آباد ہونے والے زیادہ تر خجاریوں کو سندھی آتی تھی۔ یہی حال راجستھان کے خجاریوں کا تھا، انہیں بھی سندھی آتی تھی یہی وجہ تھی کہ کھڑوں کو لمبی کو سارنگ کی باتوں پر شبہ نہ ہو سکا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے پھر یہی سہی کسر اٹلی کی خجاریوں والی وضع قطع نے پوری کر دی۔

”سائیں.....! ہم دوبارہ واپس اپڑیں دھرتی پر جانا چاہتے ہیں، اگر ہمیں ہماری دھرتی پر پہنچا دیا جائے۔“ سارنگ نے جلدی سے ہاتھ جوڑ کر دوبارہ متجیانہ لہجے میں اسے کہا۔

”تیرا نام کیا ہے بڑے.....؟“ معاً کھڑوں کو لمبی نے سارنگ سے اس کا نام پوچھا۔

”میرا نام ہاتو ہے اور..... اور یہ میری چٹی شرمادیوی ہے۔“ سارنگ نے اپنا اور اٹلی

کا غلط نام بتاتے ہوئے کہا۔

”ہوں.....!“ نکھیا نے ایک بار پھر ان دونوں کو بر ماتی نظروں سے گھورتے ہوئے گونجیلی آواز میں کہا۔ ”سرحد پار اب تمہارا لوٹنا بہت مشکل ہے..... لیکن ناممکن نہیں.....“ دونوں ابھی ہمارے مہمان بن کر رہو، بعد میں کچھ سوچیں گے۔“

سارنگ بے چین سا ہو گیا پھر اپنے چہرے پر پریشانی طاری کرتے ہوئے بولا۔ ”نکھیا جی.....! تیری بڑی مہربانی مگر ادھر میرے ماتا پتا میری بڑی چنتا کر رہے ہوں گے اگر ہم دونوں کو جلدی سرحد پار پہنچا دو تو تیرا احسان کبھی نہ بھولوں گا۔“

اس کی بات سن کر مکھڑوں کو لبی ایک لمحے کو آنکھیں سیکر کر سارنگ کے چہرے کو گور رہا پھر وہ بیل جیسا اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اچھا..... اچھا.....! ٹھیک ہے، دیکھتے ہیں..... کرتے ہیں کچھ تمہارے لئے۔“

سارنگ کو لبی ہو گئی پھر ان دونوں کو جھونپڑی کے ایک مہمان گوشے میں جگہ دے دی گئی۔ ان دونوں کو بکری کا تازہ دودھ اور مکھن چڑی جوار کی روٹی اور ساگ دیا گیا تھوڑے ابلے ہوئے چاول بھی تھے، ان دونوں نے ڈٹ کر کھانا کھایا، اس کے بعد انہیں پیالوں میں چائے دی گئی، سارنگ ان بنجاروں کا رہن سہن دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ بیشک یہ خانہ بدوش تھے مگر جہاں بھی ڈیرا ڈالتے تھے، پورے آرام و سکون سے رہتے تھے اور ضرورت کی ہر شے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ شکم سیر ہوتے ہی سارنگ اور ابلی کو نیند نے آیا، چار پائیوں کا کوئی تصور نہ تھا البتہ فرش پر تین چار رلیوں کو جوڑ کر درسی سی بنائی ہوئی تھی، دو تین میلے سے بوسیدہ تکیے بھی دھرے تھے، دونوں ذرا ذرا فاصلے پر لیٹتے ہی بے سدھ ہو کر گہری نیند میں ڈوب گئے۔

☆=====☆

سدھوراں اور پرویز کا بڑی سادگی سے نکاح پڑھوا دیا گیا۔ سدھوراں نے حالات سے سمجھوتہ کرنا سیکھ لیا تھا اور یہ بھی درست تھا کہ اس نے اپنے ہونے والے بچے کی خاطر ہی پرویز سے شادی کرنا گواہ کیا تھا، وہ اپنے رقبوت کی سزا اس معصوم کو نہیں دینا چاہتی تھی ورنہ اس کے دل و دماغ میں ابھی تک اپنے محبوب سانول کی شبیہ بسی ہوئی تھی، سدھوراں کا خیال تھا کہ وہ گھر بار میں مصروف ہو جائے گی تو سانول کو فراموش کر دے گی مگر پرویز سے شادی کے بعد تو سانول کا خیال اسے مزید پریشان کرنے لگا تھا، سانول کو فراموش کرنا اب اس

کے اختیار میں نہ رہا تھا۔

بہر طور پر پرویز اسے دلہن بنا کر اپنی قیوم آباد والی رہائش گاہ میں لے آیا، ڈاکٹر فوزیہ نے سدھوراں کے منع کرنے کے باوجود اسے چند تو لے سونے کا زیور بھی بنا کر دیا تھا اور چیز بھی دیا تھا جو ایک سوز کی دین میں لا دیا گیا تھا، موسیٰ، سدھوراں کے ساتھ گئی تھی جو گھٹنے دو گھٹنے بعد لوٹ آئی تھی۔

سدھوراں اپنے شوہر پرویز کے ساتھ شام 9 بجے کے قریب اس کے گھر پہنچی، وہ دو کمروں کا ایک عام سا گھر تھا، ہر شے ابتر حالت میں تھی، موسیٰ نے ڈیڑھ دو گھنٹے وہاں رہنے کا حق ادا کرتے ہوئے گھر کی حالت قدرے بہتر کر دی تھی پھر جہیز کا سامان ترتیب وار رکھا گیا، سدھوراں نے محسوس کیا تھا کہ پرویز کا گھر بالکل خالی خالی سا تھا، اس کے جہیز کا سامان رکھتے ہی خالی گھر اب بھرا بھرا محسوس ہونے لگا تھا۔

۱۰ جملہ عروسی کے نام پر ایک کمرے کو پہلے ہی سے سجا رکھا تھا، سدھوراں اپنے کا مدار دلہنوں والے ریشمی سوٹ میں بڑی سی پلنگ نما چار پائی پر گٹھڑی بنی بیٹھی تھی، اداس چاندنی مثل.....!

رات گیارہ بجے کے قریب پرویز چند مہمانوں اور دوستوں کو رخصت کرنے کے بعد صحن کے دروازے کو کنڈی چڑھانے گیا تھا۔ سدھوراں بت بنی پلنگز یا پر بیٹھی تھی، نئی نویلی دلہنوں والے ارمانوں سے بے نیاز..... نہ اس کی سماعتیں اپنے مجازی خدا کی چاپ سننے کے لیے بے چین تھیں اور نہ دل میں بے طرح دھڑکن تھی، نہ اس کی اداس آنکھوں کی حسیل میں اپنے مجازی خدا کی آمد کے منتظر کنول کھلے تھے اور نہ ہی اس کے حنائی لبوں پر دلہنوں والی ہلکی سی مسکان تھی، جوان وجود میں کوئی پلچل نہ تھی، وہ زندہ لاش کی مثل بیٹھی تھی۔

کمرے میں نیوب لائٹ روشن تھی، دروازہ بھڑا ہوا تھا، سدھوراں کا سر جھکا ہوا تھا۔ دفعتاً قدموں کی چاپ ابھری مگر سدھوراں کے اندر کوئی پلچل نہ تھی پھر کوئی اس کے قریب آ کر چار پائی پر دھنس سا گیا، دلہنوں والا تقاضا نہیانا مقصود تھا اسی لئے سدھوراں نے اپنا سر جھکا رہنے دیا تھا تب کوئی ہولے سے کھڑکا رہا پھر اپنے ایک ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی، سدھوراں بہر حال مشرقی عورت تھی، اس کا چہرہ اٹھا تو پلکیں جھک گئیں پھر اسی لمحے بھاری کھرکھراتی ہوئی آواز ابھری۔ ”تو واقعی بہت کھوب صورت ہے، تیرا چاند چہرہ دیکھ کے تو میں جیسے جوان ہو گیا ہوں۔“ سدھوراں کی جگہ کوئی اور دلہن ہوئی تو اپنے مجازی خدا کے محبت انگیز یہ الفاظ اس کے نازک وجود کو گرما دیتے اور دل دھڑکنے لگتا مگر سدھوراں

مومن جو دڑو کے اداس کھنڈر کی طرح: بتا ثرا اور خاموشی بیٹھی رہی۔

اس کی اداسی گرگ باراں دیدہ پرویز نے فوراً بھانپ لی۔ وہ بولا۔ ”دیکھ! میرے بے شک تجھ سے عمر میں بڑا ہوں مگر تجھ سے محبت کرتا رہوں گا اور تیرا پورا خیال رکھنے کی کوشش کروں گا۔“ وہ بولے جارہا تھا۔ سدھوراں کو احساس ہوا پرویز ایک بھلا آدمی ہے اگرچہ اس کی خاموش اداسی سے غلط فہمی ہو رہی تھی، وہ سوچنے لگی، یہ کیا عجیب انسان ہے اپنے عجیب گنوار ہا ہے اور میرا اتنا بڑا عجیب یکسر فراموش کر رہا ہے تب سدھوراں نے فیصلہ کیا کہ ایسے فرشتہ صفت انسان کے ساتھ ”دل داری“ نہ کرنا گناہ عظیم ہے اور تب وہ قدرے مسکرا کر اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

”یہ بات نہیں..... بس ویسے ہی ماں، بچو یاد آرہے تھے۔“ اس نے بہانہ تراشا۔ پرویز کا جیسے دل خوش ہو گیا، سدھوراں کا خیال تھا کہ پرویز اس سے ہونے والے بچے کے بارے میں ضرور پوچھتا چھ کرے گا مگر اس نے ایسا کوئی ذکر نہ چھیڑا۔ بالآخر سدھوراں نے ہی ذرا جرأت کر کے پوچھ ہی لیا۔ ”ایک بات بتاؤ گے؟“

”ہاں..... ہاں.....! پوچھ کیوں نہیں.....“ وہ خوشی سے بولا۔ وہ اس قدر حسین اور جوان دلہن پر فریفتہ ہو گیا تھا۔

”تو نے میرے سے شادی کیوں کی..... تجھے پتہ بھی تھا کہ میں ایک بچے کی.....“

”سدھوراں.....! آج کے بعد مجھ سے ایسی کوئی بات نہ کرنا۔“ پرویز ایک مصنوعی خفگی سے بولا مگر پھر دوسرے ہی لمحے لہجے کو نرم کر کے بولا۔ ”سدھوراں.....! ٹوچو سے ایک وعدہ کر کہ پچھلی تمام باتیں بھول جائے گی..... کرو وعدہ.....!“

سدھوراں نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔

”نہیں.....! منہ سے بول۔“ اس نے بچوں کی طرح ضد کی۔

”وعدہ..... پھر میری ایک آخری بات کی تسلی کر دے۔“

”ہاں بتا.....!“

”تو میرے ہونے والے بچے کو اپنا نام دے گا نا.....؟“

جواباً کمرے کے محدود ماحول میں خاموشی سی چھا گئی، سدھوراں کے اندر وسوسلے کے خوابیدہ سنبولے بیدار ہو کر اسے ڈسنے لگے، سدھوراں کی نگاہیں پرویز کے گم صم چہرے پر جمی ہوئی تھیں، وہ بڑی بے چینی سے اس کی بات سننے کی منتظر تھی۔

”دیکھ سدھوراں.....! میری طرح تیرے کو بھی حقیقت پسند ہونا پڑے گا۔“ اچانک

پرویز سنجیدہ لہجے میں بولا تو جانے کیوں سدھوراں اس کے ایک ایک کی بد لے بد لے سے لہجے پر بے چینی ہو گئی اور بدستور مستفسر انداز نگاہوں سے اس کا چہرہ ٹکنے لگی۔

”دیکھ سدھوراں.....! بے شک تو ایک جوان لڑکی ہے مگر تیرے عیب نے تجھے ایسے داغدار کر دیا ہے جیسے شن چاند کے دامن میں بدنما گڑھا آتا ہے، ہم دونوں کی شادی بے شک ہم دونوں کی ضرورت سمجھی مگر ہمیں ضرورت سے زیادہ ایک سمجھوتے کے ساتھ زندگی گزارنی ہوگی۔“ وہ اتنا کہہ کر تھما۔ سدھوراں اس کا چہرہ ٹکنے لگی، اسے اب اس کی باتیں عجیب سی محسوس ہو رہی تھیں اور اس کا رویہ اچانک ہی بدل گیا تھا۔

”سارے مرد ایسے ہی ہوتے ہیں اپنے مفاد کی بھینٹ پر ایک مجبور عورت کو چڑھانے والے۔“ اس نے بخبی سے سوچا مگر چپ رہی۔ لمحہ بھر توقف کے بعد اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

”ہماری زندگی بھی کچھ لو اور دو کے ساتھ ہی نبھ سکتی ہے۔“ وہ بولا۔ اور سدھوراں نے حیرت سے سوچا۔ ”یہ اس سے کیا لینا چاہتا ہے؟“

”اس طرح ہماری زندگی بھی ہنسی خوشی گزرے گی، اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ تو نے مجھ سے شادی ہی اس لئے کی ہے کہ تجھے باعزت زندگی گزارنے کا موقع ملے اور سب سے اہم بات یہ کہ تیرے ہونے والے بچے کو باپ کا نام ملے، معاف کرنا سچی بات شروع میں بڑی لگتی ہے مگر اس کے نتائج برے نہیں ہوتے، تیرے کو میں یہ کڑوے گھونٹ اس لئے پلا رہا ہوں تاکہ بعد میں تو میرے ساتھ اور اپنے ہونے والے بچے کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزارے۔“ وہ گہرے لہجے میں اتنا کہہ کر خاموش ہوا۔

سدھوراں کے دل و دماغ میں مہیب سناٹوں کی سائیں سائیں گونجنے لگی اور پھر اس نے بے اختیار پوچھا۔ ”تت..... تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”میں تم سے جو کچھ چاہتا ہوں، وہ میں بعد میں تمہیں بتاؤں گا۔“ پرویز نے اسرار ا لہجے سے لہجے میں کہا اور خاموش ہو گیا۔ سدھوراں بری طرح الجھن کا شکار ہو گئی تھی۔

☆=====☆=====☆

سدھوراں کو بیاہ کر رخصت کرنے کے بعد ڈاکٹر فوزیہ اب خود کو بالکل ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی تھی مگر جہاں داد کے فون نے اسے بے چین ضرور کر دیا تھا، اسے اس بات کی بھی حیرت ہو رہی تھی کہ بھلا جہاں داد کو اس کے فون نمبر کا کیوں کر پتہ چلا تھا پھر اس نے سوچا کہ

یہ کوئی ایسی مشکل بات نہ تھی، آخر کو وہ ایک مشہور سرجن کی بیٹی تھی اور خود بھی ڈاکٹر تھی۔ اسے یہ بھی خیال آیا کہ اگر جہاں داد نے اس کا فون نمبر کسی طرح حاصل کر لیا تھا تو یہ فون اس کی کوشی کا پتہ بھی جانتا ہوگا، وہ اب محتاط ہو کر رہنا چاہتی تھی اور اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ اگر جہاں داد نے اسے مزید تنگ کرنے کی کوشش کی تو وہ اس کے خلاف پولیس رپورٹ لکھوا دے گی۔

سدھوراں کو رخصت کئے گئی روز بیت چکے تھے، پہلوان دودھ والے کی بیوی کو اب ڈاکٹر فوزیہ کے پاس آنے جانے لگی تھی، اس کے ذریعے اسے سدھوراں کی خبریں مل رہی تھیں البتہ ڈاکٹر فوزیہ، موسیٰ کو بھی چند تھکے تحائف دے کر اسے پرویز کے گھر بھیجتی تھی، بہر طور ڈاکٹر فوزیہ اب سدھوراں کی طرف سے بالکل مطمئن اور بے فکر تھی۔ ایک روز ڈاکٹر فوزیہ نے فون اینڈ کیا۔

”جہاں داد بول رہا ہوں ڈاکٹر فی صاحبہ!“ دوسری طرف سے ایک کراہٹ ابھری۔

”تم..... تم“ نے مجھے دوبارہ فون کرنے کی جرأت کیسے کی؟“ آواز پہچان کر ڈاکٹر فوزیہ نے غصے سے دانت پس کر کہا۔

”ابھی صرف زبانی کلامی جرأت کی ہے۔“ دوسری طرف سے جہان داد کی زہرا آواز ابھری۔ ”اگر تم نے مجھے سدھوراں کا پتہ نہیں بتایا تو میں ایسی جرأت کر ڈالوں گا کہ ساری زندگی بچھتا رہو گی۔“

”یوشٹ اپ.....!“ ڈاکٹر فوزیہ غصے سے دھاڑی۔ اس وقت وہ تنہا تھی، اس نے ماما، پاپا ابھی کلینک سے نہیں لوٹے تھے، موسیٰ بھی کہیں کام سے گئی ہوئی تھی۔

”آں..... انا بابا..... انا..... غصہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ڈاکٹر فی صاحبہ!“ جہان داد نے استہزاء سے لہجے میں کہا۔ ”تجھے صرف سدھوراں کا پتہ چاہئے اور بس..... کہاں..... وہ.....؟“

ڈاکٹر فوزیہ کو حیرت ہوئی کہ جب اس شخص کو میرے فون نمبر کا علم ہو چکا تھا تو اب اسے اب تک یہ یوں نہیں پتہ چل سکا تھا کہ سدھوراں تو اس کے پاس رہتی تھی اور ان کی شادی بھی ہو چکی ہے پھر اس نے سوچا کہ کیونکہ وہ اسے پولیس کے حوالے کرنے کی دھمک دے چکی تھی لہذا ہو سکتا ہے جہاں داد نے یا اس کے کسی کارندے نے ابھی اس کی کوشی قریب پھٹکنے کی کوشش نہ کی ہو، بہر طور اس نے اپنے طیش پر قابو پاتے ہوئے آخری

جہان داد کو سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو مسٹر!“

”خادم کو جہاں داد کہتے ہیں۔“

”مجھے تمہارے نام سے کوئی غرض نہیں، ایک بات کان کھول کر سن لو.....! سدھوراں اس وقت کہاں ہے، یہ میں نہیں جانتی، میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ.....!“ ڈاکٹر فوزیہ کی آواز حلق میں ہی دب گئی کیونکہ دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر فوزیہ نے بھی بیزار سی سے ریسیور رکھ دیا، وہ جانتی تھی کہ اب دوبارہ جہاں داد اسے فون کرنے کی کوشش نہیں کرے گا، وہ چند ثانیے صوفے پر بیٹھی گہرے سانس لے کر اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتی رہی، ابھی اس نے صوفے سے اٹھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک دوبارہ فون کی گھنٹی بجی، وہ چونک کر فون کو تیکنے لگی پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ریسیور کانوں سے لگا کر ”ہیلو“ کہا۔

”کیا بات ہے غصے میں لگ رہی ہو.....! ہاسپٹل میں آج کوئی بد مزگی تو نہیں ہو گئی؟“ دوسری طرف سے ڈاکٹر جواد احمد کی چپکتی ہوئی آواز ابھری تو ڈاکٹر فوزیہ کے حلق سے بے اختیار ٹھنڈی سانس خارج ہو گئی اور تب اس نے ڈاکٹر جواد کو جہاں داد کے فون سے آگاہ کر دیا۔

دوسری طرف سے لمحہ بھر خاموشی کے بعد ڈاکٹر جواد کی اس بار قدرے پُر تشویش آواز ابھری۔ ”فوزی.....! میں نے تم سے کہا تھا ناں سدھوراں والا معاملہ تمہارے گلے میں اٹک سکتا ہے، دیکھ لو، اب وہ ادبائش ریگستان سے یہاں تک تمہارے پیچھے آ گیا۔“ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ جواد ڈاکٹر فوزیہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”تمہارا نہیں تو میرا تو وہ کچھ بلکہ بہت کچھ بگاڑ سکتا ہے ناں.....؟“ ڈاکٹر جواد کی آواز ابھری۔

فوزیہ نے قدرے چونک کر پوچھا۔ ”کیا مطلب.....! وہ بھلا تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہے؟“

”فوزی.....! تم میرا سب کچھ ہو، تمہارا نقصان میرا ہی نقصان ہے، تم نے اس ڈاکٹر جواد سے دشمنی مول لے کر اچھا نہیں کیا۔“ ڈاکٹر جواد نے بوجھل سے لہجے میں کہا۔

فوزیہ کے لبوں پر ہلکی سی مخمور مسکراہٹ پھیل گئی تاہم دوسرے ہی لمحے وہ بولی۔ ”جواد.....! تم مجھے بے حوصلہ بنا رہے ہو؟“

”یہ بات نہیں فوزی ڈیر.....!“ ڈاکٹر جواد نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”دراصل میں اور جہاں داد جیسے اوباش لوگوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، دشمنیاں ان کا کھیاں۔ جبکہ ہم جیسے لوگوں کے لیے ایک روگ..... بہر حال تمہیں بالکل ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ذرا محتاط ہو کر آیا جایا کرو بلکہ ہو سکے تو ایک مسلح گارڈ اپنے ساتھ رکھ لو۔“

”تم کس مرض کی دوا ہو پھر.....؟“ ڈاکٹر فوزیہ نے ماحول کے بوجھل پن کو دور کرنے کی غرض سے پُر شوخ لہجے میں کہا۔

دوسری طرف سے ڈاکٹر جواد کی فدیہ یا نہ سی آواز ابھری۔ ”ارے بھی ہم ناچیز تو ہیں۔ آپ کے باڈی گارڈ ہیں۔“

”ایک ڈاکٹر کو یہ لوفر پن زیب نہیں دیتا جناب!“ فوزیہ نے اپنی ہنسی ضبط کر ہوئے کہا اور دوسری طرف سے ڈاکٹر جواد نے ہلکا سا قہقہہ بلند کیا پھر اگلے دن چھٹی ہو کی وجہ سے سی دیو جانے کا پروگرام بننے لگا۔

اگلے دن شام پانچ بجے ڈاکٹر جواد اپنی ٹویوٹا کرولا میں ڈاکٹر فوزیہ کی کوٹھی پر آیا، وقت ڈاکٹر فوزیہ کے کما، پاپا یعنی سرجن وصی شاہ اور ڈاکٹر خورشید امان موجود تھے، وہ دونوں بھی ڈاکٹر جواد کو پسند کرتے تھے، اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر جواد ایک بڑے بزنس کی اکلوتی اولاد تھا اور اسی طرح ان دونوں کی انڈراستینڈنگ کے حوالے سے انہوں نے فیصلہ محفوظ کر رکھا تھا۔ بہر طور ڈاکٹر جواد اور ڈاکٹر فوزیہ گاڑی میں بیٹھ کر سیویو کی طرف پڑے۔

شاہراہ فیصل کے بعد جواد نے کلاہ کو کورنگی روڈ کی طرف موڑا، دو تین معرود چورنگیاں کر اس کرنے کے بعد جب ان کی کار نسبتاً ایک ویران سڑک پر پہنچی تو اچانک کے عقب سے ایک سفید رنگ کی لینڈ کروزر آندھی طوفان کی طرح نمودار ہو کر قریب گزر گئی اور آگے جا کر ڈرافٹ فیل پر روڈ بلاک کر کے کھڑی ہو گئی، ڈاکٹر جواد نے جلدی بریک پیدل پر پاؤں کا دباؤ ڈال دیا، ٹائروں کے زور سے چرچرانے کی سمع خراش ابھری اور کار سامنے آڑی ترچھی کھڑی لینڈ کروزر کے قریب قریب جا کر ایک جھٹکے سے گئی، اس اچانک جھٹکے سے ڈاکٹر فوزیہ کا سر سامنے کار کے ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے نکلا۔

بچا۔

لینڈ کروزر کے دو اطراف کے دروازے کھلے اور چار پانچ مسلح افراد جارحانہ اند میں ان کی کار کی طرف بڑھے۔

اس صورت حال پر وہ دونوں بوکھلا سے گئے تھے۔

ڈاکٹر جواد احمد اور ڈاکٹر فوزیہ کی خوفزدہ نظریں ان پانچوں مسلح افراد پر جم گئی تھیں جو خاصے جارحانہ انداز میں گئیں تھے ان کی کار کے قریب آرہے تھے۔ ایک بھاری بھر کم سا شخص بھی انہیں لینڈ کروزر کے اندر اگلی نشست پر براجمان نظر آیا تھا، جسے ڈاکٹر فوزیہ اچھی طرح پہچان چکی تھی۔

”چلو بابا..... ڈاکٹر فی صاحبہ.....! باہر نکلو!“

دو افراد ڈاکٹر فوزیہ کی کوکھ کی کے قریب آئے تو ان میں سے ایک نے اسے گھورتے ہوئے درشتی سے کہا جبکہ باقی تین افراد دوسری طرف گھوم کر ڈاکٹر جواد پر نالیں سیدھی کر کے اسے گھورنے لگے۔ مقصد اسے اپنی جگہ پر بیٹھنے پر مجبور کرنا تھا۔

”کون ہو تم لوگ!“ ڈاکٹر فوزیہ نے قدرے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ حالانکہ وہ جان چکی تھی کہ یہ کون ہیں؟ اس شخص نے جواب دیئے بغیر ایک ہاتھ سے دروازہ کھولا اور پھر بڑی بیدردی سے فوزیہ کو بازو سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔

”اے اے..... یہ کیا کر رہے ہو..... تمہیں شرم نہیں آتی۔“ ڈاکٹر جواد نے تملاکر کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکلنے کی کوشش کی مگر اس کی سمت کھڑے ہوئے تینوں افراد نے اسے دروازہ کھولنے نہ دیا۔ ادھر وہ دونوں چیتھی چلاتی ڈاکٹر فوزیہ کو گھسیٹنے کے انداز میں بازو سے پکڑ کر لینڈ کروزر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اب ڈاکٹر جواد بے حس خاموشی تماشا بن کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ وہ پھرتی سے برابر والی نشست کے کھلے ہوئے دروازے سے نکل کر ان دونوں کی طرف لپکا جو ڈاکٹر فوزیہ کو لئے لینڈ کروزر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اسی اثناء میں باقی تینوں مسلح افراد نے ڈاکٹر جواد کے قریب آ کر اپنی گن کاٹھوس اٹھی کند اس کے سر پر رسید کر دیا۔ ڈاکٹر جواد کی پیشانی تڑخ گئی۔ وہ سڑک پر تورا کر گرا اور پھر یہ سب لوگ فوزیہ سمیت لینڈ کروزر میں سوار ہوئے اور آنا فنا نا وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔

☆=====☆=====☆

اس اجنبی شخص کو اپنا راستہ روکے کھڑے دیکھ کر ملوکاں بھی رک چکی تھی۔ وہ ایک اجنبی شخص تھا۔ رنگت اس کی مجلسی ہوئی تھی۔ البتہ ذیل ڈول کے لحاظ سے ایک صحت مند شخص تھا۔ چہرے پر عجیب سی کرنٹنگی کھنڈی ہوئی تھی۔

”کیوں ڈرے..... کون ہے تُو..... میرا راستہ کیوں روک کر کھڑا ہے..... ہٹ

ڈالوں گی۔“ ملو کاں اس کی خوش فہمی کو بیدردی سے ذبح کرتی ہوئی غصے سے آگے بڑھ گئی۔
آچہ خان ہکا بکا سا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔
ملو کاں غصے میں پھسکتی ہوئی گھر لوٹی، مگر اس نے ماں سے آچہ خان کا ذکر کرنا مناسب

نہ سمجھا۔

”ملو.....! کدھر چلی گئی تھی تُو..... اتنی دیر کہاں لگا دی؟“ اس کی ماں مائی عجیباں نے

پوچھا۔

”نہر پر دریر ہو گئی۔ عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں۔ میں بھی وہاں ان سے باتیں کرنے
کھڑی ہو گئی تھی۔“ ملو کاں نے جھوٹ بولا اور پھر گھڑا رکھ کر وہ اندر کوٹھڑی میں پہنچی۔ میلی
چمک رلی پر لیٹ گئی۔ سانول کی بیماری اور اس کی بے رخی نے ملو کاں کو آزدہ اور چڑچڑا
سا کر دیا تھا۔ راستے میں آچہ خان سے ملاقات نے اسے مزید چڑچڑا کر دیا۔

سرشام مٹھل کھیتوں سے تھکا ہارا گھر لوٹا۔ ملو کاں کو اپنے باپ سے بہت محبت تھی۔ اس
نے اسے چائے بنا کر دی۔ بیٹے سے کل کی تلخ کلامی پر گھر کی فضا کھنچی کھنچی سی تھی۔ مائی عجیباں
باپ بیٹے کی ناراضگی کی وجہ سے خاصی پریشان تھی۔ ملو کاں رسوئی سے نکل کر اپنے شوہر مٹھل
کے پاس جا کر چار پائی پر بیٹھ گئی۔

”خالقو کے پیو..... ہمیں اپڑیں پٹ خالقو کی اب دوسری سی کردینی چاہئے۔“
عجیباں نے شوہر سے کہا۔

مٹھل جیسے ادھار کھائے بیٹھا تھا، خالقو کے ذکر پر بھنا کر بولا۔ ”تیرے پٹ میں
کوئی گن ہو تو میں اس کی شادی کا سوچوں، بھلا ایک کھٹونو الہ توڑ اور کام چھوڑ کو کون اپڑیں
دی دے گا؟“

”کر لے گا کام بھی..... بیوی سر پر آئے گی تو کام بھی ڈھونڈ لے گا۔“

”پہلی بیوی کو تو سنبھال نہ سکا۔ پتہ نہیں وہ بیمار عورت میرے دوسرے پٹ سارنگ کو
بھی کھا گئی۔ جانے کدھر بھٹک رہا ہوگا سارو.....“ مٹھل آزدگی سے بولا تو عجیباں بھی اپنے
بیٹے سارنگ کی جدائی پر دکھی نظر آنے لگی۔ اس اثناء میں خالقو بھی کھنکھارتا ہوا اندر داخل ہوا۔
مٹھل نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ پھر ناگواری سے اپنا منہ پھیر کر چار پائی سے اٹھتے
ہوئے بیوی سے بولا۔ ”عجیباں.....! میرا حق تیار کر کے لے آ.....“ یہ کہہ کر وہ اندر جھکی کے
کوٹھڑی نما گوشے میں چلا آیا۔

خالقو حسب معمولی میلی چمک اور بغیر بنٹوں والی صدری اور تہبند پہنے تھا۔ اس کے

پرے.....“ ملو کاں نے اسے مکروہ مسکراہٹ سے گھورتے ہوئے پا کر درشتی سے کہا۔
”تُو مٹھل ہاری کی دھی ملو کاں ہے نا..... اور خالقو تیرا ہی بھائی ہے؟“ اس ادھر
شخص نے گہری نظروں سے اس کا سر تا پا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... تیرے کوئی اعتراض ہے..... ہٹ راستہ چھوڑ میرا۔“ ملو کاں نے جواب
تڑ سے کہا اور پھر خود ہی راستہ بدل کر اس کے پاس سے گزرنے لگی تو اچانک اس شخص نے
اپنا ایک بازو سیدھا کر کے پھر اس کا راستہ روک دیا۔ اب ملو کاں کا بھی ماتھا ٹھنکا..... تاہم وہ
خوفزدہ بالکل نہ ہوئی البتہ اس کے قدم ضرور جم گئے تھے۔

”اڑے پھرو.....! تُو آخر ہے کون، جو اس طرح میرا راستہ روکے ہوئے ہے؟“
ملو کاں نے اس کی بڑی بڑی مونچھوں کی طرف دیکھتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔

”میرا نام..... آچہ خان ہے، ہوٹل کا مالک ہوں میں..... گوٹھ میں سب سے بڑا
ہوٹل میرا ہی ہے۔“ وہ بولا۔ ”پڑو ناراض کیوں ہوتی پڑی ہے پاپا..... یہ لے تیرا راستہ
چھوڑتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اس کے راستے سے ہٹ گیا۔ ملو کاں..... اس کے منہ سے ”آچہ
خان“ کا نام سن کر ایک لمحے کو بری طرح ٹھنکی۔ اس کی فطری سرکشی سراٹھانے لگی تو اس نے
قدرے تیز نظروں سے آچہ خان کے چہرے کی طرف گھورتے ہوئے ہونٹ بھیجنے کر کہا۔
”ہوئی تو تیرا نام آچہ ہے۔“

”ہاؤ..... تیرا پو مٹھل اور چاچا سکھو روزانہ میرے ہوٹل میں آکر چائے پیتے اور
تاش کی بازی جماتے ہیں اور تیرا وڈا ادا خالقو تو میرا گہرا یار ہے۔“ وہ ملو کاں کو اپنا نام
دہراتے دیکھ کر کسی قدر خوش فہمی سے بولا۔ پھر یہی خوش فہمی اس کے لبوں تک بھی آگئی اور
اگلے ہی لمحے وہ ملو کاں کے چہرے کی طرف معنی نظروں سے دیکھتے ہوئے قدرے خوش
امیدی سے بولا۔ ”لگتا ہے میرا ذکر گھر میں ہوتا رہتا ہے۔“

”ہاں..... ادا خالقو نے تیرا ذکر پیو سے کیا تھا؟“ ملو کاں کے لہجے میں گہرے طنز کی
کاٹ تھی۔

آچہ خان اس بات کو بھی اپنی خوش فہمی پر محمول کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو بہت اچھی
بات ہے۔“

”ہاں..... مگر پیو کے سامنے تجھ بڑھے کے ذکر پر ادا خالقو، پیو کے ہاتھوں مار کھاتے
کھاتے بچا تھا اور اب تُو بھی ذرا بچ کے رہنا میرے پیو سے..... کہیں تُو بھی نہ پٹ جائے اور
..... آج کے بعد دوبارہ میزے آگے آنے کی کوشش کی تو گھڑا مار کے تیرا یہ تر بوز جیسا سر بچاڑ

ایک ہاتھ کی مٹھی میں بیڑی کا ٹوٹا دبا ہوا تھا جیسے اس نے چٹکی بجا کر رکھ جھاڑتے ہوئے آخری کش لیا پھر دور پھینکتا ہوا چار پانی پر یوں گرا جیسے بڑا محنت کا کام کر کے آیا ہو۔

”پٹ.....! تو سارا دن کدھر ہوتا ہے۔ روٹی کھانے تو آ جایا کر..... چل منہ ہاتھ دھو، میں تیرے لیے روٹی لاتی ہوں۔“ عجیبیاں نے کہا۔

خالقو..... ماں کی طرف دیکھتے ہوئے لٹھ مار لہجے میں گویا اندر کوٹھڑی میں حقے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے باپ کو سنانے کی غرض سے قدرے بلند آواز میں بولا۔ ”امڑ.....! کیا مجھے باہر روٹی نہیں مل سکتی؟ بہت یار دوست ہیں میرے، مجھ پر جان دیتے ہیں۔ یہ دیکھ کتنے روپے ہیں میرے پاس۔“ خالقو نے اپنی صدری کی اندرونی جیب سے چند میلے مگر بڑے بڑے نوٹ نکال کر ماں کو دکھائے۔ ”میں عقل عجیبیاں نوٹ دیکھ کر بیٹے پر صدقے واری ہونے لگی وہ کبھی شاید اس کا بیٹا کماؤ پوت بن گیا۔ وہ اس کی بلائیں لیتے چوئے حیرت آمیز خوشی سے بولی۔

”میں صدقے تھیاں.....! پٹ..... کیا تجھے کام مل گیا ہے کوئی؟“

اندر سے مٹھل بھی خلاف توقع چہرے پر حیرت سینے محن میں آیا اور ماں بیٹے کے ہاتھوں میں روپے دیکھ کر غیر یقینی نظروں سے اپنے بیٹے خالقو کا چہرہ تنکے لگا پھر اسی لہجے میں بولا۔ ”تیرے کو کون سا کام مل گیا ہے بڑے، ذرا میں بھی تو سنوں؟“ اس کے لہجے میں تشکیک آمیز الجھن تھی۔

خالقو باپ سے نظر چرانے لگا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے ڈھٹائی سے بولا۔ ”بس مل گیا تھا ایک کام..... بوریاں اٹھائی تھیں کھاد کی..... ٹرک پر لادی تھیں۔“

”اڑے، خالقو کے پیو، تو نے کیا تھانیداری شروع کر دی..... ہڈ مار کے آیا ہے.....! ابراہن خالقو..... کوئی چوری نہیں کی ہے، نا کرے کام تو تجھے اعتراض..... اب چار پیسے کر لایا ہے تو تو نے پوچھ کچھ شروع کر دی۔“ حسب معمول مائی عجیبیاں نے شوہر کے آگے خالقو کی حمایت میں ہاتھ نہچا کر کہا تو بارہاں دیدہ مٹھل نے اپنے نکھو بیٹے کی طرف گھور کر دیکھا۔ اسے بیٹے کی پیشانی پر جفاکشی میں سنبھنے والے پسینے کی ایک لکیر تک نظر نہ آتی تھی۔

”خوب جانتا ہوں۔ یہ روپیہ کسی سے اینٹھ کر لایا ہے اور..... آج نہیں روز.....! ہے۔“ مٹھل نے طنز یہ لہجے میں کہا۔

”کہیں سے بھی لایا ہو..... یہ تیرا تو محتاج نہیں ہے نا..... تیری سخت مزاجی کی وجہ سے میرے پٹ نے دو پہر کی روٹی بھی گھر پر کھانی چھوڑ دی ہے، بس رات کا ہی تو بچا کھچا کھا

ہے گریب.....“ مائی عجیبیاں نے کہا اور آدھے نوٹ اپنے گریبان میں اڑس لئے۔

”تیرا پٹ دو پہر کی کھانا اس مردود آچر خاں کے ہوٹل میں کھاتا ہے۔ مجھے یقین ہے اس نے ہی اسے یہ روپے دیئے ہیں..... تاکہ اس کے ذریعے میرے گھر کے اندر نقب لگ سکے۔“ مٹھل نے زہریلے لہجے میں کہا۔ پھر گویا اٹل لہجے میں خالقو سے بولا۔ ”ایک بات یاد رکھنا خالقو.....! تو جس لالچ کی کھاتر آچر خان کا ”راتب“ کھا رہا ہے ناں..... تیرا وہ ذلیل مقصد میں کبھی پورا نہیں ہونے دوں گا۔“

”امڑ.....! پو کو سمجھالے مجھ نے ایسے لہجے میں بات نہیں کیا کرے ورنہ.....؟“

”ورنہ کیا ڈرے..... کیا کر لے گا تو میرا..... ہیں.....! میری بوڑھی ہڈیوں میں ابھی اتنا دم ہے..... تو میرے سامنے..... ذرا!.....“ مٹھل ایک دم چراغ پا ہو گیا، ایسے میں عجیبیاں، شوہر کے آگے آگئی۔

”ہے گھوڑا..... کیا قہر کرتا ہے..... جو ان پٹ کے ساتھ ایسا بولتے ہیں۔“

”تو پھر اپریں جو ان پٹ کو سمجھالے، خبردار جو اس خبیث آچر خان کا اس گھر میں ذکر کیا ہو۔“ مٹھل نے طیش میں آ کر کہا اور غصے میں پاؤں پٹختا ہوا دوبارہ اپنی کوٹھڑی میں جا گھسا۔ اتنے میں ملوکاں اس کے لیے حقہ تازہ کر لائی اور ساتھ ہی سلور کے ایک کٹورے میں پانی بھر لائی۔ مٹھل نے چند گھونٹ پانی کے پیئے۔ مارے غیظ و غضب کے وہ کپکپانے لگا تھا پھر اس نے جیسے ہی حقے کا ایک کش لیا تو اسے شدید کھانسی کا دورہ پڑ گیا اور وہ کھانستے کھانستے بے حال سا ہو گیا۔

ملوکاں کو اپنے بوڑھے کامی باپ پر ترس آنے لگا تھا، اس نے یکدم حقہ پرے کیا اور باپ کو سنبھالنے لگی پھر آدھ بھرا کٹورا اس کے لرزتے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ”پیو.....! تو غصہ نہ کر..... کیوں خود کو ہلکان کرتا ہے، کتنے دے ادا خالقو اور امڑ کو.....“

مٹھل کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا، ملوکاں کا دل کٹ سا گیا، اس نے فوراً اپنی چادر کے کونے سے بوڑھے باپ کی نمناک آنکھوں کے گوشے صاف کئے۔

”میں سارا دن باہر محنت مزدوری کرتا ہوں، گھر آتا ہوں تو دو ٹونوں ماں، بیٹے مجھے کھانے کو دوڑتے ہیں۔“ مٹھل کے بوڑھے جھریوں بھرے چہرے پر کرب ابھر آیا، اس کی آواز رقت سے بوجھل ہو رہی تھی۔ ”پتہ نہیں میرا سارنگ پٹ کس حال میں ہو گا، وہ میرا بہت خیال رکھتا تھا، وہ میرا سچا پٹ تھا، فرمانبردار..... مجھے یقین ہے وہ اگر ہوتا تو مجھے بالکل کام نہیں کرنے دیتا، اللہ سائیں اس کے سر کی خیر کرے۔“

کی آوازیں دائیں جانب کے گوشے سے آرہی تھیں، اس کی چوکھٹ پر بھی بوسیدہ سی رلی کاٹاٹ جھول رہا تھا، وہ بے آواز چلتا ہوا چوکھٹ کے قریب پہنچا اور سانس روکے سن گن لینے کی سعی کرنے لگا۔

”میں صحیح کہتی ہوں کھیا جی.....! یہ میرا دشمن ہے، نہ یہ میرا شوہر ہے اور نہ میں اس کی بیوی بلکہ میں تو اس کے قبیلے کی بھی نہیں ہوں، میرا اصل نام شرما دیوی نہیں بلکہ املی ہے اور یہ مرد وہ تو نہیں بلکہ سارنگ ہے، یہ مسلا ہے اور میں راجستھانی ہندو ناری ہوں۔“

سارنگ، املی کی آواز اور اس کی سرگوشیا نہ انداز کی باتیں سن کر سنائے میں آگیا۔ آخر کار اس ناگن نے اسے ڈس لیا تھا، وہ اسے یہاں تک لا کر اب بری طرح پچھتا رہا تھا مگر اب کیا ہوتا جب چڑیاں چگ گئیں کھیت کے مصداق سارنگ بے بس ہو گیا تھا۔ پھر دفعتاً اسے کھیا مکھڑوں کو لمبی کی سرسراٹی آواز سنائی دی۔ ”اگر یہ تیرا دشمن تھا تو پھر تو اس کے ساتھ ادھر کیوں آئی.....؟“

اس کے سوال پر جواباً املی کی دبی دبی آواز ابھری۔ ”کھیا جی.....! میں نے ابھی تیرے کو بتایا تو تھا کہ یہ مرد و دایک اسمگلر ہے، اس نے میرے باپ کو بڑی بیدردی سے قتل کیا تھا، میں نے اس سے انتقام لینا تھا مگر تب اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی اس لئے میں نے سوچا کہ اسے بے وقوف بنا کر موقع ملے ہی اس کے سینے میں انتقام کا خنجر گھونپ دوں گی، میں اسے بڑی چالاکی کے ساتھ ادھر لائی تھی۔“

سارنگ کا پورا وجود مرتعش تھا، اس کے دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں، اسے دغا باز املی پر اس قدر شدید غصہ آ رہا تھا کہ اس کا بس چلتا تو اندر جا کر مکار چنڈال کی گردن مردوڑ دیتا مگر یہ وقت جوش سے نہیں بلکہ ہوش سے کام لینے کا تھا کیونکہ وہ خود اس وقت قبیلے کے سردار کے جھونپڑے میں موجود تھا، اگر جوش سے کام لیتا تو یہ سب لوگ اپنے کھیا کے ایک اشارے پر اس کی تھکا ہوئی کرڈالتے۔ لہذا اس نے عافیت اسی میں جانی کہ فی الفور اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے رفو چکر ہو جائے وگرنہ مکار اور دغا باز املی نے جس طرح کھیا کے سامنے اسے ایک اسمگلر ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی، یہ بات اسے ایک بڑی مصیبت میں پھنسا دینے کے لیے کافی تھی کیونکہ یہ لوگ اس کو ایک اسمگلر کی حیثیت سے جھونٹے الزام میں بارڈر فورسز کے اہلکاروں کے حوالے بھی کر سکتے تھے۔ لہذا یہ خیال آتے ہی وہ پھر نہ رکا اور جلدی سے وہ بیرونی حصے کی طرف بڑھا اور اگلے ہی لمحے وہ جھونپڑے سے باہر تھا۔

”پیو.....! میرا دل کہتا ہے ادا سارنگ ایک دن ضرور تم سے آن ملے گا۔“ ملوکاں نے باپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ پھر بولی۔ ”پیو.....! تو چھوڑ دے کام پھر خود ہی ادا خالقو اور امز کو پتہ لگے گا کہ گھر دھڑیں (شوہر) کی کمائی کیا ہوتی ہے۔“

”دھیے.....! مجھے اپڑیں نہیں، تیری فکر ہے..... تجھے اپڑیں گھر کا کردوں پھر مجھے کسی کا ڈر نہیں پھر آج ماں، بیٹے کی سنگدلی اور بے حسی نے مجھے پہلی بار احساس دلایا ہے کہ میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہوں..... اب پتہ نہیں میں کام کیسے کروں گا، جان تو زحمت نے بھی مجھے کمزور نہیں کیا تھا مگر آج..... آج.....!“ مارے رقت و بے بسی کے احساس غم بتلے مٹھل اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔

ملوکاں نے فوراً باپ کو سہارتے ہوئے کہا۔ ”پیو.....! تو کیوں پریشان پھرتا ہے، میں ہوں نا..... تیری بیٹی.....! کل سے تیری جگہ میں خود چاچا سکھیو کے ساتھ کھیٹوں پر جاؤں گی، آخر کو اور لڑکیاں بھی تو جاتی ہیں۔“ بیٹی کی بات سن کر مٹھل نے غم سے چور نظروں سے اسے دیکھا پھر دونوں باپ بیٹی گلے مل کر رونے لگے۔

☆=====☆

سارنگ کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ املی غائب تھی، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا، بغیر دروازے کی چوکھٹ پر جھولتے ہوئے بوسیدہ سے ٹاٹ کے روزنوں سے سورج کی روشنی اندر آرہی تھی، املی کی پراسرار غیر موجودگی پر جانے کیوں اسے دال میں کچھ کا لامحسوس ہو رہا تھا تاہم اس نے غیر یقینی حالات کو مدنگاہ رکھتے ہوئے ہوشیاری اور محتاط روی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور بہ آبستگی بستر سے اٹھ کر دبے پاؤں چوکھٹ کے قریب آیا اور پردے کے طور پر مستعمل ٹاٹ کو ذرا سا سرکا کر باہر جھانکا۔ یہ ”مہمان گوشہ“ قبیلے کے کھیا مکھڑوں کو لمبی کے بڑے سے رہائشی جھونپڑے کے بعید ترین حصے میں واقع تھا کیونکہ آگے ایک اور کوٹھری نما کمرہ تھا جو سنسن پڑا تھا حالانکہ سارنگ کو اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ اور املی اس جھونپڑی میں داخل ہوئے تھے تو یہاں سے عورتوں اور بچوں کی آوازیں بھی آرہی تھیں مگر اب جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا تھا، باہر انہی عورتوں، بچوں کو کسی دوسرے جھونپڑی میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اچھی طرح گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد سارنگ دبے پاؤں باہر نکل کر سامنے کی کوٹھری میں آیا تو اچانک اسے کسی کے دبے دبے انداز میں باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ ٹھنکا اور ادھم آوازوں کی سمت دیکھا، دھیے دھیے باتیں کرنے

وہ بری طرح اعصاب زدگی کا شکار تھا، پریشانی میں اسے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کدھر کا رخ کرے، اس نے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی تو اسے آس پاس بنی چھوٹی بڑی جھوپڑیوں کے ارد گرد قبیلے کے لوگ آتے جاتے دکھائی دیے، کسی نے اس پر توجہ دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔

سارنگ کے دل میں یہی خیال آیا کہ وہ اب ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر ان کے ڈیرے سے کہیں دور چلا جائے پھر اس نے ایسا ہی کیا، وہ خاموشی سے تیز تیز قدموں سے ایک طرف کو ہولیا، ارد گرد اسے مال، مویشی بھی جگالی کرتے نظر آئے، اچانک اسے عقب میں ایک گونجدار لاکارتی ہوئی تھمسانہ آواز سنائی دی۔

”اڑے اوچھو کر!.....! کدھر جاتا پڑا ہے رک جا.....“

سارنگ نے چلتے چلتے مڑ کر عقب میں دیکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا، مکھڑوں کو لمبی اپنے جھوپڑے سے نکل کر تیز تیز قدموں سے تقریباً دوڑتا ہوا آ رہا تھا، اس کے عقب میں وہ چندال املی بھی تھی، یہ دیکھ کر سارنگ نے باقاعدہ سر پٹ دوڑ لگا دی، قبیلے کے جوان مردوں کو فوراً صورت حال کی نزاکت کا احساس ہوا تو وہ دائیں بائیں سے اپنے دونوں ہاتھ گویا بھاگتی ہوئی مرئی پکڑنے کے لیے انداز میں پھیلانے سارنگ کی طرف گھیرا ڈالنے کی غرض سے دوڑے مگر سارنگ ان کا گھیرا مکمل ہونے سے قبل ہی ان کی پہنچ سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

وہ اندھا دھند بھاگ رہا تھا، کھلیا اور قبیلے کے لوگوں کے پیچھے چلانے سے جیسے چاروں طرف بھگدڑی مچ گئی تھی پھر جو بھی ان کی طرف متوجہ ہوتا، چشم زدن میں صورت حال کا ادراک کرتے ہی سارنگ کو پکڑنے کے لیے دوڑ لگا دیتا، جلد ہی سارنگ کو یہ احساس ہو گیا کہ وہ کسی چوہے دان میں پھنس گیا ہے کیونکہ وہ جیسے ہی سامنے سے بازو پھیلانے اپنی طرف بڑھتے کسی شخص کو دیکھتا تو سارنگ اپنا راستہ بدل کر دائیں جانب کی جھگیوں، جھوپڑیوں کی قطار میں چھلانگ لگا دیتا تب اچانک سارنگ کی نظر جگالی کرتے ہوئے ایک اونٹ پر پڑی، اگرچہ اس کے کوہان پر کوئی ”ہودہ“ یا ”کبادہ“ نہیں رکھا گیا تھا مگر سارنگ نے اس کی مطلق پروا کے بغیر اسے جلدی سے ہشکارے دیتے ہوئے کھونٹے سے آزاد کیا اور دوسرے ہی لمحے جب اونٹ کھڑا ہونے لگا تو سارنگ بہ سرعت اچھل کر اس کے کوہان سے چٹ کر اس پر سوار ہو گیا، اٹائے راہ مکھڑوں کو لمبی کے آدمی بھی قریب پہنچ گئے بلکہ ایک نے تو اچھل کر سارنگ کو کوہان سے نیچے گرانے کی بھی کوشش کی مگر سارنگ نے اپنے حواس قابو میں رکھتے ہوئے اس

کے منہ پر لات رسید کر دی پھر مخصوص انداز میں اس نے اپنے دونوں پاؤں کی ایڑیاں اونٹ کے پیٹ پر رسید کرنے کے ساتھ ہی حلق سے زور سے آواز نکالی تو دوسرے ہی لمحے اونٹ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ پھر کسی میں بھی اس کے سامنے آنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ اس کے گرد گھیرا ڈالنے والے مشتعل لوگوں کا گھیرا کائی کی طرح چھٹتا چلا گیا۔

ذرا ہی دیر بعد سارنگ ڈیرے سے دور نکل گیا، کبادہ یا مہاریں نہ ہونے کی وجہ سے اس کا اونٹ محاورتا نہیں بلکہ حقیقتاً شتر بے مہار ہو چکا تھا: سارنگ کو اب اونٹ پر خود کو جمائے رکھنا دو بھر ہو رہا تھا مگر پھر بھی وہ اپنے پورے وجود کی طاقت سے اس کے کوہان سے چمٹا ہوا تھا۔

اونٹ کو تو ویسے ہی صحرا کا جہاز کہا جاتا ہے اور وہ صحرائی جہاز بغیر رکے بے سمت دوڑا جارہا تھا بلکہ اڑا جا رہا تھا کہ اچانک اس کی رفتار دھیمی پڑنے لگی، سارنگ کی جان میں جان آئی پھر اگلے چند لمحوں میں ہی اونٹ رک کر صحرائی جھاڑیاں چرنے لگا، یہ ”اونٹ کٹارا“ تھی، اونٹ کا من پسند کھا جا، سارنگ بری طرح ہانپ رہا تھا جیسے اونٹ کے ساتھ خود بھی دوڑتا رہا ہو، سارنگ نے اونٹ کے کوہان سے نیچے ریت پر چھلانگ لگا دی، اونٹ جھاڑیاں چرنے میں مگن تھا۔

سارنگ نے کھڑے ہو کر دائیں بائیں دیکھا، حدنگاہ لقمہ ووق صحرا تھا، سورج سوا نیزے پر چمک رہا تھا، پورے تپتے سلگتے صحرا میں ”العطش العطش“ کی گونج محسوس ہو رہی تھی، سارنگ نے اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کہ وہ بستی سے کافی دور بلکہ بہت آگے نکل آیا تھا، اچانک پھر سارنگ کو اپنے سامنے کچھ فاصلے پر خاردار باڑی نظر آئی جو کہیں کہیں سے ٹوٹ کر ریت میں دھنسی ہوئی تھی، سارنگ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، وہ سرحد کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا تاہم اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہاں بارڈر سیکورٹی فورسز والوں کی کوئی پتہ نہیں تھی، ہو سکتا ہے یہ سرحد کا کوئی بعید ترین حصہ ہو۔ اس نے سوچا اور ساتھ ہی اس نے خدا کا شکر بھی ادا کیا کہ ایک طرح یہ اچھا ہی ہوا، اب ایک بار وہ سرحد پار کر لے تو کسی طرح گورا کے مقام تک پہنچ ہی جائے گا، جدھر جوش بابا کی کنیا تھی۔

اسے اب پیاس ستانے لگی تھی، یہاں پانی کا ایک قطرہ بھی ملنا محال تھا پھر اچانک اس کی نظر پاس ہی ایک بڑے اور پھولے ہوئے ترشول نما لیکٹس پر پڑی، وہ فوراً اس کی طرف بڑھا اور اپنے نیپے سے چھوٹا سا شکاری چاقو نکال کر اس نے ایک لیکٹس کو اس کی پٹا بڑے قریب سے کاٹ کر علیحدہ کیا، اس کوشش میں اس کے ہاتھ میں کانٹے بھی چبھ گئے، اس نے اس کی چنداں پروا نہ کی اور چاقو کی مدد سے اس بڑے سے پھولے ہوئے

سب اس کا شوہر اسے کیوں بتا رہا ہے، میں نے تو ان کی دوستی پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔
 ”تو ذرا بہن سنو، لے، سرخی پاؤ ڈر لگا لے۔ آخر کو ہماری نئی نئی شادی ہوئی ہے، وہ کیا سوچے گا کہ نئی ٹیلی ویژن کو نوکرانی بنالیا، میں اندر بیٹھک میں جا رہا ہوں تو چائے خود اندر لے کر آنا..... سمجھ گئی ناں اچھی طرح؟“ اس نے آخر میں گویا تنبیہ والے انداز میں سدھوراں سے کہا تو سدھوراں بیچاری پریشان سی اس کا منہ تکنے لگی پھر پھنسی پھنسی سی آواز میں شوہر سے بولی۔ ”مم..... میں..... بھلا..... ایک غیر مرد کے سامنے کس طرح جاسکتی ہوں، مجھے تو شرم آئے گی تو خود لے جانا چائے!“

”اری پاگل نہ بن.....! شرم کیسی؟“ وہ بولا۔ ”میں نے کہا تو ہے وہ میرا بچن کا دوست ہے خواہ مخواہ دل میل کرے گا تو اس کے سامنے نہیں جائے گی تو وہ اسے غیریت سمجھے گا، چل جلدی کر شاہاش.....! اور ہاں وہ بیگنی رنگ کا جو سوٹ تھا نا جو شادی کے بعد میں نے طارق روڈ سے خاص تیرے لئے خریدا تھا، وہ پہن لینا جلدی سے، اچھا اب میں تیرا انتظار کر رہا ہوں اندر.....“

سدھوراں، شوہر کے اس عجیب و غریب حکم پر شیشا کر رہ گئی۔ شوہر کا حکم تھا جو وہ مجبور ہو گئی، اس کی ناراضی وہ نہیں مول لینا چاہتی تھی۔ لہذا نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے منہ ہاتھ دھویا اور اندر اپنے کمرے میں آ گئی، الماری سے بیگنی رنگ کا جھلمل کرتا سوٹ نکالا اور اسے دیکھنے لگی، صاف ظاہر ہو رہا تھا اس کے چہرے سے کہ وہ اسے پہنتے ہوئے ہچکچاہتی تھی کیونکہ ایک تو یہ سوٹ سدھوراں کے ٹائٹ تھا پھر اس کی آستینیں بھی ہاف تھی، دوسرے اس کا گلا بہت کھلا تھا، یہ سوٹ وہ صرف گھر میں اس وقت پہنتی تھی جب پرویز گھر میں ہوتا تھا اور اگر وہ اس کے ساتھ باہر گھومنے کے لیے نکلتی تو ہرگز یہ سوٹ نہیں پہنتی تھی مگر آج جب پرویز نے اسے یہ سوٹ پہن کر اپنے دوست کے سامنے آنے کو کہا تو سدھوراں میں اس کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی لیکن پھر اس نے سوچا کہ پرویز اس سے بے انتہا محبت کرتا ہے، ہوگی اس کی کوئی دوستانہ مجبوری..... پہن لینے میں کیا حرج ہے شاید یہ قیمتی سوٹ ہے اسی لئے پرویز اپنے دوست پر رعب جھاڑنا چاہ رہا ہو کہ اس نے اپنی بیوی کو شہزادیوں کی طرح رکھا ہے، بعض مردوں کو اپنی خوبصورت بیوی کی نمائش کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ لہذا یہ سوچ کر سدھوراں کے لبوں پر ہلکی سی مسکان پھیل گئی اور اس نے اپنا سر جھٹک کر جلدی جلدی سوٹ پہن لیا پھر ذرا دیر بعد میک اپ کر کے اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اپنے سراپے کا جائزہ لیا تو وہ خود ہی شرمائی۔ اس کی کھلتی ہوئی رنگت پر یہ سوٹ خاصا چلتا تھا، اس کا ہم

کیکٹس کے سارے کانٹے چھیل ڈالے، اس کے بعد چاقو کی نوک پھولے ہوئے کیکٹس کے اندر گھس کر سوراخ کیا تو اس کے اندر سے پانی کی دھار پھوٹ نکلی، سارنگ نے فوراً کیکٹس کے اس سوراخ سے منہ لگا دیا اور سارا پانی غناغٹ پی لیا، وہ اس کیکٹس کی مخصوص قسم سے بخوبی واقف تھا جس کے اندر بیٹھا پانی قدرتی طور پر موجود ہوتا ہے، پانی پی کر وہ خاصا سیر ہو گیا تو اس نے، زاوراہ کے طور پر دو تین مزید ایسے ”آبی کیکٹس“ کاٹ کر مکھڑے، قریب ہی اس کا اونٹ جھاڑیاں چرنے میں مصروف تھا، سارنگ نے اس کو مخصوص انداز میں آواز دے کر ریت پر بٹھایا اور اس کے کوہان سے چپک کر بیٹھ گیا، اب وہ اسے درمیانی رفتار سے آگے بڑھانے لگا، اس نے اٹلی پر تین حرف بھیج کر دل ہی دل میں شکراوا کیا کہ اس چندال سے اس کی جان چھوٹ گئی تھی۔ وہ اب سرحد پار کر چکا تھا۔

☆=====☆=====☆

سدھوراں اپنے شوہر پرویز کی اسرار بھری گفتگو سے الجھ کر رہ گئی تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر پرویز اس سے کیا چاہتا تھا، سدھوراں نے بھی اس سے اس بابت کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی، سمجھ بیویوں کی طرح وہ گھرداری میں مصروف ہو گئی، اس میں کوئی شک نہ تھا کہ پرویز اس کا ہر طرح سے خیال رکھتا تھا مگر باوجود اس کے سدھوراں اس کی طرف سے بدستور الجھن اور بے نام سی پریشان کن بے چینی کا شکار تھی، وہ صبح جاتا اور رات گئے ہوٹل سے لوٹتا تھا۔

ایک روز پرویز کا کوئی دوست اس سے ملنے آیا، اس دن پرویز گھر ذرا جلدی ہی آ گیا تھا، بعد میں سدھوراں کو محسوس ہوا کہ وہ دراصل اپنے اسی دوست سے ملنے کے لیے ہی جلدی گھر لوٹا تھا، بعد میں پرویز نے سدھوراں سے دوست کے لیے دو تین روٹیاں زیادہ بنانے کو کہا۔

رات کے دس بجے کا عمل تھا، پرویز نے اپنے دوست کو بیٹھک میں بٹھا رکھا تھا جس کا ایک دروازہ اندر محن میں بھی کھلتا تھا، پرویز نے اپنے اس دوست کے بارے میں سدھوراں کو کچھ زیادہ نہیں بتایا تھا، جب وہ دونوں کھانا کھا چکے تو پرویز نے سدھوراں کو چائے بنانے کا کہا۔ ”دیکھ سدھوراں.....! یہ میرا بہت پرانا اور بچپن کا دوست ہے، دلدار حسین نام کا ہے۔ یہ ایک طرح سے میرا محسن بھی ہے، ہمارے درمیان بھائیوں جیسی بے تکلفی ہے۔“ وہ لمحہ بھر کا تو سدھوراں خاموشی سے شوہر کا چہرہ تکنے لگی، وہ سوچ رہی تھی کہ بھلا

جھکے گھبرائی گھبرائی سی کھڑی رہی۔

”دیکھ لو اپنی بھابی کو.....! پھر نہ کہنا مجھے کچھ۔“ پرویز نے فخر سے کہا۔ سگریٹ کے دھوئیں اور عامیانا گفتگو سے بیٹھک کا محدود ماحول مکدر ہو رہا تھا پھر سدھوراں کا تو وہاں کھڑے رہنا دوبھر ہونے لگا مگر چونکہ ابھی شوہر کا حکم نہ تھا واپس لوٹنے کا اس لیے وہ وہیں سر جھکائے خاموشی سے کھڑی رہی، دلدار حسین اپنی جگہ سے اٹھا اور قمیض کی جیب سے ایک پرائوٹ نکال کر سدھوراں کی طرف بڑھا۔

”بھابی.....! یہ منہ دکھائی تو لے لیں..... اتنا بھی کیا شرمانا.....!“

سدھوراں نے گھبرا کر سر اٹھایا، دلدار حسین کی نظریں اسے اپنے وجود میں گھسی محسوس ہونے لگیں۔

”لے لے لے سدھوراں! یہ تو ایک رسم ہے۔“ پرویز نے کہا۔

سدھوراں نے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ آگے بڑھا کر دلدار حسین کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے نوٹ کو آہستگی سے لیا تو اس کا ہاتھ اس سے چھو گیا، سدھوراں نے جلدی سے نوٹ لے کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا، اسے صاف محسوس ہوا تھا کہ دلدار حسین نے دانستہ اس کا ہاتھ چھونے کی کوشش کی تھی، پھر سدھوراں وہاں نہ رکی اور باہر آ کر اس نے چند گہرے گہرے سانس لیے پھر معرا جانے اس کے دل میں کیا سمانی کہ وہ دوبارہ بیٹھک کے دروازے کی طرف بڑھی اور کان لگا کر اندر کی سن گن لینے کی کوشش کرنے لگی۔

اچانک پھر اسے اندر سے دلدار حسین کی آواز سنائی دی۔ وہ اس کے شوہر پرویز کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔

”پرویز.....! شے تو تو نے بڑی زبردست ڈھونڈی ہے پھر کب اسے دھندے سے لگا رہا ہے؟“

”ارے یار.....! ذرا دھیرج..... اسی جلدی بازی کی وجہ سے پہلی والی بھاگ گئی تھی، اب اسے ذرا آرام سے راہ پر لگاؤں گا۔“ جواباً پرویز کی آواز ابھری تو سدھوراں کا دل دھک سے رہ گیا پھر اسی لمحے دلدار کی آواز آئی۔

”یار پرویز.....! دراصل بات یہ ہے کہ وہ ہے ناں ایس ایچ او خاور حیات وہ آج کل بڑا تنگ کر رہا ہے، اس کمبخت نے تو دھندہ ہی چوپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔“

”اس کی جیب کیوں نہیں گرم کرتا، پیسے کم ہیں تو میں دے دیتا ہوں۔“ پرویز بولا۔

”مٹھی تو میں اس کمبخت کی گرم کرتا ہی رہتا ہوں، اس کم بخت کا پیٹ بہت موٹا ہے تو

رنگ دوپٹہ بالکل باریک لمبل کا تھا جو پردے سے زیادہ محض فیشن ہی کا منظر تھا، بہر طور سدھوراں جی کڑا کر کے رسوئی میں آئی پھر چائے کے برتن ٹرے میں سمیٹ کر وہ جب بیٹھک کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھی تو اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا، وجود میں بھی ہلکی ہلکی لرزش تھی، تب وہ ذرا ہمت کر کے آگے بڑھی اور دروازے کے بالکل سامنے پہنچ کر ہولے سے اس نے کھکا راتو اندر دوست کے ساتھ باتوں میں مشغول پرویز نے بیوی کی آہٹ پا کر دروازے کے دونوں پٹ پوری طرح وا کر دیئے، سدھوراں جی کڑا کر کے ٹرے سے اٹھ کر اندر داخل ہوئی، سامنے ایک تپائی نما چھوٹی سی میز کے قریب کرسی پر اسے پرویز کا وہ دلدار حسین نامی دوست بیٹھا نظر آ گیا، اس کے ہاتھ میں سگریٹ دہی ہوئی تھی، وہ پرویز کا ہم عمر ہی تھا، رنگت قدرے جھلسی ہوئی تھی، ناک موٹی سی تھی اور ہونٹ بھی موٹے موٹے اور سیاہی مائل تھے جو اس کی کثرت سگریٹ نوشی کی چغلی کھا رہے تھے۔

سدھوراں کو دلدار حسین کی گھورتی ہوئی آنکھوں میں عجیب سی چمک محسوس ہوئی اور دوسرے ہی لمحے سدھوراں نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ سدھوراں کے نسوانی وجدان نے اسے محسوس کروایا کہ وہ شخص بغور اس کے سراپے کا جائزہ لے رہا تھا۔

”سلام بھابی!“ دوسرے ہی لمحے سدھوراں کے کانوں سے بھدی سی آواز نکل کر آئی تو سدھوراں نے جھکے جھکے سر کے ساتھ ہاتھوں میں پکڑی ٹرے گھبراہٹ میں جب سامنے تپائی پر رکھی تو اس کا باریک لمبل کا مختصر فیشنی ساتوئی دار دوپٹہ اس کے جھکنے کی وجہ سے سر سے ڈھلک گیا چونکہ مارے لاج کے خود سدھوراں کا چہرہ بھی جھکا ہوا تھا اس لئے دوپٹہ سر سے نیچے گرتے ہی خود اس کی اپنی جھکی جھکی آنکھوں نے اپنے کشادہ گریبان کا نظارہ کیا تو وہ سرخ ہو گئی، ٹھیک اسی لمحے اسے اپنے چہرے کے قریب ہی پرویز کے دوست دلدار حسین کی جذبات سے بوجھل ”واہ“ کی آواز سنائی دی، سدھوراں نے مضطربانہ انداز میں دلدار حسین کی طرف دیکھا اور مارے لاج کے جلدی سے سیدھی کھڑی ہو گئی۔

”ارے سدھوراں.....! تم نے میرے بھائی کے سلام کا جواب نہیں دیا، یہ کیا کہے گا کہ اس کی بھابی کتنی مغرور ہے؟“ اچانک اسے اپنے شوہر پرویز کی آواز سنائی دی اور سدھوراں نے جلدی سے اپنا دوپٹہ سر پر رکھتے ہوئے ہلکے سے آداب کہا۔

”اوہ بھئی پرویز.....! تم واقعی خوش نصیب انسان ہو، بھابی تو بالکل ہیرا ہے ہیرا۔“ سچ پوچھو تو مجھے تم سے حسد ہونے لگا ہے۔“ دلدار حسین نے بدستور عجیب نظروں سے سامنے کھڑی سدھوراں کے سراپے کو گھورتے ہوئے کہا تو سدھوراں کو اس کا لہجہ برا لگا تاہم وہ سر

سدھوراں اب شدید وسوسوں کا شکار ہونے لگی تھی۔

☆=====☆=====☆

ڈاکٹر فوزیہ کو جہاں داد کے بد معاش ساتھیوں نے لینڈ کروزر کی عقبی نشست پر بٹھا رکھا تھا، ایک نے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر موڑ کر مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے جبکہ دوسرے نے اس کا منہ بند رکھا تھا۔ ڈاکٹر فوزیہ بری طرح خوف زدہ ہو گئی تھی، وہ ذرا بھی مزاحمت کرنے کی کوشش کرتی تو وہ بد تہذیبی سے پیش آتے تھے، ناچار فوزیہ کو ان کی بیہودگی روکنے کے لیے چپ ہو کر بیٹھا رہنا پڑتا، ایک طرف ڈاکٹر فوزیہ کا غصے سے برا حال تھا دوسری طرف شدید قسم کی تنویشناک بے چینی اور پریشانی کا بھی شکار تھی جبکہ اگلی نشست پر ڈرائیور کے برابر بیٹھا جہاں داد، ڈاکٹر فوزیہ کی کیفیت سے حظ اٹھا رہا تھا، اس کی گھٹی مونچھوں تلے بڑی زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

لینڈ کروزر فرار لے بھرتی ہوئی نامعلوم منزل کی طرف خاصی رفتار سے دوڑی چلی جا رہی تھی، ڈاکٹر فوزیہ نے سر دست خود کو حالات گرداب کے سپرد کر دیا تھا اور اپنے اعصاب زدہ دل و دماغ پر قابو پاتے ہوئے کن انکھیوں سے آس پاس کا جائزہ لینے لگی، وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ یہ بد معاش اسے کہاں لے جا رہے تھے، اسے ڈاکٹر جواد کی بھی فکر ستانے لگی تھی جسے ان بد معاشوں نے اپنی رانقل کا ٹھوس کندا اس کے سر پر سید کر کے اسے زخمی کر ڈالا تھا۔ لینڈ کروزر اب واپس ڈیفنس، اختر کالونی والی چورنگی سے قیوم آباد چورنگی کی طرف مڑ گئی تھی اور وہاں سے اس نے دائیں جانب قیوم آباد چورنگی (ڈیفنس ویو) سے کورنگی کرائنگ سے موڑ کا نا پھر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

لحمہ بلحمہ ڈاکٹر فوزیہ کے دل و دماغ میں وسوسوں کی سرسراہٹیں بڑھنے لگی تھیں۔ اس کے متوحش دماغ کی غیر مرئی اسکرین پر بار بار خطرناک سوالیہ نشان بن رہے تھے، نجانے جہانم اداب اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا تھا کیونکہ وہ اب پوری طرح سے جہاں داد کے رحم و کرم پر تھی اس پر مستزاد اس کے پانچوں ہٹے کئے مسلح بد معاش کارندے بھی اس کے ہمراہ تھے۔

لینڈ کروزر اب ابراہیم حیدری کی طرف جا رہی تھی پھر لگ بھگ نصف گھنٹے بعد وہ ابراہیم حیدری سے آگے مضافات میں دائیں جانب ایک کچے اور نشیبی راستے میں اتر گئی۔ شام کے سائے اب بتدریج گہرے ہونے لگے تھے اور اب اس بے آب و گیاہ

بھی نہیں بھر سکے گا پیسوں سے اس کا پیٹ.....! اسے کچھ اور چاہئے۔“

”اچھا.....! یہ تو واقعی تنویش کی بات ہے۔“ پرویز کی مشکری آواز ابھری تھی پھر پھر وہ دوسرے ہی لمحے ایک گہری سانس لیتے ہوئے دوبارہ بولا۔ ”اچھا ٹھیک ہے میں سدھوراں کو لائن پر لگانے کی کوشش کرتا ہوں، ذرا کچھ دن ٹھہر جا۔“ پھر لحمہ بھر تو قف کے بعد اس نے پوچھا۔ ”یار دلدار.....! یہ تو بتا اعظم ہستی والے اڈے کی کیا پوزیشن ہے، وہاں پر مال کی اب تک دوسری ڈیلیوری نہیں ہوئی، یہی حالت ملیر پندرہ اور کورنگی کے اڈوں کی ہے۔“

”ارے یار بتایا ناں اس کم بخت خاور حیات نے سارا معاملہ ہی چوپٹ کر رکھا ہے جس راستے ہمارا مال آتا ہے، وہاں اس نے ناکہ بندی کر رکھی ہے، متعلقہ تھانوں تک ہر اس کمینے کی رسائی ہے، اپنے سارے وردی پوش بھائی بندوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے، ہر سارے کالی وردیوں والے ہمارے جیسوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے گئے ہیں۔“ دلدار حسین نے تفصیل بتائی۔

”تو بنگو اور چھیدے کے اڈوں کا کیا حال ہے، آخر کو وہ بھی ان کالی وردی والوں سے تنگ آئے ہوئے ہوں گے؟“ پرویز نے پوچھا۔

”ہاں.....! ان کی ناک میں بھی دم کر دیا تھا پھر انہوں نے کسی نہ کسی طرح انہیں را کر لیا ہے، مال کے ساتھ ڈبل مال بھی بھیجتے رہتے ہیں ان کے ویران کوارٹروں میں.....“ دلدار حسین نے بتایا۔ ”بس یار.....! اگر ہم نے خاور حیات کو رام کر لیا تو یقین کرنا ہمارے حریف بنگو اور چھیدا بھی ہمارے آگے اپنے گھٹنے ٹیک دیں گے۔“

”اچھا یار.....! ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا تو فکر نہ کر، مجھے امید ہے کم از کم میری با دوسری بیوی میری بات نہیں ٹالے گی۔“ پرویز نے اسے تسلی دی۔

”اچھا یار.....! تو پھر مجھ اجازت دے، کام ہو جائے تو مجھے اطلاع کر دینا، اب چند ہوں۔“ دلدار اٹھتے ہوئے بولا۔

سدھوراں فوراً وہاں سے ہٹ گئی اور لرزتے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں آکر بیڈ پر گر گئی۔

اس کا دل و دماغ جیسے سن ہو کر وہ گیا تھا، اپنے شوہر اور اس کے دوست کی معنی خیز باتوں سے اسے حالات کا بخوبی ادراک ہو رہا تھا، اسے اب پورا یقین ہو چکا تھا کہ اس کے شوہر پرویز غنقریب اس سے وہی پُر اسرار بات کہنے والا تھا جو اس نے شب سہاگ اس کے ”کام“ آنے سے متعلق کہی تھی۔

دیرانے میں تو جیسے وقت سے پہلے ہی رات کا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا، ڈاکٹر فوزیہ حالت مزید دیگرگوں ہونے لگی، اس کے پاس اب خدا سے دعا مانگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔

لینڈ کروزر اب ہچکولے کھاتی ہوئی ناہموار راستے پر درمیانی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ دیرانے کے پیش نظر اب اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا گیا تھا، غیر مردوں کے بیچ بیٹھنے کی وجہ سے ڈاکٹر فوزیہ کو سخت ذہنی اذیت اور کوفت محسوس ہو رہی تھی، بہر طور بول کہ لب آزاد ہر تیرے، کے مصداق ڈاکٹر فوزیہ نے ہانپتی ہوئی متوحش آواز سے ڈرائیور کے برابر والی آگے نشست پر براجمان جہاں داد سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تت..... تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو جہاں داد.....؟“

ڈاکٹر فوزیہ کی لرزتی، کانپتی اور قدرے التجا آمیز آواز پر جہاں داد اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ”اپنے مہمان خانے.....! جدھر ہم سب تمہاری میزبانی کا شرف حاصل کریں گے۔“

ڈاکٹر فوزیہ اس کے سرسراتے لہجے پر لرز اٹھی۔ ”جہاں داد.....! تم یہ ٹھیک نہیں کر رہے ہو، تم نہیں جانتے ہو کہ میں کس کی بیٹی ہوں۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے اپنے تئیں اسے دھمکانے کی کوشش کی تو جہاں داد اس بار گردن موڑ کر اس کے متوحش چہرے کو گھورتے ہوئے بولا۔

”جانتا ہوں، اچھی طرح تم کس تئیں مار خاں کی اولاد ہو..... تمہیں اندازہ ہو چاہئے کہ تم نے کس کو دھوکا دے کر دشمنی مول لینے کی کوشش کی ہے، اب خاموش بیٹھی رہو ورنہ ادھر ہی تمہارا برا حشر کر ڈالیں گے۔“ اس کے سفاک لہجے نے ڈاکٹر فوزیہ کو خوفزدہ انداز میں چپ رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر فوزیہ کو دائیں بائیں کچے کچے مکانوں کے خاکے نظر آنے لگے یہ ایک دور افتادہ مضافاتی قصبہ تھا، جو اس وقت عجیب سی پرسکوت ویرانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر کچے کچے گھروں کا یہ سلسلہ بھی جلد موقوف ہو گیا، اس کے بعد لینڈ کروزر ایک قدرے بڑے سے نیم پختہ مکان کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔

ڈرائیور نے انکیشن سوچ آف کر دیا تھا مگر گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن رہنے دی تھیں۔ وہ سب اپنی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آئے۔ ڈاکٹر فوزیہ کو بھی بیدردی سے ہٹ گھینا گیا، اس کے چیخنے چلانے کی متوقع کوشش کے پیش نظر ایک بد معاش نے دوبارہ اس

منہ بند کر دیا تھا۔

دروازے پر تالا لگا ہوا تھا، دروازہ لوہے کا تھا پھر ایک بد معاش نے نہایت پھرتی کے ساتھ تالا کھول کر دروازے کے دونوں آہنی پٹ اندر کی جانب دھکیل دیئے اور اندر داخل ہو گیا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے اندھیرے میں شاید سوچ بورڈ تلاش کر کے اندر کا بلب روشن کر دیا، اس کے بعد وہ سب ڈاکٹر فوزیہ کو دھکیلے ہوئے اندر لے آئے، یہ بلند چھت والا سیلن زدہ سا ہال کمرہ تھا جو کسی گودام کا منظر پیش کر رہا تھا، اندر ایک جھلنگ سی چارپائی پڑی تھی، سرکنڈوں کے چند مونڈھے رکھے ہوئے تھے، زنگ آلود سے زرعی آلات بھی کھڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

ڈاکٹر فوزیہ کو انہوں نے زور سے سامنے پڑی جھلنگ سی کھری چارپائی پر دھکیل دیا اور پھر سب مونڈھوں پر براجمان ہو گئے، ایک بد معاش نے گودام کا آہنی دروازہ بند کر دیا۔ ڈاکٹر فوزیہ متوحش لگا ہوں سے مونڈھوں پر براجمان ان بد معاشوں کے خونخوار چروں کو تنکے جا رہی تھی۔

جہاں داد سمیت ان سب کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

ڈاکٹر فوزیہ کی سانس سینے میں انک کر رہ گئی تھی۔

وہ موت سے بڑھ کر موت کے خوف کا شکار تھی۔

”ڈاکٹر نی صاحبہ.....! اب تو تمہارے کوچ بیچ بتانا ہی پڑے گا کہ اس چھوکری سدھوراں کاٹھو نے کیا کیا اور اسے کدھر غائب کر دیا ہے۔“ بلند چھت والے ہال کمرے میں جہاں داد کی کھرکھراتی آواز گونجتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

ڈاکٹر فوزیہ کیا جواب دیتی، اس کی تو اپنی حالت پتلی ہو رہی تھی، خوف نے اس کی قوتِ نطق کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا، اس سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

”جواب دے میری بات کا کہاں ہے سدھوراں.....؟ اب کیوں تیرے کو سانپ سونگھ گیا ہے بابا! پہلے تو بڑی بڑا انگریزی میں گالیاں دے رہی تھی مجھے بول.....؟“ جہاں داد غصیلے لہجے میں ڈاکٹر فوزیہ کے متوحش چہرے کو غصے سے گھورتے ہوئے بولا اور ساتھ ہی وہ مونڈھے سے اٹھ کھڑا ہوا، اسے اٹھتا دیکھ کر اس کے کارندے بھی احترا مانا کھڑے ہو گئے۔

”مم..... میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ سدھوراں ہسپتال سے بھاگ گئی تھی۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے اسے جارحانہ انداز میں کھڑے ہوتے دیکھ کر لرزتی آواز میں بتایا اور ساتھ ہی وہ

چار پائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی بات سن کر جہاں داد اپنے ہونٹ بھیجتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔

ڈاکٹر فوزیہ کے حلق سے دلخراش چیخ نکل گئی، وہ تھپڑ کھا کر دوبارہ چار پائی پر جاگری، اتنے میں جہاں داد نے اپنی ایک ٹانگ چار پائی کی پائنتی پر ٹکا کر دوسرے ہاتھ سے ڈاکٹر فوزیہ کے بال مٹھی میں جکڑ لئے اور اس کا ستا ہوا چہرہ اپنے قریب کھینچ کر غیظ آلود لہجے میں بولا۔ ”میں تیرا جھوٹ سننے کے لیے تجھے یہاں لے کر نہیں آیا..... سچ بتاتی ہے یا پھر میں دوسرا طریقہ استعمال کروں.....؟“

”وحشی..... درندے چھوڑ دو میرے بال، تم نے میرے اوپر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کیسے کی.....؟ ذلیل انسان.....!“ تھپڑ کھانے اور جہاں داد کے جارحانہ رویے نے ڈاکٹر فوزیہ کو بھی یکدم طیش دلادیا تھا۔

”صدقے ونجا..... تیری بہادری کے ڈاکٹر فی صاحبہ.....!“ جہاں داد زہریلے لہجے میں مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ اس کی وحشی آنکھوں میں بھیڑیے جیسی چمک عود کر آئی تھی۔ ”مجھے شرافت سے اس چھوکر سی سہو راں کا پتہ بتادے پھر ہم خود تیرے کو تیرے گھر چھوڑ آئیں گے..... بتاتی ہے یا نہیں؟“ اس نے گویا آخری بار فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ڈاکٹر فوزیہ نے وہی پرانا جواب دہرایا۔

”ہوں.....! تو اس طرح نہیں بتائے گی.....؟“ جہاں داد نے سنسناتی ہوئی آواز میں کہا اور پھر ڈاکٹر فوزیہ کے بال ایک بے رحمانہ جھٹکے سے چھوڑ دیئے۔ اس کے بعد وہ بڑے آرام سے واپس اپنے مونڈھے پر جا بیٹھا اور سرسراتے ہوئے لہجے میں اپنے کارندوں سے بولا۔ ”بابا ڈاکٹر فی صاحبہ کے ہوش تو ٹھکانے لگاؤ۔“

اس کے حکم دینے کی دیر تھی کہ اس کے پانچوں کارندے چار پائی پر پڑی فوزیہ کی طرف بڑھے، ان کی آنکھوں میں چمکتی شیطیت کو دیکھ کر ڈاکٹر فوزیہ سرتاپا لرز اٹھی پھر نجانے اس میں اتنی ہمت کیسے آگئی کہ وہ یکدم چار پائی سے اٹھی اور دروازے کی طرف دوڑی، جہاں داد کے کارندے فوراً شکر کو کی طرح اس پر چبھنے، ڈاکٹر فوزیہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی، انہوں نے اسے دوبارہ اٹھا کر چار پائی پر لا پھینکا پھر جب ان پانچوں نے بھوکے بھیڑیوں کی طرح اس سے دست درازی کرنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر فوزیہ نے چیخنے چلانے کو بے سود جانتے ہوئے ملتجیانہ لہجے میں جہاں داد کو آواز دی۔ ”خدا کے لئے مجھ پر یہ ظلم نہ کرو، میں تمہاری بات مانوں گی۔“

”نہر جاؤ بابا! چھوڑ دو اسے، اب لائن پر آگئی ہے ڈاکٹر فی صاحبہ.....!“ اچانک جہاں داد نے گونجیلی آواز میں کہا تو وہ پانچوں وحشی فوزیہ کو چھوڑ کر واپس مونڈھوں پر آ بیٹھے۔ ”ہاں..... ڈاکٹر فی صاحبہ.....! اب بتاؤ کہاں ہے وہ چھوکر سی.....؟“ جہاں داد نے پوچھا۔

ڈاکٹر فوزیہ چند لمحے متوحش سانسوں پر قابو پانے کے بعد اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”پپ..... پہلے تم مجھے میرے گھر چھوڑ دو پھر فون پر مجھ سے پوچھ لینا، میں بتا دوں گی۔“

”ہوں..... تو مجھے اتنا ہی بے وقوف سمجھتی ہے، بتاتی ہے یا پھر اپنے کارندوں کو حکم دوں؟“ جہاں داد کرخٹ لہجے میں بولا۔

”بب..... بتاتی ہوں..... سس..... سس..... سہو راں میرے پاس ہی رہتی تھی پھر میں نے اس کی شادی کر دی تھی۔“ بالآخر ڈاکٹر فوزیہ نے کپکپاتے لہجے میں اسے بتا دیا۔ اس کی بات سن کر جہاں داد کے چہرے پر یکایک درشتی کے آثار نمودار ہوئے اور وہ غصے سے اپنی مٹھیاں بھیجنے لگا، اس کی المتی کیفیت سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے طیش پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے پھر اس نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ”کس سے اس کی شادی ہوئی ہے اور اس کا نام کیا ہے.....؟“

ڈاکٹر فوزیہ کی خوف زدہ نگاہوں نے جہاں داد کی آنکھوں میں غیظ و غضب کے طوفان کو نہیں لیتے ہوئے دیکھ لئے تھے، اس لئے اسے جھوٹ بولنے کی جرأت نہ ہو پارہی تھی، وہ بولی۔ ”اس کے شوہر کا نام پرویز ہے۔“

”کدھر رہتا ہے وہ.....؟“

”تق..... قیوم آباد میں.....“

”گھر کا پتہ.....؟“

”میں کبھی اس کے گھر نہیں گئی۔“

”دھند کیا کرتا ہے وہ.....؟“

”اس کا زمری میں ہوٹل ہے اپنا۔“

”ہوں.....“ سوال جواب کے بعد جہاں داد نے سنسناتی ہوئی آواز اپنے حلق سے خارج کی پھر اس کے بعد وہ اپنے مونڈھے سے اٹھ کھڑا ہوا اور غصے سے اپنے ہونٹ بھیجتا ہوا اس کی چار پائی کے قریب آیا اور ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کرتے ہوئے

میں پانی تھا کر اس کے آگے سے خالی برتن سمیٹ کر رسوئی کی طرف چلی گئی پھر ذرا دیر بعد لوٹی تو اس کے ہاتھ میں چائے کے ڈبیالے تھے، ایک اس نے مٹھل کو دیا اور دوسرا خود سنبھالے اس کے سامنے چار پائی پر بیٹھ گئی۔

پھر چند گھونٹ لینے کے بعد بولی۔ ”ملوکاں کے پو.....! تیرے سے ایک بات کہنی ہے پر تو میری کب سنتا ہے۔“ اس نے دانستہ پھو ہڑپن سے کہا۔

بے چارہ مٹھل بیوی کا تریا چلتر نہ سمجھتے ہوئے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”اڑی چری.....! میں نے تو ایک عمر صرف تیری سنتے ہوئے ہی گزار دی، اب بھلا بڑھاپے میں تیری بات نہ سن کر کیا میں نے اپڑاں حقہ پاڑیں بند کروانا ہے، بول کیا بات کرنی ہے میرے سے..... میں سن رہا ہوں۔“

عجیباں پہلے تو خاموشی سے چند ثانیے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”دیکھ ملوکاں کے پو.....! انسان کو اپنے حالات پہچان کر زندگی گزارنی چاہئے، ہمارے پاس رکھا ہی کیا ہے جس پر اتنی اکڑ دکھا میں، ایک وقت کی مشکل سے کھاتے ہیں تو دوسرے وقت کے لالے پڑے رہتے ہیں پھر ان حالات میں ایک جوان بیٹی بھی چھت کے نیچے موجود ہو تو اس کی بھی فکر الگ پریشان کرتی ہے بلکہ میں تو کہوں روٹی سے زیادہ گھر میں جوان بیٹی کی فکر ہی زیادہ رہتی ہے۔“ عجیباں اتنا کہہ کر ذرا تھکی۔

مٹھل قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں تو اپڑیں رب سائیں کا ہر وقت شکر ادا کرتا ہوں، بھلا میں کیوں اکڑتا پھروں گا اور رہی بات جوان بیٹی کی، اسے بیانے کی فکر تو ظاہر ہے مجھے بھی ہے۔“

شوہر کی بات سن کر عجیباں ذرا حوصلہ پا کر بولی۔ ”اسی لئے تو کہتی ہوں ملوکاں..... کے پو..... بیٹیاں تو کیکڑ کے درخت کی طرح جوان ہونے لگتی ہیں اور جو بیٹیوں والے ہوتے ہیں ناں وہ بیٹی کے پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ہی تھوڑا بہت جہیز جوڑتے رہتے ہیں، ہمارے پاس کیا ہے اپڑیں ملوکاں کو دینے کے لیے؟ ہمارے پاس تو تھوڑے سے لوگوں کو مانی نکر کھلانے کے لیے بھی میسے نہیں ہیں..... ہمیں ہی پوری نہیں پڑتی، بچت کیا ہو، بچت کریں بھی تو اب وقت کہاں رہا۔“

بیوی کی بات سن کر بے چارہ مٹھل بت بن گیا، حالات ہی کچھ ایسے رہتے تھے۔ جو تھوڑا بہت جمع جھٹھا تھا، وہ نقل مکانی میں خرچ ہو گیا تھا، آج مٹھل کو احساس ہونے لگا تھا کہ وہ ایک جوان بیٹی کا باپ بھی تھا، بیوی کی باتوں نے اسے آج واقعی ہلا کر رکھ دیا تھا تاہم

بولا۔ ”کیمینی تیری جرات کیسے ہوئی ہماری ایک باندی کو دوسرے کے حوالے کرنے کی ٹوٹنے ہماری عزت سے کھیلنے کی کوشش کی ہے..... بول اب تیرا کیا حشر کروں، اب تو سدھوراں کی خالی جگہ پر کرنی پڑے گی۔“ ڈاکٹر فوزیہ اس کی دھمکی پر لرز اٹھی تاہم وہ اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے بولی۔

”دیکھو سدھوراں کی مرضی یہی تھی، وہ شادی کر کے اپنا گھر بسانا چاہتی تھی، تم اس پر رحم کھاؤ اور خدا سے ڈرو۔“

”میری بات سن.....! اپنی بکواس چھوڑ.....“ جہاں دادا اگلے ہی لمحے اس کی بات نہ آن سنی کرتے ہوئے خوں فشاں لہجے میں بولا۔ ”ہم پرویز کا پتہ چلا کر رہیں گے، اگر تیرے بات جھوٹ نکلی تو یاد رکھنا پھر سدھوراں کی جگہ میں تیرے کو اپنے ساتھ گوتھ لے جا کر حویلی میں قید کر دوں گا سمجھی.....؟“ یہ کہہ کر اس نے اپنے کارندوں کو چلنے کا اشارہ کیا پھر جب بد معاش یہاں سے جانے لگے تو ڈاکٹر فوزیہ بری طرح پریشان ہو گئی اور جلدی سے چار پارے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مجھے..... یہاں.....؟“ مگر اس کی بات مکمل نہ ہو سکی، وہ سب طوفانی بگولوں کی طرح باہر نکلتے چلے گئے تھے اور باہر سے وہ آہنی دروازہ بھی بند کر دیا گیا تھا، دوسرے دن لمحے ڈاکٹر فوزیہ کو گاڑی کے اشارت ہونے کی آواز سنائی دی، وہ زور زور سے دروازہ پیٹنے لگی اور ساتھ ہی چیختے چلانے بھی لگی مگر بے سود..... جلد ہی اسے یہ اذیت ناک احساس ہوا کہ یہ منحوس جگہ یقیناً آبادی سے کوسوں دور ہے۔ گاڑی کی آواز دور ہوتے ہوتے بالکل معدوم ہو گئی تھی، اب پھر ہر سو گہرے سنائے کا راج تھا۔

☆=====☆=====☆

ایک روز شام کو مٹھل ذرا جلدی گھر لوٹا تو خلاف معمول اس کی بیٹی ملوکاں کی بجائے اس کی بیوی عجیباں نے اس کے آگے روٹی کی ڈلیا رکھی جبکہ ملوکاں رسوئی کے اندر موجود تھیں مٹھل منہ ہاتھ دھونے کے بعد اپنے کاندھے پر پڑے میلے سے انگو پیچھے سے ہاتھ منہ دھو کر ہوا کھری چار پائی پر آ بیٹھا اور خاموشی سے روٹی کھانے لگا۔ عجیباں اس کے قریب بیٹھی بیٹھی پڑ سوچ نکالوں سے شرم کو روٹی کھاتا ہوا دیکھ رہی تھی، اس کے چہرے پر گہری سوز کی کیرروں کا جال سا بنا ہوا تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے شوہر سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ جب مٹھل کھانے سے فارغ ہوا تو عجیباں اسے جست کے ایک میزے پر

چار پائی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ عجیباں نے کچھ کہنے کے لیے لب واکے ہی تھے کہ مٹھل نے ہاتھ بلند کر کے اسے خاموش رہنے کے لیے کہا۔ ”بس اب آچہ خان کا اس گھر میں بالکل کوئی نام نہ لے۔“ یہ کہہ کر وہ بھناتا ہوا جب اپنی کوٹھری میں داخل ہونے لگا تو رسوئی کی طرف منہ کر کے ملوکاں کو حقہ تازہ کر کے لانے کے لیے کہا۔

ملوکاں کافی دیر سے رسوئی کے اندر بظاہر کام میں مصروف یہ سب باتیں سن رہی تھی، اسے اپنے بڑے بھائی خالقو کے ساتھ اب اپنی ماں بھی بری لگنے لگی تھی، وہ سمجھ گئی کہ دونوں ماں، بیٹی کی آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھ چکی ہے اور وہ دونوں باپ کے خلاف محاذ بنائے ہوئے ہیں، ان حالات نے ملوکاں کو بھی ضدی اور سرکش بنا دیا تھا، ملوکاں نے ماں سے جھگڑا کرنا مناسب نہ سمجھا البتہ اس کی ماں نے بڑی چالاکی سے اسے بعد میں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی تھی تاکہ اسے آچہ خان سے شادی کے لیے راضی کر لے پھر مٹھل کچھ نہیں کر پائے گا مگر ملوکاں بھی آخر عجیباں کی بیٹی تھی، وہ سردست ماں کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی اس سے جھگڑنا..... کیونکہ ملوکاں، باپ اور بھائی کے گھر سے جانے کے بعد سانول سے ملنے کے لیے پانی بھرنے کے بہانے کافی دیر تک باہر رہتی تھی اور باپ، بھائی کے لوٹنے سے پہلے ہی گھر آ جاتی تھی، ماں اسے کچھ نہیں کہتی تھی مگر پھر ملوکاں نے دل مسون کر سوچا کہ سانول کے پاس اب وہ بھلا کیونکر جاسکتی تھی، پتہ نہیں کیوں وہ اسے اپنے در سے دھنکارتا ہے شاید اس کی مگتیر سداھوراں کی بے وفائی نے اسے اس قدر عورت ذات سے بد دل کر دیا ہے کہ اسے شاید اب ہر عورت سے نفرت ہو گئی تھی حتیٰ کہ اپنی بے وفامگتیر سداھوراں سے بھی..... اس کی اسی روش نے ملوکاں کو بھی خود سداھوراں بنا دیا تھا، اس نے بھی دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، وہ اس پتھر کو پکھلا کر رہے گی، اب اس کے پاس آچہ خان سے چھٹکارا پانے کا یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ وہ کسی طرح سانول سے شادی کر لے، اب وہ دوسرے خطوط پر سانول کو راضی کرنے کا سوچ رہی تھی۔

انسان خطا کا پتلا ہے اور رہے گا، یہ زندگی کی حقیقتیں ہیں، تلخ حقیقتیں.....! محبت کا معیار زندگی ایسے حالات میں تیزی سے بدلتا ہے، ملوکاں کے ساتھ بھی یہی ہوا، اگرچہ وہ سانول سے محبت کرتی تھی مگر سانول، سداھوراں کی بے وفائی کے بعد سے بالکل قوطی اور اپنے خول میں بند ہو کر رہ گیا تھا، اس طرح وہ ملوکاں سے مسلسل بے اعتنائی برت رہا تھا، اب جبکہ گھر میں آچہ خان کا معاملہ زور پکڑنے لگا تھا تو ملوکاں کو تشویش لاحق ہونے لگی تھی کہ ہنسک وہ ماں اور بھائی کی لالچی طبیعت کی بھینٹ نہ چڑھ جائے، وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ

وہ ذرا امید بھرے لہجے میں بولا۔ ”ڑی عجیباں.....! کہتی تو تو برابر ہے، اب اس کا صل بھی ہی بتا مجھے.....“

شوہر کو چاروں شانے چت گرتے پا کر عجیباں کا مقصد پورا ہو گیا اور وہ ذرا ٹھہر کر بولی۔ ”میری اکڑ والی بات یاد رکھی ہوئی ہے ناں تو نے.....؟“

”ہاں..... ہاں.....! بھلا کون اکڑ رہا ہے.....؟“ مٹھل نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”تو اکڑ دکھا رہا ہے ملوکاں کے پیو.....!“ عجیباں نے جیسے فوراً مطلب کی بات پر آتے ہی اسے یاد دلایا تو مٹھل بے چارہ گوگو کے عالم میں اس کا منہ تنکنے لگا۔

”اچڑیں ملوکاں کو بیاتنے کا اب یہی ایک طریقہ ہے کہ ہم جس کسی کو بھی اس کا سنگ دیں، وہ اس کا ہمیں کم از کم اتنا عیوضہ (روپیہ) تو دے کہ ہم آسانی کے ساتھ اس فرض کو پورا کر سکیں اور عیوضہ بھی ہمیں پہلے ملنا چاہئے تاکہ ہم بھی کچھ بیٹی کو دے دلا کر اسے آگے پرانے گھر کا کر سکیں۔“

”ایسا کون ہوگا بھلا جو ہماری یہ شرطیں مان لے.....؟“ بیٹی کے معاملے میں بے چارے مٹھل کی عقل واقعی ماری گئی تھی۔

عجیباں چند ثانیے توقف کے بعد بولی۔ ”آچہ خان.....!“

”کک..... کیا..... یہ..... یہ تو نے کس کتے کا نام لے لیا، مجھے تو اس کہنے کی صورت سے ہی نفرت ہے۔“ مٹھل نے یکدم چراغ پا ہو کر کہا۔

عجیباں فوراً منہ بسورتے ہوئے تند لہجے میں بولی۔ ”دیکھا..... دیکھا.....! تیری یہی اکڑاچڑیں ملوکاں کے لیے تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔“

”اللہ سائیں نہ کرے تو کیوں ایسے منحوس الفاظ زبان سے نکالتی ہے۔“ مٹھل نے فو اسے ڈانٹا۔

”یہ منحوس الفاظ نہیں ہیں ملوکاں کے پیو.....! میں حقیقت بیان کر رہی ہوں، پورے گوٹھ میں آچہ خان کے سوا کوئی ایسا چنگا مڑس نہیں ہے جو ملوکاں کا پورے دو لاکھ عیوضہ دینے پر تیار ہو اور وہ بھی وقت سے پہلے..... بس ہماری زبان دینے کی دیر ہے۔“

”ہرگز نہیں.....! اس بڈھے سے اچڑیں ملوکاں کا بیہ ہرگز نہیں کروں گا اور تو بھی کان کھول کر سن لے خالقو کی ماں.....! میں خوب جانتا ہوں تیرے کو یہ پٹی کس نے پڑھائی ہے، میں اب تم ماں بیٹے (خالقو) کی سازش سمجھ گیا ہوں۔“ مٹھل ایک دم چراغ پا ہو کر

بے چارہ پہلے ہی بوڑھا اور کمزور تھا، وہ بھلا کب تک اس کی ڈھال بن سکتا تھا چنانچہ ملوکاں نے اب سانول کو دوسرے طریقے سے رام کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اس نے سانول کے ماما اللہ رکھیو سے ملاقات کرنے کا ارادہ کیا۔

وہ رات ملوکاں نے بے چینی میں کروٹیں بدل کر گزاری، صبح ہوئی، خالقو تو حسب معمول نکل گیا اور اب ملوکاں اپنے باپ مٹھل کے کھیتوں پر جانے کا انتظار کرنے لگی لیکن مٹھل اس روز کھیتوں پر نہ جاسکا، اسے بڑا تیز بخار تھا، ویسے بھی وہ آج ساری رات ہی کھانا سٹا رہا تھا، عجیبیاں نے شوہر کا حال نہ پوچھا البتہ ملوکاں، باپ کو دیکھنے کوٹھری میں داخل ہوئی۔ مٹھل بے چارہ ایک کونے میں پڑا پڑی طرح کھانے جا رہا تھا، ملوکاں جلدی سے پانی کا گلاس لے کر باپ کے پاس آئی اور اسے سہارا دے کر گلاس اس کے منہ سے لگا دیا، اسے اپنے باپ کا بوڑھا وجود آگ میں تپتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ”پیو.....! تیرے کو تو بہت تاپ چڑھا ہوا ہے، چل اٹھ میں تیرے کو حکیم جی کے پاس لے کر چلتی ہوں۔“ اس نے پریشان ہو کر کہا۔

”تو کہاں جائے گی میرے ساتھ میں خود ہی چلا جاتا ہوں۔“ مٹھل کھانسی کے درمیانی وقفوں میں پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولا۔ ”دھیئے.....! تو ذرا میرا حق لادے، میرا بدن ٹوٹ رہا ہے۔“

”نہیں پیو.....! میں اب تجھے حقہ نہیں پینے دوں گی، چل میرے ساتھ پہلے حکیم جی سے دوائی لے کر آتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے باپ کو سہارا دے کر اٹھایا تو مٹھل کھڑے ہو کر اپنی لاک (تہبند) سے بندھی گانٹھ کو ٹٹولنے لگا۔

”اڑے میں نے کچھ روپے باندھ رکھے تھے، دیکھ ذرا دھیئے! ادھر کہیں گرے ہوں گے۔“ وہ پریشان ہو کر بیٹی سے بولا۔

ملوکاں ادھر ادھر روپے تلاش کرنے لگی مگر اسے روپے کہیں نظر نہ آئے۔ ”پیو.....! روپے تو کہیں نظر نہیں آ رہے، پھر میں ماں سے پوچھتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ باپ کو سہارا دینے جنگ و تار یک کوٹھری سے باہر آئی۔

عجیبیاں صحن میں موجود تھی، وہ ماں سے بولی۔ ”امڑ.....! پیو کے پیسے پتہ نہیں کہاں گر گئے ہیں، تیرے پاس ہوں گے تھوڑے سے دے تو ہم جا کر حکیم سے دوائی لے آئیں، پیو بڑا تیز تاپ چڑھا ہے۔“

”میرے پاس کدھر سے آئے پیسے.....؟“ وہ منہ بسور کر بولی۔

”عجیبیاں.....! میں نے رات کو تجھے سو روپے کا نوٹ دیا تو تھا اسی میں سے ہی دے دے تھوڑے.....“ مٹھل اپنی کھانسی ضبط کرتے ہوئے ہانپتی آواز میں بولا۔

عجیبیاں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”گھر کا سودا نہیں لانا تھا آٹا، دال سب کچھ ہی تو ختم تھا، میں نے سو روپے خالقو کو دے دیا، وہ سودا لے کر آئے گا۔“

”مگر امڑ.....! اب پیو کی دوائی کیسے آئے گی، حکیم جی مفت میں تو نہیں دیں گے؟“ ملوکاں نے دکھی دل کے ساتھ ماں سے کہا۔

”میں کیا جانو، تیرے پیو نے اپڑیس پٹ خالقو سے بنا کر رکھی ہوتی تو وہ اسے خود لے جاتا نا حکیم کے پاس، اسی لئے تو سمجھاتی ہوں اسے، بڑھے ہو کر جوان اولاد پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔“

”خبردار عجیبیاں.....! آگے ایک لفظ بھی ٹوٹنے نکالا تو.....!“ بیوی کی بات سن کر مٹھل یکدم چراغ پا ہو کر چلایا تو اسے بڑی شدت کے ساتھ کھانسی کا دورہ پڑ گیا اور وہ اپنا سینہ تھامے کھانسی کھانسی کر بے حال سا ہو گیا۔

ملوکاں، اماں کے سنگد لاندہ رویے پر سلگ اٹھی اور اس سے تیز لہجے میں بولی۔ ”امڑ.....! کچھ تو خیال کر پیو کی حالت دیکھ جو منہ میں آ رہا ہے، بولتی چلی جا رہی ہے۔“

”ہاں.....! بڑی آئی اپڑیس پیو کی وکلیت کرنے والی.....! یہ تجھے اپڑیس ضد کے آگے بوڑھا کر ڈالے گا جب تیرے کو پتہ چلے گا کہ تیرا جن کون تھا۔“ عجیبیاں نے ہاتھ نچا کر کہا۔

”امڑ.....! تو کیا چاہتی ہے میں ایک بڑھے اوباش سے بیاہ دی جاؤں تاکہ تم دونوں ماں، بیٹے کی مٹھی گرم ہو جائے.....؟“ ملوکاں کو بھی ماں کی خود غرضی پر غصہ آ گیا، وہ باپ کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

”ہاؤ.....! ہاؤ.....! تجھے پھر کوئی شہزادہ آئے گا بیانے.....! ناں.....؟“

”میں کہتا ہوں بکواس بند کر اپڑیس، جوان دھی سے اس طرح بولتے ہیں شرم کر.....“

مٹھل سینہ تھام کر غصیلے لہجے میں بولا اور پھر کھانسنے لگا۔ عجیبیاں منہ بسورتی ہوئی اندر کوٹھری میں چلی گئی۔

”دھیئے.....! اب رہنے دے نہیں جاتے حکیم کے پاس، پیسے تو ہیں نہیں، وہ دوا کیسے دے گا.....؟“ مٹھل نے کھانسی کے درمیان ایک ایک کر ملوکاں سے کہا تو ملوکاں کا دل کٹ کر رہ گیا لیکن وہ بھی تہیہ کر بیٹھی تھی بیمار باپ کو حکم جی کے پاس لے جانے کا لہذا بولی۔

کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں، اب اس کا بھی ماتھا ٹھنکا، اسے اس بات کا پورا یقین ہو چلا تھا کہ وہ انڈین بارڈر سیکورٹی فورس والوں کی نظروں میں آ گیا ہے جو اب تیز رفتار جیپوں میں اس کا تعاقب کر رہے تھے، عقب سے اب مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔

”چور سپاہی“ کی اس خندوش صورت حال پر سارنگ گہری تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا، عقب سے اندھا دھند برسائی جانے والی گولیاں اس کے لگ سکی تھیں مگر یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ابھی تک ایسی مہلک اور بھولی بھنگی ہوئی گولی سے بچا ہوا تھا لیکن ظاہر ہے زیادہ دیر ایسا نہیں ہو سکتا تھا لہذا وہ اب خود بھی یہی چاہ رہا تھا کہ اس کا اونٹ ر کے بغیر دوڑتا رہے۔

مگر اچانک ایک گولی اس کے صحرانی جہاز کے لگ گئی پھر نجانے اس کے اونٹ کو کتنی گولیوں نے زخم پہنچائے کہ دوسرے ہی لمحے وہ دل دہلا دینے والے انداز میں زور سے چیخا اور ڈھتا چلا گیا، یہ تو شکر ہوا کہ سارنگ اس کے گرتے ہوئے پہاڑ جیسے وجود تلے آنے سے بچ گیا، اونٹ کے اچانک لڑھک کر گرتے ہی سارنگ بھی لڑھکنیاں کھاتا ہوا ریت میں خاصی دور تک چلا گیا تھا، اس کا دماغ بری طرح جھنجھٹا کر رہ گیا تھا مگر اسے چند خراشوں کے سوا کوئی خاص چوٹ نہ آئی تھی مگر یہ کیا کم تھا کہ وہ اب اپنے نامعلوم حملہ آوروں کی گرفت میں جانے والا تھا، ریت اس کے منہ، آنکھوں اور نتھنوں میں گھس گئی تھی، وہ ابھی اپنا ریت سے اٹا ہوا چہرہ جھٹک رہا تھا کہ اچانک کئی آہنی نالوں کی اس نے اپنے وجود میں چھن محسوس کی اور بے اختیار اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

وہ سب چھ سات کی تعداد میں تھے، ان کے جسموں کی مخصوص وردی انہیں سرحدوں کا نگہبان ثابت کر رہی تھی، یہ لوگ انڈین بارڈر سیکورٹی فورسز کے اہلکار تھے، ان کے چہروں پر حد درجے سفاکی اور درشتی چھائی ہوئی تھی، قریب ہی ان کی دو میا لے رنگ کی بغیر ہڈوانی جیمیں بھی کھڑی تھیں۔ سارنگ کا دماغ ہنوز چکرار ہا تھا۔ ”کھڑے ہو جاؤ، خبردار کوئی غلط حرکت کی تو گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔“ ان میں سے ایک نے کراخت لہجے میں سفاکی سے کہا۔ سارنگ اپنا سر جھٹکتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا، اس کا دل اب بری طرح دھک دھک کر رہا تھا، وہ ہراساں سی نظروں سے ان سب کے قہر آلود چہروں کو نکتے جارہا تھا، ان کی آنکھوں میں ہلاکی سفاکی اور درشتی کھنڈی ہوئی تھی۔

”مدن.....! اس کی تلاشی لو.....“ معاً ان میں سے ایک نے جو وردی پر لگے مخصوص اور اضافی پھولوں کی وجہ سے ان کچھ فیلڈ آفیسر لگتا تھا، اپنے ایک ساتھی سے تمکنا نہ لہجے میں کہا تو اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی مگر سارنگ کے پاس سے ایک چھوٹے سے شکاری چاقو کے

”نہیں بیو.....! تو چل تو سہی، ہو سکتا ہے حکیم جی کو ہماری غریبی پر ترس آ جائے بیو“ خنہ زرا میں ابھی آئی۔“ ملو کاں گھبرا سی گئی تھی اسی لئے اسے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا اب مٹھل سے بھی بولا نہیں جارہا تھا، اس پر اب دے کا سادو رہ پڑنے لگا تھا، اگلے ہی منٹ اس کی ٹانگیں کپکپانے لگیں، وروہ زمین پر ڈھے گیا۔

ملو کاں پریشان ہوئی، اس نے ہسٹریائی انداز میں ماں کو پکارا۔ ”امڑ..... بیو کو سنبھرا..... جلدی آ.....!“ مگر کوٹھری میں خاموشی چھائی رہی البتہ اندر سے حقہ گڑ گڑانے کی آواز آ رہی تھی، ملو کاں کا دل ڈوبا جا رہا تھا، باپ کی حالت پر جواب شکستہ سے فرش پر پڑا بری طرح بانپ رہا تھا جیسے میلوں دور کا سفر کر کے آیا ہو۔ ملو کاں روتی چلاتی ہوئی جھگی سے باہر دوڑی اور قریب ہی بنی چاچا سکھو کی جھگی میں داخل ہو گئی، وہاں چاچا سکھو کام پر جانے کی تیاری کر رہا تھا اور اس کی بیٹی میراں اسے روتی سے بندھا دسٹر خوان نما کپڑا اتھا رہی تھی۔

”چاچا.....! بیو کی حالت..... بہت..... بہت خراب ہو رہی ہے۔“ ملو کاں نے دروازے سے چیخ کر روتے ہوئے کہا۔ چاچا سکھو اس کی طرف دوڑا، میراں اور اس کی ماں بھی پریشان ہو کر بھاگیں، یہ لوگ سب مٹھل کی جھگی میں داخل ہوئے، دیکھا مٹھل زمین پر بے سدھ پڑا ہے، ملو کاں نے ہراساں لگا ہوں کے ساتھ اپنے باپ کو دیکھا، جو کچھ پہلے دے کے زیر اثر بری طرح بانپ رہا تھا مگر اب وہ پُرسکون ہو گیا تھا، ملو کاں کا دل دھک سے رہ گیا۔

”بیو..... بابا.....!“ دوسرے ہی لمحے ملو کاں نے دلخراش چیخ کے ساتھ باپ کو پکارا۔ وہ اس کے بے جان جسم پر گر کر رونے لگی، مٹھل کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، وہ مر چکا تھا۔

☆ ===== ☆

اچانک: معلوم سمت سے گولیاں چلنے کی تڑتڑاہٹ ابھری..... سارنگ بری طرح ٹھنکا..... اپنے چہرے کے بالکل قریب سے گولیوں کی صاف جھپک محسوس ہوئی تھی پھر اگلے ہی لمحے اس کا اونٹ بری طرح چلایا اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا، گولیوں نے خوفناک گھن گرج نے اسے یکدم بدحواس کر ڈالا تھا جسے سارنگ نے اپنے حق میں بھڑی سمجھا تھا مگر وہ اونٹ کی اس اچانک رفتار سے ہکھلا بھی گیا تھا، وہ اس کے اونچے خڑک کو ہان سے چمٹا ہوا تھا، اس میں اتنا بھی حوصلہ نہیں تھا کہ وہ فائرنگ کرنے والوں کو گردن موڑ کر دیکھ لے، اچانک اس کے عقب میں پھر فائرنگ ہونے لگی اور ساتھ ہی گھر گھر اہنڈ

اچانک سارنگ کو ایسا لگا جیسے عین اس کے سر پر روشنیوں کا سیلاب اُمڈ آیا ہو، اسے اپنی آنکھوں میں شدید جھپٹن کا احساس ہونے لگا، بے اختیار اس نے اپنے ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانچا چاہا مگر آنا فانا اس کے دونوں ہاتھوں کو پشت پر کس کر باندھ دیا گیا بلکہ اس کی دونوں ہاتھیں بھی اسٹول کے ساتھ مضبوطی سے کس دی گئیں، اب وہ اور اسٹول دونوں لازم ملزوم ہو گئے تھے، سارنگ کو اب روشنیوں کے اندتے ہوئے سیلاب کے سوائے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، وہ جان گیا تھا کہ یہ اچانک اُمڈتا ہوا سیلاب اس کے عین سر کے اوپر جھولتے کنوپ کی کارستانی تھی جس کا مرضی کے مطابق زاویہ بدلا جاسکتا تھا، اچانک سارنگ کے کانوں میں فوجی افسر کی درشت آواز گونجی۔ ”اب میں جو پوچھوں، اس کا بغیر کے جواب دیتے جانا۔“ یہ کہہ وہ اپنے ایک ساتھی اہلکار کو مخاطب کر کے بولا۔ ”اشوک.....! صندوق ادھر کرو اور اس میں سے ایک کانٹوں والا ہنٹر نکال کے دو۔“

”یس سر.....!“ اشوک کی مستعد آواز ابھری۔

”کون ہو تم.....؟“

”میں تھری واسی (تھرکار ہنے والا) ہوں۔“ سارنگ نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔

”یعنی پاکستانی ہو.....؟“

”ہاں.....!“

”تمہارے اور کتنے ساتھیوں نے سرحد پار کرنے کی کوشش کی ہے؟“

”میں..... میں اکیلا تھا۔“

”تم اسمگلر ہو یا جاسوس.....؟“

”نن..... نہیں..... میں تو محض راستہ بھٹک کر ادھر آ نکلا ہوں، میں ایک عام انسان ہوں۔“

سارنگ نے ابھی اتنا ہی جواب دیا تھا کہ اچانک اس پر جیسے کانٹے دار ہنٹروں کی بارش شروع ہو گئی، کمرہ سارنگ کی اذیت ناک چیخوں سے گونج اٹھا، خاردار ہنٹر کی پے در پے ضربوں نے اس کے وجود کو چھلنی کر کے رکھ دیا تھا، اس کے کپڑے پھٹ چکے تھے، وہ اسٹول سمیت سیلن زدہ فرش پر گر پڑا تھا، درد اور کرب کی روح کش لہریں اسے اپنی رگیں کاٹی ہوئی محسوس ہونے لگیں، اس میں تو اب چیخنے کی بھی ہمت نہ رہی تھی، اس کا دماغ مایوس ہو چکا تھا، اگلے ہی لمحے وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

”مدن، اشوک.....! اسے ہوش میں لاؤ۔“ انڈین آفیسر کی تحکمانہ آواز گونجی، اس

سوا اور کچھ ہاتھ نہیں لگا تب اس ملٹری آفیسر نے ذرا آگے بڑھ کر سارنگ کے چہرے پر زور سے پتھر سید کر دیا، اس کا ہاتھ بھاری ثابت ہوا، پتھر کھا کر سارنگ چند قدم پیچھے کھڑا ہوا، وہ توازن قائم نہ رکھ سکا اور ریت پر گر گیا، فوجی آفیسر کے چہرے پر کڑھکی کم نہیں ہوئی تھی، اس نے اپنے ہاتھوں میں پکڑی جی تھری کی مہیب نال ریت پر کمرے کے بل گرے سارنگ کے سینے سے لگا دی اور لہجی پرانگی رکھ کر سفاکانہ غراہٹ سے گھورتے ہوئے بولا۔ ”کون ہو تم اور اس طرح مجرمانہ انداز میں تم نے سرحد پار کرنے کی جرأت کیسے کی.....؟“

سارنگ بے چارہ بری طرح بدحواس ہو رہا تھا، اسے صورت حال کی نزاکت کا پورا احساس تھا تاہم وہ لینے لینے اس سے لرزتی آواز میں بولا۔ ”مم..... میں..... ایک تھری واسی (تھرکار ہنے والا) ہوں، میرا اونٹ بے قابو ہو گیا تھا اور.....!“

”بکواس بند کرو اپنی.....“ وہ آفیسر زور سے گرجا پھر اپنے ساتھیوں کو مخصوص اشارہ کرتے ہوئے قریب کھڑی جھپوں کی طرف بڑھ گیا، اس کے ساتھیوں نے اپنے افسر کا مخصوص اشارہ سمجھتے ہی سارنگ کو دبوچ کر اٹھا اور جیب میں لا کر اپنی چوکی کی طرف روانہ ہو گئے۔

چوکی زیادہ دور نہ تھی، یہ ایک گارے منی کی نیم شکستہ سی مستطیل نما عمارت تھی، جس کے چاروں کونوں پر چھ پائی چھ کی گول کوٹھریاں نما مورچے بنے ہوئے تھے جن کے روشندانوں کے اندر سے اسٹین گنوں کی نالیں جھانک رہی تھیں، ایک جانب بڑا سا انڈین ملٹری کا ٹرک بھی کھڑا تھا، سارنگ کو نیچے اتارا گیا، سارنگ نے دیکھا عمارت کی چھت پر بھی ریت کی بوریوں سے مورچے بنائے گئے تھے، وہاں بھی چند اہلکار موجود تھے، ایک دو نے اپنے ہاتھوں میں طاقتور دوربینیں بھی پکڑ رکھی تھیں، چھت کے عین وسط میں اسٹینا بھی نصب تھا اور ایک چھوٹا سا اسلکی رابٹل کے لیے ٹاور بھی نظر آ رہا تھا۔

سارنگ کو رائفل کے کندے مار کر عمارت کے اندر لایا گیا، وہ ایک بڑے کمرے سے گزر کر ایک پتلی سی سیلن زدہ راہداری میں آ گیا، یہاں سے اسے ایک دوسرے نسبتاً تنگ و تاریک کمرے میں دھکیل دیا گیا، یہ لوہے کا سلاخ دار دروازے والا کمرہ تھا جس کے وسط میں ایک آئرن اسٹول رکھا ہوا تھا اور چھت سے ایک کنوپ سا جھول رہا تھا، کمرے میں ان دونوں اشیاء کے سوا اور کچھ نہ تھا، روشندان تک نہ تھا، سارنگ کو دھکیل کر اسٹول پر بٹھا دیا گیا، سارنگ بری طرح پریشانی اور گھبراہٹ کا شکار تھا، وہ لوگ سب اندر داخل ہو کر اس کی طرف کینہ تو نظروں سے دیکھ رہے تھے، وہ آفیسر بھی دونوں نالگیں پھیلائے اس کے سامنے کھڑا اسے غضب آلود نظروں سے گھور رہا تھا، کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی پھر

نے ہاتھ روک لیا تھا اور بھینسے کی طرح ہانپ رہا تھا، سارنگ اسٹول سمیت بندھا ہوا فرش پر بے سدھ پڑا ہوا تھا، اسے سیدھا کر کے پشت سے سہارا دے کر بٹھا دیا گیا پھر ایک پانی سے بھری بالٹی اس کے چہرے پر اچھا دی گئی، اسٹول کو اب کسی مخصوص طریقے سے فرش پر نصب کر دیا گیا تھا تاکہ سارنگ کا وجود اسٹول پر صرف جھول کر رہ جائے مگر وہ گرے نہیں، دو تین بالٹیاں پانی کی سربراہی لینے کے بعد سارنگ کو ہوش آ گیا، وہ اب بری طرح ہانپ رہا تھا، اس میں تواب بولنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔

”اب جو میں بولوں، تم نے وہی دہرانا ہے ورنہ تمہارے ہاتھوں، پیروں کے سارے ناخن کھینچ دیئے جائیں گے۔“ انڈین افسر کی سفاک آواز گونجی اور ایک بار پھر سارنگ بری طرح دہشت زدہ نظر آنے لگا۔

”تم پاکستانی انٹلیجنس کے ایک جاسوس ہو اور غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے آئے ہو۔“

”ہرگز نہیں.....! یہ جھوٹ ہے.....“ سارنگ نے وحشت زدہ ہو کر کہا۔

”ہوں.....!“ ایک سرسراہٹ ہوئی آواز گونجی۔ ”مر لی.....! جمجوری لے کر آؤ۔“

تھوڑی دیر بعد سارنگ کو یوں لگا جیسے اس کے پیر کے ایک انگوٹھے کو کسی آہنی جمجوری سے پکڑ لیا ہو پھر چانک ہی ایک جھٹکے سے کسی نے اس کا ناخن اس آہنی جمجوری سے کھینچ لیا، اذیت کی ایک قیامت خیز لہر اس کے وجود کو چیرتی ہوئی روح تک اتر گئی اور وہ ایک دھڑلاں چیخ مار کر اسٹول پر بیٹھا بری طرح تڑپنے لگا، اسٹول زمین کے ساتھ نصب کر دیا گیا تھا اور وہ اسٹول سے بندھا ہوا تھا، ایسے میں اس سے پوری طرح سے تڑپا بھی نہیں جا رہا تھا، ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر ہی تکلیف کے احساس کو ذرا کم کیا جاسکے مگر ظالم اسے تڑپنے بھی نہیں دینا چاہتے تھے، اب تکلیف اور زیادہ محسوس ہونے لگی، سارنگ کا پورا وجود جان کنی کے عالم میں تڑپنے لگا، ناخن کھینچے انگوٹھے سے بھل بھل خون جاری تھا اور سارنگ کو جیسے نا کے جھٹکے لگ رہے تھے، وہ انڈین آفیسر اور وہاں موجود دیگر اہلکاروں کو قہر و غضب کے عالم میں دھمکیاں اور گالیاں دے رہا تھا، اس کے اندر کی روح کش اذیت نے یکا یک آتش فشاں کا روپ دھار لیا تھا مگر وہ بے بس تھا، جنون، جوش غیظ اور اذیت ناک تکلیف سے اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا اور پھر اس کا سر اسٹول پر بندھے بندھے ایک طرف ڈھلک گیا، وہ دوبارہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

اسی دن سے سدھوراں اپنے شوہر کی طرف سے کھٹک گئی تھی مگر اس نے سہرے سے اپنے شوہر سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا تھا مگر وہ خود اس کے کچھ ”کہنے“ کی منتظر تھی پھر یہ اس سے اگلے دن کا ذکر تھا، دونوں میاں، بیوی کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں لیٹے تھے، پرویز نے سگریٹ سلگائی اور دو تین گہرے گہرے کش لینے کے بعد سدھوراں سے بولا۔ ”سدھوراں.....! تمہیں یاد ہو گا میں نے تم سے ایک دن کہا تھا کہ ہمیں بعض تلخ حقیقتوں کا ایک سمجھوتے کے تحت سامنے کرنا پڑتا ہے ورنہ زندگی گزارنا مشکل ترین کام بن جاتا ہے، جس طرح میں تمہارے کام آیا اور تم سے شادی کر کے تمہارے ہوئے والے نا جائز بچے کی جائز صورت بنا ہوں، اب تمہارا بھی یہ فرض بنتا ہے کہ تم بھی میرے کام آؤ۔“

سدھوراں کے تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل میں جیسے ایک گھونسا لگا، پرویز کا بار بار یہ جتنا کہ اس نے اس سے شادی کر کے اس پر احسان کیا اور اس کے ہونے والے بچے کو باپ کا نام دیا، سدھوراں کے لیے ہمیشہ ذہنی اذیت کا سبب بنتا تھا مگر وہ جواباً کسی قسم کی تلخ گوئی نہیں کرنا چاہتی تھی، وہ بدستور خاموش رہی۔

”تم میری بات کا مطلب سمجھ رہی ہوناں سدھوراں.....؟“ معا پرویز سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر دھوئیں کے کثیف مرغولے فضا میں بکھیرتا ہوا بولا، اس کی نظریں سدھوراں کے گم صم سے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”جی..... جی.....! ہاں.....“ سدھوراں کے حلق کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نکلا۔

”سدھوراں.....! یوں تو میں ایک ہوٹل کا مالک ہوں مگر سچی بات یہ ہے کہ مجھے ہوٹل سے کوئی خاص آمدنی نہیں ہوتی، تم میری بیوی ہو اور اب میری ہم راز بھی اور اب جو بات میں تمہیں بتانے والا ہوں، مجھے یقین ہے تم اپنی اور اپنے ہونے والے بچے کی بہتری کی خاطر وہ بات کسی سے نہیں کرو گی۔“ وہ اتنا کہہ کر تھا پھر بولا۔ ”میرا اصل دھندا منشیات فروش کا ہے اور میرے شہر میں منشیات اور جوئے کے کئی اڈے بھی ہیں۔“ اس نے جیسے انکشاف کیا اور سدھوراں اندر سے دہل سی گئی، وہ چونک کر پرویز کا چہرہ دیکھنے لگی، یہ سوچ کر اس کا دل گھٹ کر رہ گیا تھا کہ وہ ایک منشیات فروش کی بیوی تھی۔

”سدھوراں.....! اس بھرے پُرے شہر میں زندگی گزارنا بہت مشکل ہے، یہ کوئی ایک چھوٹا سا گوتھ نہیں ہے کہ جہاں برائے نام اخراجات ہوں، یہ شہر ہے، یہاں تو پانی بھی ہمیں سے ملتا ہے، یہاں دو نمبر کے دھندے کے بغیر گزارہ مشکل ہے اور پھر جب تمہارا بچہ پیدا ہو گا تو میں اسے اچھے سے اسکول میں داخل کرادوں گا، اسے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی

”سائیں.....! تو کیا اس شہر کے سبھی لوگ دو نمبر کا دھندا کرتے ہیں؟“ سدھوراں نے بظاہر سادہ لوحی سے پوچھا۔

”تقریباً.....! جو لوگ نہیں کرتے، وہ کسی فٹ پاتھ یا گٹر کے کنارے قابلِ رحم زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔“ پرویز نے تلخ لہجے میں کہا مگر سدھوراں اس کی بات سے بالکل متفق نہ تھی کیونکہ اس نے اپنی محنت ڈاکٹر فو زیہ کو بھی دیکھا تھا، وہ محنت اور دیانتداری سے اپنے فرائض کی بجا آوری کرتی تھی اور اللہ کا دیا اس کے پاس سب کچھ تھا۔

”کیا سوچ رہی ہے سدھوراں.....؟“ اچانک پرویز نے اس کے گم صم چہرے کو بغور تکتے ہوئے پوچھا۔

”کک..... کچھ نہیں سائیں.....!“ وہ قدرے گڑبڑا کر بولی، پھر ذرا ہمت کر کے اس نے پوچھا۔ ”تو سائیں یہاں سب لوگ اگر غلط دھندا کرتے ہیں تو پولیس انہیں پکڑتی کیوں نہیں.....؟“

”پکڑتی ہے پولیس مگر یہ لوگ اس کی منہی گرم کرتے رہتے ہیں۔“ پرویز نے یکدم کہا۔ ”مجھے بھی ایک پولیس والا آج کل بہت تنگ کر رہا ہے۔“ پرویز اب دھیرے دھیرے مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولا۔ ”وہ بڑا خراٹ آفیسر ہے، اس کمبخت نے آج کل میرا لاکھوں کا دھندا چوٹ کر کے رکھا ہے، میں نے سوچا تھا کہ اس بار مال کی بڑی کھیپ آئے گی تو اسے فروخت کر کے کسی اچھی سی جگہ پر بہت بڑا بنگلہ لوں گا، اس طرح ہم ٹھٹ باٹھ سے رہیں گے تاکہ جب ہمارا بچہ دنیا میں آئے تو ایک ہنستی کھیلتی آرام دہ زندگی گزارے۔“ پرویز نے اس بار دانستہ سدھوراں کے ہونے والے بچے کے لیے ناجائز کی بجائے ہمارا بچہ کی اصطلاح استعمال کی تھی جس پر سدھوراں کو خاطر خواہ دلی تسکین کا احساس ہوا تھا مگر وہ ہنوز پرویز کی طرف سے بے چینی کا شکار تھی، اب اس نے جھک آمیز خاموشی کو بالائے طاق رکھ کر پوچھا۔

”سائیں.....! آپ کھل کر بات کرو ناں..... آخر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہو.....؟“ اس کی بات سن کر پرویز نے سگریٹ کا ایک آخری اور گہرا کش لے کر اسے فرش پر پھینکا اور اپنے پاؤں سے مسلتے ہوئے عجیب سی نظروں سے سدھوراں کی طرف دیکھا پھر ایک اسرار بھری آواز میں بولا۔ ”سدھوراں.....! تھانے کا جو پولیس افسر ہے، اگر وہ کسی طرح راضی ہو جائے تو پھر وہ میرے آگے روڑے نہیں اٹکائے گا دراصل وہ ایک عیاش فطرت

آدی ہے، تو اگر اس کا دل موہ لے تو میرا کام آسان ہو جائے گا۔“

سدھوراں بت بنی شوہر کا منہ نکتنے لگی، اس کے دل و دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کا شوہر اس قدر بے غیرت نکلے گا کہ اپنی ہی بیوی کا سودا کرے گا، وہ ایک دم پلنگ نما چار پائی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے اندر کھولتے ہوئے لاوے پر قابو پاتے ہوئے قدرے ترش روئی سے بولی۔ ”سائیں.....! یہ آپ کیا کہہ رہے..... اپنی عزت کو آپ دوسرے کی جھولی میں ڈالنا چاہتے ہو..... آپ کو شرم آتی چاہئے۔“

”ایسے دھندھوں میں یہ سب چلتا ہے سدھوراں.....!“

”مگر میں نہیں چل سکتی اور تجھے رب سائیں کا واسطہ مجھ سے پھر کبھی دوبارہ ایسی گندی بات نہ کرنا، شہر میں ایسی عورتیں بہت ہیں، کوئی بھی خرید کر اس مردود کی جھولی میں ڈال دے لیکن.....!“

”بکواس بند کر اپنی اور بیٹھ جا میرے سامنے.....“ وفتنا پرویز نے اسے غصیلی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا پھر کھڑے ہوتے ہوئے اس کے ہراساں چہرے پر اپنی برماتی ہوئی نظریں گاڑ کر بولا۔ ”تو کیسی بیوی ہے اپنے شوہر کی خاطر اتنا سا کام بھی نہیں کر سکتی؟“

”یہ اتنا سا کام ہے سائیں.....؟“ سدھوراں روہانے انداز میں بولی۔ ”یہ اتنا سا کام تو میری روح کی موت ہے، اس سے تو اچھا ہے تم مجھے اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ کر مار ڈالو۔“

”تیرا نہیں میں تیرے ہونے والے ناجائز بچے کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر ڈالوں گا۔“ پرویز یکدم ابلی ہوئی آنکھوں سے اسے گھور کر بولا۔ ”اس وقت تیری غیرت اور شرافت کہاں تھی جب تُو نے اپنے بوڑھے ماں، باپ اور اپنے منگیتر کی خاطر ایک وڈیرے زادے کی باندی بنا قبول کر لیا تھا، میں نے تو پھر بھی تیرے ساتھ شادی کر کے تجھے اور تیرے ہونے والے ناجائز بچے پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔“

”سائیں.....! وہ..... وہ..... میری ایک مجبوری تھی.....“ وہ شدید ذہنی کرب کی وجہ سے رو پڑی مگر پتھر دل پرویز کو اس کی حالت پر رحم نہ آیا اور وہ آخری بار فیصلہ کن لہجے میں اس سے بولا۔

”دیکھو سدھوراں.....! تیرے اور تیرے ہونے والے بچے کے لیے یہی بہتر ہے کہ تُو میری بات مان لے ورنہ تُو اپنے بُرے بھلے کی خود ذمہ دار ہوگی اور ہاں اپنی اس ڈاکٹر کی کی ہوا دماغ میں مت رکھنا، وہ بار بار ایسی بد چلن لڑکی کو پناہ نہیں دے گی۔“ طعن و

جہاں دادا کو دیکھ کر سدھوراں کی سانس سینے میں اٹک گئی تھی پھر دوسرے لمحے اپنی بقا کا جذبہ خوف کے جذبے پر حاوی ہونے لگا۔ سدھوراں پھرتی کے ساتھ واپس صحن کی طرف پلٹی، صحن کے ایک کونے سے بیڑھیاں اوپر چھت کی طرف جاتی تھیں، سدھوراں جیتی چلاتی ہوئی بیڑھیوں کی طرف بھاگی اور جلدی جلدی زینے طے کرنے لگی، اس کے عقب میں جہاں دادا اور اس کے ساتھی اندر گھس آئے اور وہ بھی سدھوراں کے پیچھے بیڑھیوں کی طرف لپکے، ایسے نازک اور خطرناک لمحات میں سدھوراں کی حاضر دماغی اس کے لیے سودمند ثابت ہوئی کیونکہ وہ اگلے ہی لمحے چھت پر پہنچ چکی تھی۔ چھت بالکل ساٹھ تھی، اوپر کوئی کمرہ نہ تھا صرف تین فٹ کی چہار دیواری تھی، وہ چھت پر آتے ہی حلق کے بل چیخنے چلانے اور مدد کے لیے شور مچانے لگی۔ یہ گنجان حملہ تھا، گھروں کی دیواریں اور چھتیں تقریباً متصل تھیں، ادھر جہاں دادا اور اس کے ساتھیوں کے لیے یہ بات تشویش کا باعث تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس علاقے میں پٹھان اور ہزارے کے لوگ آباد تھے، اس طرح ایک تنہا عورت کے گھر میں گھسنے پر ان لوگوں کو تھانے لے جانے سے پہلے خود تو واضع کر ڈالتے بس پھر کیا تھا، انہوں نے اسی میں عافیت جانی کہ واپس ہو لیا جائے اور یوں جب تک لوگ اکٹھے ہوئے، جہاں دادا اپنے کارندوں کے ساتھ اپنی جیب میں فرار ہو چکا تھا۔

☆=====☆=====☆

ایک ایک پل ڈاکٹر فوزیہ کے سینے پر بھاری سل کی طرح بیت رہا تھا، اسے اب خود سے زیادہ اپنے ممما، پاپا کی فکر ستانے لگی تھی، وہ اس کی اچانک گمشدگی پر کس قدر ہلکان ہو رہے ہوں گے۔ ڈاکٹر فوزیہ نے رسٹ وائچ پر نگاہ ڈالی اور اس کے اوسان خطا ہو گئے، رات کے بارہ بج چکے تھے، وہ شام پانچ بجے گھر سے نکلی تھی ڈاکٹر جواد کے ساتھ..... اب سات گھنٹے گزر چکے تھے، جہاں دادا اور اس کے کارندوں نے اس کا موبائل بھی چھین لیا تھا ورنہ اپنے ممما، پاپا سے رابطہ کر سکتی تھی، اسے ڈاکٹر جواد کا بھی خیال تھا، جانے وہ کہاں ہوگا۔ ڈاکٹر فوزیہ نے یہ شکر کیا تھا کہ جہاں دادا اور اس کے کارندوں نے اس کے ہاتھ، پاؤں نہیں باندھے تھے۔

گودام کے اندر ایک بیمار سالب رشتہ تھا، ڈاکٹر فوزیہ جھلنگا چار پائی سے اٹھ کھڑی ہوئی، باہر سناٹا طاری تھا، وہ دروازے کے قریب آئی اور اسے پھینک کر دیکھا، وہ باہر سے بند تھا شاید تالا بھی لگا ہوگا۔

تشنج کے زہر میں بجھے ہوئے تیروں سے الم نصیب سدھوراں کا کلیجہ جھلنی کرتا ہوا پردہ کمرے سے نکل گیا اور سدھوراں دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپنے رونے لگی۔ پرویز نے اسے کل تک سوچنے کی مہلت دی تھی، مگر پھر وہ کل بھی نہ آ سکی۔ یہ اس سے اگلے دن صبح کا ذکر ہے۔

پرویز حسب معمول علی الصباح ناشتہ کر کے گھر سے نکل گیا اور سدھوراں بے دلی کے ساتھ روزمرہ کے گھریلو کام کاج میں مصروف ہو گئی، وہ ساری رات نہیں سو سکی تھی، پرویز کی زہریلی گفتگو اور اس کے ہونے والے بچے کے بارے میں اس کی بار بار ناجائز کی تکرار نے سدھوراں کو شوہر سے متنفر کر دیا تھا۔

اس کا وجود چھلنی ہو کر رہ گیا تھا، کام میں بھی اس کا دل نہ لگا، وہ اپنے کمرے میں آ کر اپنی حراماں نصیبی پر چیپکے چیپکے آنسو بہانے لگی، ایک لمحے کو اس کے جی میں آئی کہ وہ یہاں سے چلی جائے، ہمیشہ کے لیے واپس اپنی محسنہ ڈاکٹر فوزیہ کے پاس مگر پھر وہ کڑھتے دل کے ساتھ سوچتی کہ اسے بار بار اپنی محسنہ پر بوجھ نہیں بننا چاہیے، اگرچہ وہ اس کے پاس چلی بھی جاتی تو آگے چل کر اس کی محسنہ کو اور اس کے گھر والوں کی عزت بھی داؤ پر لگ سکتی تھی تو پھر وہ کیا کرے.....؟ اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے، جب وہ انتہائی مایوسی کی حدود میں داخل ہونے لگتی تھی تو اچانک ایک ننھا سا وجود اس کی چشم تر میں ہمکتا ہوا قصاں ہونے لگتا اور اپنی اس خواہش کا بھی گلا گھونٹ دیتی۔

دفعتاً باہر دروازے پر دستک کی آواز ابھری، اس نے جلدی سے اپنے دو پیٹے کے پلے سے آنسو پونچھے اور صحن میں آ گئی، دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ باہر کون ہو سکتا ہے؟

”کون ہے.....؟“ اس نے بالآخر دروازے کے قریب آ کر پوچھا۔
”دروازہ کھولو، ڈاکٹر صاحبہ نے بی بی سدھوراں کے لیے کچھ چیزیں بھیجی ہیں اور ساتھ ہی ان کا پیغام بھی لایا ہوں۔“

باہر سے ایک اجنبی مردانہ آواز ابھری مگر چونکہ اس کی محسنہ ڈاکٹر فوزیہ کا نام لیا تھا، اس لیے سدھوراں نے بلا جھجک آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا پھر سامنے نظر پڑنے لگی اس کی روح فنا ہو گئی۔

سامنے جہاں دادا اپنے چند حواریوں کے ساتھ کھڑا اسے زہریلی نظروں سے گھور رہا تھا۔

ڈاکٹر فوزیہ واپس مڑی اور بغور گودام کی شکستہ دیواروں کا جائزہ لینے لگی، جگہ جگہ سے دیواروں کا پلستر اکھڑ چکا تھا اور ان سے سیلن زدہ اینٹیں جھانک رہی تھیں، خاصی بلندی پر اسے روشندان کے نام پر ایک روزن سانظر آئے، وہاں سے چاند کی مدہم روشنی اندر آ رہی تھی، اس نے ایک گہری سانس لے کر آس پاس بکھرے الابلا سامان پر ڈالی پھراگے بڑھ کر زنگ آلود اور پرانے زرعی آلات کا جائزہ لینے لگی، وہ کچھ سوچ کر واپس دروازے کی طرف پلٹی اور کوئی جھری تلاش کرنے لگی، جلدی ہی اسے ایک ایسی باریک اور متوازی جھری دکھائی دے گئی جو دروازے کے قبضوں کے قریب بنی ہوئی تھی، فوزیہ نے فوراً اپنی ایک آنکھ وہاں لگا دی، سامنے اسے ایک چھوٹی ڈیوڑھی نما جگہ سی نظر آئی جو سنسان تھی، اس کے بعد کوئی دروازہ نہ تھا، باہر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی، ڈاکٹر فوزیہ سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی پھر اس نے حلق کے بل چیخ کر شور مچانا شروع کر دیا۔

”کوئی ہے۔۔۔ مجھے یہاں سے نکالو۔۔۔ مجھے یہاں قید کیا ہوا ہے۔۔۔ کوئی ہے۔۔۔ خدا کے لیے میری مدد کرو۔“ فوزیہ چیختے چیختے بے دم سی ہو گئی، مارے خفت اور بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے مگر باہر وہی گہری خاموشی چھائی رہی، فوزیہ کو اب یہ اذیت ناک احساس ہونے لگا تھا کہ یہ جگہ آبادی سے دور کسی ویران مقام پر تھی اور یقیناً یہ گودام نما عمارت جہاں داد کی ملکیت ہوگی۔ ڈاکٹر فوزیہ کا حلق دکھنے لگا تو وہ گودام کے اس حصے کی طرف بڑھی جدھر زنگ آلود زرعی آلات بکھرے ہوئے تھے، وہاں تھوڑی سی تلاش کے بعد اسے ایک آہنی راڈ دکھائی دے گئی، وہ اس نے اٹھالی اور پھر دوبارہ دروازے کی طرف لپکی، قریب پہنچ کر وہ آہنی سلاخ سے زور زور سے دروازہ پھیننے لگی، وہ بری طرح سلاخ سے فولادی زنگ آلود دروازہ پیٹے جا رہی تھی حتیٰ کہ بے دم سی ہو گئی، وہ چند لمحے رک کر زور زور سے ہانپنے لگی اور باہر سے کسی کی سن گن لینے کی کوشش کرنے لگی لیکن بے سود۔۔۔ باہر وہی منحوس خاموشی کا راج تھا۔

اسے کیا معلوم تھا کہ باہر دور دور تک کس قدر خوفناک ویرانہ نکھرا ہوا تھا، وہ مایوس سی ہو کر دوبارہ چارپائی پر بے دم ہو کر گر پڑی، مایوس، بے بسی نے اسے نڈھال کر کے رکھ دیا تھا، وہ کافی دیر تک اسی طرح مضطرب سی چارپائی پر بیٹھی رہی۔

وقت گزر رہا تھا، بھیدوں بھری رات بیت رہی تھی اور فوزیہ کے اندر اندیشوں اور دوسوں کے پریشان ناگ بھن اٹھائے اس کی چشم کے سامنے رقصاں ہونے لگے، ڈاکٹر فوزیہ نے مضطربانہ انداز میں دوبارہ اپنی رست و اچ پر نگاہ ڈالی، رات کا سوانح رہا تھا، اس

کی اندیشاک پریشانی اب فزوں تر ہونے لگی معاً اسے سدھوراں کا خیال آیا اور وہ گھٹ کر رہ گئی، اسے سدھوراں کی بھی پریشانی لاحق ہونے لگی تھی، اس مردود جہاں داد نے اسے مجبور کر کے سدھوراں کے گھر کا پتہ معلوم کر لیا تھا، اب نجانے وہ سدھوراں یا اس کے شوہر پرویز کے ساتھ کیا کرنے والا تھا، اس کا تصور کر کے ہی فوزیہ لرزہ بر اندام ہوئی جا رہی تھی۔

اسے اب تھوڑا بہت یچکتا و ابھی ہو رہا تھا کہ کاش وہ جہاں داد کو سدھوراں کے بارے میں کچھ نہ بتاتی اور اپنی بات پر ڈٹی رہتی مگر وہ کیا کرتی، وہ خود جہاں داد اور اس کے گماشتوں کے آگے بے بس اور مجبور ہو گئی تھی، اگر وہ ان کی بات نہ مانتی تو ان سب کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو جاتی، اپنی عزت بچانے کی خاطر اس نے مجبوراً ایسا کیا تھا۔

فوزیہ کا خیال کا تھا جہاں داد سچ بتانے کے بدلے میں اسے چھوڑ دے گا اور بعد میں فوزیہ گھر پہنچ کر سدھوراں اور اس کے شوہر پرویز کو جہاں داد اس کے کارندوں کے خطرناک عزائم کے بارے میں خبردار کر دے گی لیکن جہاں داد اس کی سوچ سے بڑھ کر چالاک ثابت ہوا تھا، اس نے پھر بھی فوزیہ کو آزاد نہ کیا تھا بلکہ بدستور اسے یرغمال بناتے ہوئے پہلے اس کے بچ کی تصدیق کرنے کے لیے سدھوراں کو اغوا کرنے کے لیے روانہ ہو چکا تھا، غرض ڈاکٹر فوزیہ کو ایک ساتھ کئی پریشانیوں نے آگھیرا تھا۔

اچانک ایک آواز پر ڈاکٹر فوزیہ بری طرح ٹھٹکی، وہ جلدی سے اٹھی اور دروازے کی طرف دوڑی اور قریب سے ان آواز۔۔۔ پکان دھرنے لگی تب، اسے احساس ہوا کہ یہ کوئی بارات تھی کیونکہ یہ آوازیں شہنائیوں اور ڈھول، ڈھماکوں اور نفیریوں کے گونجنے کی تھیں، ڈاکٹر فوزیہ کو اس سے بارات کے گزرنے پر تعجب تو ہوا مگر پھر یہ سوچ کر کہ یہ تقریبات ہی ایسی ہوتی ہیں، بعض چھوٹے چھوٹے علاقوں میں تورات گئے تک دھوم دھڑکا پچا رہتا ہے بہر طور پر ڈاکٹر فوزیہ یہ خوش ہو گئی تھی، اسے اب اس منحوس قید خانے سے رہائی کی امید ہو چکی تھی پھر جیسے ہی وہ شور مچاتی ہوئی بارات ذرا قریب آئی، ڈاکٹر فوزیہ نے مدد کے لیے زور زور سے چیخا چلانا شروع کر دیا اور ساتھ ہی اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لوہے کی سلاخ سے آہنی دروازہ بھی بری طرح پھیننے لگی مگر جلد ہی اس پر یہ بھیانک اور غم انگیز حقیقت منکشف ہوئی کہ اس کی آواز فقار خانے میں طوطی کی مثل تھی کیونکہ بارات جیسے ہی قریب آئی تو اس کے ڈھول، باجوں کا شور اس قدر تھا کہ ڈاکٹر فوزیہ کے چیخنے کی آواز طوطی کی آواز ثابت ہوئی تھی۔

پھر ذرا دیر بعد بارات گزر گئی، ایک بار پھر وہی منحوس سناٹا آسبھی چگا دڑوں کی مانند

غیر مرنی دیواروں سے چمٹ گیا تھا، ڈاکٹر فوزیہ نے بے بسی اور مایوسی کے شدید احساسات تلے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سلاخ پر سے پھینک دی اور وہیں دروازے کے ساتھ لگی پشت نکائے نیچے کھردرے فرش پر بیٹھی، اب وہ سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

بے چارے بوڑھے مٹھل باری کی بساط ہی کیا تھی، اس کی موت پر کسی نے چار آنر بھی نہ بہائے تھے اور تدفین بھی اس کی اس طرح کی تھی جیسے کسی جانور کو گڑھے میں پھینک آئے ہوں۔ ماں، بیٹے خوش تھے ہی اندر سے مگر ملوکاں اب خود کو تنہا محسوس کرنے لگی تھی اور یہ ملوکاں ہی تھی جو اپنے باپ کی موت پر خوب روئی تھی۔

عجیباں اور خالقو دونوں کا راستہ اب صاف ہو گیا تھا، ان کا خیال تھا کہ ملوکاں مرنے کے بعد خود سہولت سے انکار کرنے کی ہمت نہ ہوگی مگر انہیں کیا پتہ تھا کہ ملوکاں، باپ کی موت کے بعد خود سہولت سے انکار کرنے کی ہمت نہ ہوگی، بیٹے کو تب اندازہ ہوا جب مٹھل کی موت کو سات روز گزرنے کے بعد خالقو نے ماں سے ملوکاں کی آچر خان سے شادی پر رضامندی لینے کو کہا۔

وہ شام کا وقت تھا، خالقو خلاف معمول جلد گھر آ گیا تھا اور باہر صحن میں کھری چار پار پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا، عجیباں اندر کوٹھری میں بیٹی ملوکاں کے پاس بیٹھی باتوں میں مصروف تھی۔

”دھیئے.....! اب تو تیرا بیوہ بھی نہیں رہا، گھر کا چولہا کیسے جلے گا، ہمیں اپنی روٹی ہی لالے پڑے ہیں اوپر سے تیرا بوجھ بھی سر پر ہے تو اپڑیں ضد چھوڑ دے اور اپنے گھر آ جا۔“

ماں کی بات سن کر ملوکاں نے تیز نظروں سے اس کو گھورا پھر تنہی سے بولی۔ ”کیا امڑ.....! ادا خالقو مر گیا ہے، کیا وہ کما نہیں سکتا، بوڑھے باپ کی کمائی پر تو ہاتھ صاف کر رہا تھا، اب کیا میری کمائی کھائے گا، میں کھیتوں میں مزدوری کر سکتی ہوں پر تم دونوں بیٹے کان کھول کر میری بات سن لو، میں مرنے مر جاؤں گی مگر اس منحوس بڑھے سے شادی نہ کروں گی۔“

آخری الفاظ ملوکاں نے جان بوجھ کر باہر صحن میں موجود خالقو کو سنانے کے لیے کہے تھے، یہی سبب تھا کہ خالقو غصے سے بھناتا ہوا چار پائی سے اٹھا، بیڑی کا ٹوٹا پاؤں لٹے

اور اندر کوٹھری میں آ گیا۔

”کیا بکواس کرتی ہے تو شادی نہیں کرے گی تو کیا کسی کے ساتھ گھر سے بھاگنے کا ارادہ ہے تیرا بول.....؟“ وہ قہر آلود نظروں سے ملوکاں کی طرف گھور کر بولا۔

ملوکاں، بھائی کے لہجے اور چڑھے ہوئے تیوروں سے مرعوب ہوئے بغیر نفرت انگیز لہجے میں بولی۔ ”میں اتنی بے غیرت نہیں ہوں جو گھر سے بھاگوں اور تو کون سا غیرت مندوں والا کام کر رہا ہے کہ چند نکلوں کے عوض تو مجھے ایک بوڑھے عیاش کے پلے سے ہانڈنا چاہتا ہے۔“ ملوکاں کے کھرے جواب پر خالقو اس پر چڑھ دوڑا۔ جب تک عجیباں چنچ میں آئی، خالقو، ملوکاں کے قریب پہنچ کر ایک زوردار تھپڑ رسید کر چکا تھا۔

”ذلیل کمینی.....! اپڑیں وڈے بھاکے سامنے زبان چلاتی ہے۔“

تھپڑ کھا کر ملوکاں بھی زخمی ناگن کی طرح پھینکارتے ہوئے بولی۔ ”تت..... تجھے شرم نہیں آتی جوان بہن پر ہاتھ اٹھاتا ہے، چرسی موالی وڈا بھا.....! (بڑا بھائی) بنتا ہے تو پہلے جا کر روئی تو کما، بوڑھے باپ کے ٹکڑوں پر پل رہا تھا، اب میرے عیوضے کی روٹی کھائے گا۔“

ملوکاں کا چہرہ دکھ اور غصے کے مارے سرخ ہو رہا تھا، اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

خالقو غصے میں لال پیلا ہو گیا اور ملوکاں کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لئے، تکلیف کی شدت سے ملوکاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

عجیباں یکدم بیٹے کے سینے پر دو ہتھ مارتے ہوئے بولی۔ ”اڑے چھوڑا.....! حیا کر، کیا کرتا ہے، چھوڑا دی کے بال..... چھوڑ.....!“

ماں کے درمیان میں آنے پر خالقو نے ایک جھٹکے سے ملوکاں کے بال چھوڑ دیئے۔ ملوکاں ہانپنے لگی پھر وہ اسی لہجے میں دونوں ماں، بیٹے کو گویا خبردار کرتے ہوئے بولی۔ ”تم دونوں کان کھول کر سن لو، اب وہ وقت نہیں رہا، تم لوگ مجھے مجبور اور کمزور سمجھ کر سنا لالچ کی بھینٹ چڑھا دو، اگر دوبارہ مجھ پر اپنی مرضی تھوپنے کی کوشش کی تو میں سیدھی تھونے چلی جاؤں گی۔“

اس کی دھمکی نے جیسے جلتی پر تیل کا کام کیا، خالقو کا پھر دماغ اٹنے لگا مگر اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اسے زد و کوب کرنے کی کوشش کرتا، عجیباں فوراً دونوں کے بیچ میں آ گئی اور بیٹے سے بولی۔ ”تو جا پٹ.....! باہر جا، میں اپڑیں دھی کو سمجھا لوں گی..... جاؤ.....!“ ماں

پٹنگی اور اس کے باپ جیسے شفیق سینے پر اپنا سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی، چاچا سکھو بے چارہ پریشان ہو گیا، دوسرے لمحے وہ ملوکاں کے سر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے ملامت سے بولا۔ ”میڈی دھی.....! کیا ہوا.....؟ خیر تو ہے، کسی نے تجھ پر گندی نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے تو بتا، قسم مرشد کی کھڑی سے ٹوٹے کر کے رکھ دوں گا، جلدی بتا.....!“ اس کی آواز جوش میں کپکپا رہی تھی مگر ملوکاں مسلسل روئے چلی جا رہی تھی، اتنے میں دروازے پر مائی عجیباں گھبرائی ہوئی نمودار ہوئی۔

”بھاجائی.....! کیا بات ہے، دھی ملوکاں کو کیا ہوا ہے؟“ اپنے مرحوم بھائی منھل کی بیوی کو دیکھ کر سکھو نے اس سے پوچھا۔

عجیباں یکدم پریشان ہو کر بولی۔ ”کک..... کچھ نہیں ہوا، یہ تو ایسے ہی روتی ہوئی ادھر آگئی۔ چری چھو کر.....!“ یہ کہہ کر وہ اپنی بیٹی ملوکاں کو پیار سے چھوتے ہوئے بولی۔

”جل ڈی دھی.....! کیوں ہر دہر واپز چاچا سائیں کو پریشان کرتی ہے۔“

”نہیں.....! میں اب اس گھر میں نہیں جاؤں گی۔“ ملوکاں نے نفرت سے ماں کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ پھر اپنے چاچا سکھو سے بولی۔ ”چاچا.....! تو مجھے یہاں رکھ لے، پیو کے مرنے کے بعد میں بالکل اکیلی ہو گئی ہوں۔“

”اڑے میڈی دھی.....! کون کہتا ہے تو یتیم ہے، میں زندہ ہوں ابھی، تیرے پیو کے برابر ہوں، تو میڈا اپڑاں خون ہے۔“ چاچا سکھو نے محبت بھرے جوش سے کہا۔ پھر عجیباں کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بھاجائی.....! تو جا واپس، اسے ادھر ذرا اپڑاں بوجھ ہلکا کرنے دے، میں اسے بعد میں لے آؤں گا۔“

دیور کی بات پر عجیباں شدید تذبذب کا شکار نظر آنے لگی مگر پھر ناچار خاموشی سے واپس لوٹ گئی۔ ادھر میراں نے ملوکاں کو تھام لیا تھا، اس کی ماں بھی ملوکاں کو گلے لگا کر پیار کرنے لگی، چاچا سکھو کو کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا کہ معاملہ گھر سے باہر کا نہیں بلکہ اندر کا ہی ہے جس کی تفصیل ملوکاں ہی صحیح طرح بتا سکی ہے، اس لیے اس نے اپنی بھابی سے کچھ اقتدار کے بغیر اسے خاموشی کے ساتھ وہاں سے چلتا کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ملوکاں اپنی سسکیاں ضبط کئے سکھو چاچا کو اصل بات سے آگاہ کر رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

اسے دوبارہ ہوش آیا تو گھور اندھیرے کے سوا کچھ نہ تھا، وہ گھبرا سا گیا مگر پھر

کے سمجھانے بھجانے پر وہ غصے سے ملوکاں کے خوں رنگ چہرے کو گھورتا ہوا پاؤں پھیر کھڑی سے باہر چلا گیا، عجیباں پیار سے ملوکاں کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

ملوکاں نے نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے اس سے کہا۔ ”تو بھی چلی جا امڑ، اور مجھے سمجھانے کی بجائے باہر جا کر اپڑیں لا ڈلے پٹ کو سمجھا..... جا!“ مائی عجیباں براہ منہ بنا کر باہر صحن میں آگئی۔

”کیا ہوا امڑ.....؟ وہ مانتی ہے یا پھر.....!“ باہر چار پائی پر غصے میں بھرے بیٹے خالقونے ماں سے پوچھا۔

”اڑے ذرا تو ماٹھ کریوں جوان بہن پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔“ ماں نے اسے سمجھایا وہ ماں کو بھی غصیلی نظروں سے گھورتے ہوئے شکی لہجے میں بولا۔

”امڑ.....! تو بھی اس کی طرف داری کر رہی ہے.....؟“

”اڑے چریا چھو کر.....! میں اس کی طرف داری نہیں کر رہی، ذرا صبر سے کام لے۔“ عجیباں نے کہا پھر اس کے قریب آ کر ہولے سے اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ ”دیکھ تو فکر نہ کر، میں اس کی ماں ہوں، آہستہ آہستہ اسے سمجھا لوں گی، وہ میری بیٹی ہے، میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں، اگر ہم نے زبردستی کرنے کی کوشش کی تو وہ ہماری عزت کا جنازہ لے کر تھانے پہنچ جائے گی پھر پورے گوٹھ کے لوگ تھو..... تھو کریں گے ہم پر.....!“

مائی عجیباں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ انہوں نے ملوکاں کو شدید غصے کے عالم میں کھڑی سے نکلنے دیکھا پھر اسے دروازے کی طرف جاتے دیکھ کر خالقونے درشت لہجے میں پوچھا۔ ”رک جا ملوکاں.....! کدھر جا رہی ہے؟“

بھائی کی بات سن کر ملوکاں کے قدم رک گئے اور وہ بھائی کے چہرے پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔ ”میں چاچا سکھو کے ہاں جا رہی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ خانہ کے جواب کا انتظار کئے بغیر روتی سسکتی ہوئی اپنی جھگی سے باہر نکلی آئی۔

بازو میں ہی چاچا سکھو کی جھگی تھی، وہ اپنی اجرک سے آنسو پونچھتی ہوئی چاچا سکھو کی جھگی میں داخل ہو گئی، سامنے ہی صحن میں بچھی کھری چار پائی پر چاچا سکھو روتی کھار بانو میراں اور اس کی ماں بھی وہیں صحن میں ہی موجود تھیں، وہ ملوکاں کو اس حالت میں دیکھ کر چونک سے گئے، چاچا سکھو کو دیکھ کر ملوکاں کے سارے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور روتی ہوئی اس کی طرف لپکی، چاچا سکھو بھی اپنی بیٹی کو اس حالت میں دیکھ کر پریشان ہوئے اور روتی سے ہاتھ کھینچ کر چار پائی سے اٹھ کھڑا ہوا، ملوکاں چاچا سائیں پکارتی ہوئی اس سے

دوسرے ہی لمحے اسے اپنے دائیں پاؤں کے انگوٹھے میں درد کی شدید لہریں اٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں، اس کے ہوش بے آنے سے پاؤں کی اذیت ناک تکلیف بھی جاگ اٹھی تھی، وہ ہنوز رن بستہ تھا اس آرن سنول پر اور اسی جگہ پر جہاں تھوڑی دیر پہلے اس پر تشدد کے پہاڑ توڑے گئے تھے۔

سارنگ کبھی تکلیف کے مارے کراہنے لگتا تو کبھی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہراساں انداز میں دیکھنے کی کوشش کرتا۔

ناخن نچے انگوٹھے کی تکلیف اب بھی اس کے لیے ناقابل برداشت ہو رہی تھی تاہم اس نے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا زخم ننگا نہیں تھا، اس کی پٹی کردی گئی تھی، وہ ہونٹ بیچنے اپنے وجود میں اٹھنے والی کرب انگیز لہروں پر بمشکل قابو پائے ہوئے تھا۔

ابھی تھوڑی دیر گزری تھی کہ اسے آہٹ سنائی دی، اس کے بعد سامنے اندھیرے میں اسے روشنی کی باریک متوازی لیکریس بنی نظر آئی جو دوسرے ہی لمحے چوڑی ہوتے ہوئے ایک روشن چوکھٹ میں بدل گئی، کسی نے اس قید خانے کا دروازہ کھولا تھا۔

سارنگ پریشان سا ہو گیا، وہ سمجھ گیا کہ اس پر پھر تشدد کیا جانے والا ہے، اسے سامنے روشن چوکھٹ پر ایک وردی پوش نظر آیا، اس کے ہاتھ میں کھانے کے نام پر ایک ٹرے بنا برتن تھا، اس نے اندر داخل ہوتے ہی اپنے ایک ہاتھ سے سوکچ ٹول کر کمرے میں روشنی کر دی تھی، وہ وردی پوش اہلکار سارنگ کے قریب آیا، فرش پر ٹرے رکھ دی، سارنگ نے قدرے طمانیت محسوس کی، وہ اس کے لیے کھانا لایا تھا، اس وردی پوش اہلکار کے کاندھوں پر گن جھول رہی تھی، وہ فرش پر ٹرے رکھنے کے بعد سیدھا کھڑے ہوتے ہوئے سارنگ کے پڑمردہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کرخت لہجے میں بولا۔ ”میں تمہارے ہاتھ، پاؤں کھول رہا ہوں مگر خراج غلط حرکت مت کرنا ورنہ بری طرح پچھتاؤ گے۔“ یہ کہہ کر وہ سارنگ کے قریب آیا اور اس کے ہاتھوں، پیروں کو کھولنے لگا، سارنگ بے چارہ بے رحمانہ تشدد کے بعد ویسے ہی ادھ موہا ہو رہا تھا، اس میں تو مزاحمت کرنے کی بھی ہمت نہیں رہی تھی بہر طور وردی پوش اہلکار اپنے تئیں محتاط انداز میں سارنگ کو کھولنے کے بعد کمرے سے فوراً باہر نکل گیا اور عقب میں دروازہ بھی باہر سے بند کر دیا۔

اس کے کمرے سے باہر نکلتے ہی سارنگ نے سب سے پہلے اپنے زخمی انگوٹھے دیکھا، وہاں پٹی بندھی ہوئی تھی، انگوٹھے میں زخم کی وجہ سے اسے اپنی دائیں ران کی نیچے والی جگہ پر گھٹی سی بنی محسوس ہو رہی تھی، سارنگ کو بھوک تو نہ تھی البتہ پیاس کی شدت سے اس کا

مقلق سوکھ رہا تھا، اس نے کھانے ٹرے کی طرف دیکھا جہاں پانی کا ایک گلاس بھی رکھا تھا۔ سارنگ بہ دقت تمام اسٹول سے اٹھنے لگا تو اچانک اسے اپنے زخمی انگوٹھے کی تکلیف میں اضافہ محسوس ہوا، وہ بے اختیار کراہ کر رہ گیا، اس زخم نے اسے معذور سا کر ڈالا تھا مگر سارنگ معذور بننا نہیں چاہتا تھا لہذا اس نے دوبارہ ہمت کی اور زخم سے ابھرتی ہوئی ٹیسوں پر قابو پاتے ہوئے وہ لنگڑاتا ہوا ٹرے کے قریب آیا اور پھر فرش پر بیٹھ گیا، اس نے گلاس کی طرف اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ بڑھایا، پانی تھا ہی کتنا..... وہ غنا غٹ، ایک ہی سانس میں سارا پی گیا، مقدور بھر پیاس بجھانے کے بعد وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا، وہ اب اس قید خانے سے فرار کے بارے میں سوچنے لگا مگر سر دست اپنے مفہم کی ایک ذرا سی راہ بھی بھائی نہیں دے رہی تھی تب پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کوندا، اس نے سوچا کہ وہی وردی پوش اہلکار یقیناً زرادیر بعد یہاں برتن لے جانے آئے گا، اگر کسی طرح اس تنہا اہلکار پر قابو پالیا جائے تو کچھ نہ کچھ فرار کی صورت پیدا ہو سکتی تھی۔ تب سارنگ نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے انگوٹھے کے زخم کی چنداں پروا کئے بغیر اس مسلح وردی پوش اہلکار کی گن کو اس سے چھیننے کی کوشش کرے گا پھر جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔

وہ اب شدت سے اس کے دوبارہ لوٹنے کا انتظار کرنے لگا، متوہش اور غیر یقینی حالات دیگرگوں کا ایک ایک لمحہ موت کی دستک دیتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، اسے اپنی کنپٹیاں جلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

کافی دیر گزر گئی مگر کوئی اندر نہ آیا حالانکہ سارنگ کا خیال تھا کہ جو وردی پوش اسے کھانا دے کر گیا ہے، وہ واپس بھی لوٹے گا مگر ہنوز ایسا نہ ہوا، وہ کسی کے آنے کا منتظر ہی رہا۔

سارنگ کو اس بات پر تعجب بھی ہو رہا تھا کہ آخر یہ انڈین آفیسر اسے پاکستانی جاسوس بنانے پر کیوں تلا ہوا ہے جبکہ اس کے پاس سے ایسی کوئی شے یا کوئی خطرناک ہتھیار بھی برآمد نہیں ہوا ہے بالآخر کافی دیر گزرنے کے بعد وردی پوش فوجیوں کا وہی گروہ دوبارہ نمودار ہوا، ان میں وہ سفاک انڈین آفیسر بھی تھا، سارنگ کا دل پھر کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا، وہ سمجھا کہ اب ایک بار پھر اسے تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا مگر دوسرے ہی لمحے وہ ٹھٹھا، اسے یہاں سے کہیں اور لے جایا جا رہا تھا، اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے اور انگوٹوں کے کندے مار کر عمارت سے باہر لایا گیا تو سارنگ کو وقت کا اندازہ ہوا، یہ رات کا پہلا درمیانی پہر تھا، آسمان پر چاند کی طلسماتی خنک روشنی ریت پر نچھاور ہو رہی تھی، صحرا میں کئی ہوئی چاندنی کا منظر بڑا بڑا سرانظر آ رہا تھا۔

جیپ درمیانی رفتار سے ریت پر دوڑی چلی جا رہی تھی، اچانک جیپ کو جھٹکے سے لگنا شروع ہو گئے اور اس کی رفتار بتدریج دھیمی پڑنے لگی۔

”کیا ہو تیواڑی.....! جیپ کیوں رک گئی ہے؟“ اچانک اس کے برابر بیٹھے اشوک نے پریشانی سے پوچھا۔

”پتہ نہیں کیا ہوا..... کار بور یٹر کی خرابی لگتی ہے۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔

”کہیں تیل تو نہیں ختم ہو گیا.....؟“ سارنگ کے برابر بیٹھے مدن نے کہا مگر جب تک تیواڑی کوئی جواب دیے بغیر جیپ کو روک چکا تھا، جیپ کے رکتے ہی سب پہلے تیواڑی اور اشوک نیچے اترے پھر شاید ڈراکسلندی اتارنے کی غرض سے سارنگ کے برابر بیٹھے ہوئے مرلی اور مدن بھی کوڈر جیپ سے نیچے اتر آئے، تیواڑی اب جیپ کا بونٹ اٹھا کر اس پر جھکا ہوا تھا۔

ڈرائیور کو یہ لوگ سارنگ کی طرف سے غافل ہو گئے کہ جس کی وجہ یقیناً یہی رہی ہوگی کہ ایک تو وہ نہتا تھا، دوسرا اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے بظاہر خاموش بیٹھے سارنگ کے دماغ میں پلچل کی ہونے لگی۔

اس نے کن انکھیوں سے آس پاس کا مقدور بھر جائزہ لینے کی کوشش کی، جیپ بغیر ہڈ کی تھی بہر طور کن انکھیوں سے جائزہ لینے کے دوران سارنگ ڈراچونکا، اسے اپنی دہنی طرف کسی ویران متروکہ عمارت کے کھنڈر نظر آئے، اچانک ایک سنسنی خیز خیال کے تحت سارنگ کا دل کپنیوں پر دھڑکنے لگا، وہ سوچنے لگا کسی طرح اگر وہ ان کھنڈرات کے متروکہ ویرانے کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو جائے تو کچھ خلاصی ہو سکتی ہے مگر یہ اسے ناممکن ہی نظر آ رہا تھا تاہم اس نے ”اب نہیں تو کبھی نہیں“ کے مصداق اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور نیچے موجود ان چاروں مسلح وردی پوش اہلکاروں کا غور سے جائزہ لینے لگا۔

جیپ میں لگتا تھا کہ کوئی بڑی خرابی ہو گئی تھی کیونکہ تیواڑی بونٹ اٹھائے جیپ کے انجن پر جھکا ہوا تھا جبکہ باقی تینوں رائفل گود میں رکھے پاس ہی ریت پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے سگریٹ پی رہے تھے، سارنگ کے قدموں میں ایک کینوس بیگ بھی رکھا ہوا تھا جس کے اندر شاید انہی لوگوں کی ضرورت کا کچھ سامان موجود تھا، سارنگ نے سب سے پہلے اپنی پشت میں بندھے دونوں ہاتھوں کی رسیوں کو ہلانا جانا شروع کر دیا تھا، یہی کوشش وہ پچھلی کافی دیر سے کر رہا تھا، اب ڈرا موقع ملتے ہی وہ اپنی دونوں بندھی ہوئی کلائیوں کو

سارنگ کو دھکیل کر قریب موجود ایک جیپ میں سوار کرایا گیا اور جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی، جیپ میں چار فوجی براہمان تھے، دو اگلی سیٹ پر اور دو اسے لئے عقبی سیٹ پر بیٹھے تھے، سارنگ کو اب ایک نئی پریشانی نے گھیر لیا تھا، اتنا تو اس نے بھی اندازہ لگایا تھا کہ اسے یہاں سے ضرور کسی ایسی جگہ منتقل کیا جا رہا تھا جو یقیناً کسی بڑے قید خانے سے کم نہ ہو گی۔ یہ سوچ کر وہ گہری تشویش میں مبتلا ہو گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر ایک بار وہ کسی بڑے قید خانے میں پہنچا دیا گیا تو پھر اس کے مفر کی راہیں ناممکن ہو جائیں گی لہذا جو کچھ کرنا تھا، اسی وقت کرنا تھا ورنہ وہ ساری زندگی دیار غیر کی جیل میں پڑا سزاوار ہے گا۔

یہ خیال آتے ہی وہ اب ان سے جان چھڑانے کے عوامل پر غور کرنے لگا جو مرست اسے مشکل ترین محسوس ہو رہے تھے کیونکہ وہ اس وقت بھی چار مسلح بھارتی فوجیوں کے زرنے میں تھا، اس پر مستزاد اس کے دونوں ہاتھ بھی پشت کی سمت باندھے دیئے گئے تھے تاہم اس نے ایک بات نوٹ کی تھی کہ ان لوگوں کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ان کے لیے ایک بے ضرر قیدی ہے، جس کی حیثیت محض غلطی سے سرحد پار نکل آنے والے ایک بدو کی سی تھی مگر پھر بھی یہ لوگ ڈھٹائی پر اڑے ہوئے تھے اور زبردستی اسے ایک پاکستانی جاسوس بنانے پر تلے ہوئے تھے۔

انڈین بارڈر سیکورٹی فورسز کے ان چاروں بندوں میں وہ سفاک آفیسر نہ تھا، سارنگ کو اس کی غیر موجودگی بھی قدرے حوصلہ دیئے ہوئے تھی، اس کی وجہ شاید یہی رہی ہوگی کہ سارنگ اس سے خوف زدہ تھا جبکہ ان چاروں میں سے تین افراد وہی تھے جنہیں تشدد کے دوران سارنگ نے انڈین آفیسر کو انہیں مرلی، اشوک اور مدن کہہ کر پکارا تھا جبکہ چوتھا ڈرائیور تھا، اگرچہ وہ بھی مخصوص وردی میں تھا۔

جیپ تاریک صحرا میں درمیانی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

”مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے.....؟“ بالآخر سارنگ نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

”کالے پانی.....!“ اس کے ساتھ بیٹھے مرلی نے استہزاء سے ہنسی کے ساتھ کہا۔

”کالے پانی.....؟ یہ کون سی جگہ ہے؟“ سارنگ الجھن آمیز پریشانی سے بولا۔

”یہ وہ جگہ ہے جہاں سے صرف آتما ہی نجات پاسکتی ہے۔“ اس بار اگلی نشست ڈرائیور کے برابر بیٹھے ہوئے اشوک نے زہریلے لہجے میں کہا، باقی سب لوگ اس کی بات پر قہقہے لگانے لگے۔ سارنگ بے چارہ پریشان سا ہو گیا، اتنا تو وہ بھی سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ اس کی بے بسی سے حظ اٹھا رہے ہیں لہذا وہ خاموش ہو رہا۔

”خبردار.....! کوئی بھی جگہ سے حرکت نہ کرے ورنہ ادھر سب کی لاشیں تڑپتی ہوئی نظر آئیں گی۔“ سارنگ درشت لہجے میں بولا۔ اس نے رائفل کو بڑے ماہرانہ انداز میں پکڑ رکھا تھا۔ مرلی اور اشوک کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ سارنگ کو ان کی نیم خود کار رائفل چلائی آتی تھی مگر اشوک کا چہرہ غصے سے سیاہ پڑنے لگا تھا، اس کے چہرے پر بے ابھرنے والی اچانک کرننگی جارحانہ ارادے کو ظاہر کرتی تھی۔

سارنگ نے مرلی اور اشوک کو رائفلیں پھینک کر ایک قطار میں منہ موڑ کر کھڑے ہونے کا حکم دیا تو اشوک نے بیک جنبش اپنی رائفل سارنگ پر سیدھی کرنے کی کوشش کی مگر سارنگ بھی ایک کانیاں تھا، وہ پہلے ہی اس کے چہرے کے جارحانہ تاثرات کا اندازہ لگا چکا تھا اور اس کی طرف سے زیادہ محتاط تھا، ادھر جیسے ہی اشوک نے اپنی رائفل سارنگ پر سیدھی کرنی چاہی، سارنگ نے فوراً رائفل کی لمبی دبادی، گولی نے اشوک کے سینے کا پنجر توڑ ڈالا، وہ چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑایا اور ریت پر گر کر ٹھنڈا ہو گیا، اب مرلی اور مدن کے چہرے خوف سے پیچھے پڑ گئے، سب سے زیادہ حالت غیر ڈرائیور تیواڑی کی ہو رہی تھی، اشوک کا عبرتناک انجام دیکھ کر مرلی اور مدن نے فوراً اپنی رائفلیں پرے پھینک دیں جسے سارنگ نے آگے بڑھ کر اٹھالیا پھر سارنگ کو تیواڑی بزدل سمجھوس ہوا تھا لہذا اس نے اسے حکم دیا کہ مدن اور مرلی کے دونوں ہاتھوں کو پشت کی سمت رسی سے باندھ دے۔ مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق تیواڑی نے ایسا ہی کیا، اپنے ہی ساتھیوں کو رن بستہ کرنے کے بعد وہ جیسے سارنگ کے سامنے بوتل کے جن کی طرح سر جھکا کر مزید حکم بجالانے کے لیے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

”تیواڑی.....! جیب میں اب کتنا کام باقی رہ گیا ہے؟“ سارنگ نے کرخت لہجے میں اس سے پوچھا تو تیواڑی اپنے حواسوں پر بمشکل قابو پاتے ہوئے تھوک نکل کر بولا۔ ”جج..... جی بس پلگ فٹ کرنا ہے۔“

”تو کرو پھر جلدی اور خبردار اگر تم نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو.....!“ سارنگ نے زہر خند لہجے میں کہا۔

اسے اشوک کی موت کا کوئی دکھ نہ تھا، یہی تو وہ شخص تھا جس نے اس کے انگوٹھے کا ناخن کھینچا تھا، اگرچہ اس تشدد میں مرلی اور مدن بھی اس کے ساتھی تھے مگر سارنگ بلاوجہ خون خرابہ کرنے کا عادی نہ تھا اور اشوک کو محض دفاع کی وجہ سے قتل کیا تھا بہر طور ذرا ہی دیر بعد تیواڑی نے جیب کا بونٹ گرا دیا۔

زور زور سے آپس میں رگڑنے لگا، اسے اپنی کلائیوں میں بندھی رسی ڈھیلی پڑتی محسوس ہونے لگی تھی، سارنگ نے اپنی یہ خفیہ کوشش مزید تیز کر دی بالآخر ذرا دیر بعد اسے اپنی ایک کلائی کے گرد رسی کا حلقہ ڈھیلا پڑتا محسوس ہوا، سارنگ نے فوراً ایک ہاتھ خفیف سا جھکوا دے کر کلائی کے ڈھیلے پڑتے رسی کے حلقے سے باہر نکال لیا، اب اس کے دونوں ہاتھ آزاد تھے مگر وہ اپنے دونوں ہاتھ پشت پر ہی رکھے خاموشی سے بیٹھا رہا، وہ کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا تاہم اس کا دل اب کامیابی کے متوقع احساس تلے زور زور سے دھڑ دھڑا رہا تھا، وہ اب موقع کی تاک میں تھا۔

اس نے جیب کے قریب ریت پر بیٹھے ٹھنھوں میں مگن ان تینوں اہلکاروں کی طرف کن اکھیں سے دیکھا، ان کا فاصلہ جیب سے چھ سات قدم پر تھا۔

”تیواڑی.....! کتنی دیر اور لگے؟“ اچانک اشوک نے سگریٹ کا آخری ٹوٹا ایک طرف اچھالتے ہوئے پوچھا۔

”بس تھوڑی ہی دیر ہے سر.....! اب پلگ صاف کر رہا ہوں، کار بور میٹر تو ٹھیک کر لیا ہے۔“ تیواڑی نے گردن موڑ کر کہا۔ تب پھر اشوک نے اپنے قریب بیٹھے مدن سے کہا۔

”جایا ر جیب میں بیک رکھا ہے، تاڑی کی بوتل رکھی ہے ذرا اٹھالا۔“

مدن اٹھا اور جیب کی طرف بڑھا، سارنگ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، وہ جس موقع کا بے چینی سے منتظر تھا، وہ قریب آ رہا تھا، مدن جیب کے قریب آیا، ایک نظر سارنگ پر ڈالی، اسے نہیں معلوم تھا کہ سارنگ کے دونوں ہاتھ آزاد ہو چکے ہیں لہذا اس نے اپنی رائفل جیب کی سیٹ پر رکھی اور جھک کر سارنگ کے قدموں کے قریب رکھے بیک کو اٹھانے کے لیے جھکا۔

سارنگ اس موقع کا منتظر تھا، اس نے جھپٹ کر اپنے قریب پڑی رائفل اٹھالی، مدن، سارنگ کو دیکھ کر یوں چونکا جیسے اس نے اچانک مردے کو زندہ ہوتے دیکھ لیا ہو، سارنگ نے اس کی اس حیرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رائفل کی نال اس کی گردن سے لگا دی۔ ”خبردار.....! کوئی حرکت نہ کرنا ورنہ.....!“ اس کی تہدید آمیز غراہٹ پر مدن کا چہرہ ست گیا، اشوک اور مرلی تک سارنگ کی غراہٹ پہنچ گئی تھی۔

وہ پھرتی کے ساتھ اٹھنے لگے تو سارنگ نے اوپر تلے دو فاران کے قدموں کے بالکل قریب داغ دیئے، وہ لڑکھڑا سے گئے، جیب کے بونٹ پر جھکے ہوئے تیواڑی نے فوراً بونٹ گرا دیا۔

”جیپ تیار ہے۔“ تیواڑی نے کہا۔

سارنگ کو موٹر گاڑی چلانے کا بخوبی تجربہ تھا، وہ وڈیرے کی زمینوں پر ٹریکٹر ڈرائیور بھی رہ چکا تھا، اکثر شکار وغیرہ بھی کھیلا کرتا تھا، آج سارے شوق اس کے کام آرہے تھے لہذا جب تیواڑی نے اپنا کام مکمل کرنے کا اعلان کیا تو سارنگ نے اس کے دونوں ہاتھ بھی پشت پر باندھ دیئے اور جیپ میں آبیٹھا پھر اسے اشارت کر کے آگے دشت کی لاتھا ہی وسعتوں کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆=====☆=====☆

سدھوراں کی چیخ و پکار بار آور ثابت ہوئی تھی، جہاں دادا اور اس کے کارندے اس کی چیخ و پکار سے گھبرا کر وہاں سے فرار ہو چکے تھے البتہ محلے والے اب سدھوراں کے گھر کے سامنے مجمعے کی شکل میں جمع ہو گئے تھے، سدھوراں نے اوپر سے اتر کر انہیں روتے ہوئے بتایا کہ چند نامعلوم افراد اسے اغوا کرنے کی نیت سے زبردستی گھر میں گھس آئے تھے۔ محلے کے جری لوگ اسے تسلی بخشی دے کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

اس دن خلاف معمول پرویز جلدی گھر لوٹ آیا، وہ خاصا پریشان اور گھبرایا ہوا سا نظر آ رہا تھا، سدھوراں نے اس کے ڈولیدہ چہرے کی طرف دیکھ کر یہی اندازہ لگایا کہ شاید اسے باہر کسی نے آج صبح والے ناخوشگوار واقعے کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا، اگرچہ درست تھا کہ جب پرویز اپنے محلے میں داخل ہوا تھا تو اسے گلی میں کچھ لوگوں نے فوراً ہی اطلاع دے دی تھی کہ کچھ غنڈے اس کی بیوی کو اغوا کرنے کے لئے آئے تھے مگر سدھوراں کے چیخنے چلانے کی وجہ سے وہ لوگ اپنے مذموم مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے تھے لیکن پرویز کی پریشانی کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔

”سدھوراں.....! یہ کون لوگ تھے، جو تمہیں اغوا کرنے کی نیت سے آئے تھے.....؟“ پرویز نے عجیب نظروں سے اس کے ہر اسان چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

سدھوراں شش و پنج کا شکار تھی، درحقیقت وہ اسے جہاں دادا کے بارے میں بتانا نہیں چاہتی تھی یوں تو شادی سے قبل ڈاکٹر فوزیہ نے موسیٰ کے ذریعے پرویز کو پہلے ہی یہ بتا دیا تھا کہ وہ ماضی میں کن تلخ حالات سے دوچار رہی ہے لیکن پرویز کو بہر حال جہاں دادا کا نام بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

سدھوراں نے نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے انکار کیا۔ ”مم..... میں تو انہیں نہیں

جانتی..... جانے کک..... کون لوگ تھے وہ.....!“

پرویز نے برماتی ہوئی آنکھوں سے اس کے گھبرائے ہوئے چہرے کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔ ”جھوٹ مت بولو سدھوراں.....! تم ان لوگوں کو اچھی طرح جانتی ہو۔“ پھر ذرے توقف کے بعد وہ اسے ذرا متحمل لہجے میں سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو سدھوراں.....! یہی لوگ جو تمہیں اغوا کرنے کی نیت سے آئے تھے، آج میرے پاس ہوٹل بھی آئے تھے۔“ پرویز نے اتنا بتایا تو سدھوراں دھک سے رہ گئی۔

”پھر انہوں نے مجھے دھمکیاں دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ میری بیوی یعنی تم ان کے چھوٹے سائیں کی باندی ہو، اب تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے کر آزاد کر دو بصورت دیگر اس کے خطرناک نتائج بھی نکل سکتے ہیں۔“ پرویز نے اپنی بیوی سدھوراں کو اپنی اصل پریشانی سے آگاہ کر ڈالا جسے سن کر سدھوراں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی۔

”دیکھو سدھوراں.....! اگر تم اس بدمعاش کے بارے میں بتا دو تو میں صحیح طور پر اس کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکوں گا۔“ پرویز نے آخر میں سدھوراں سے کہا۔

سدھوراں درحقیقت خود بھی یہی چاہتی تھی کہ جہاں دادا جیسے موسیٰ سے اس کی جان چھوٹ جائے جو یہاں تک آپہنچا تھا لہذا یہ فیصلہ کرتے ہی اس نے ایک گہری سانس لے کر خود کو قدرے پرسکون کرنے کی کوشش کی پھر بولی۔ ”ہاں! اب ان حالات میں یہی بہتر ہے کہ آپ کو اس بدمعاش کے بارے میں آگاہ کر دوں، جس مردود نے میری عزت برباد کی تھی۔“ یہ کہتے ہوئے پھر سدھوراں نے پرویز کو جہاں دادا کے بارے میں بتا دیا اور اسے یہ بھی بتایا کہ وہ تھر کے ایک بڑے اور با اثر زمیندار میر منصب خان کا بیٹا ہے، جس کی اس شہر میں بھی اپنی رہائشگاہ ہے۔

سدھوراں کی بات سن کر پرویز کا چہرہ چند ثانیے کے لیے پُرسوج خاموشی میں مستغرق ہو گیا۔

”سس..... سائیں.....! میرا خیال ہے تم کسی طرح جہاں دادا کی شہر والی رہائشگاہ کا پتہ لگا کر پہلے اس کے باپ سے ملنے کی کوشش کرو، آج کل تھر میں قحط اور خشک سالی کی وجہ سے وہ ادھر ہی ہوگا۔“ سدھوراں نے تجویز دیتے ہوئے کہا پھر مزید بولی۔ ”درحقیقت جہاں دادا اپنے باپ میر منصب خان سے بہت ڈرتا ہے۔“

”ہوں.....! میرا خیال ہے مجھے سب سے پہلے یہی کام کرنا پڑے گا۔“ پرویز پُر تنگی لہجے میں بولا۔ ”اگر پھر بھی جہاں دادا اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو میں پھر پولیس میں اس کے

ڈھائی گھنٹے بعد پرویز لوٹ آیا، اس کے چہرے سے جوش مترشح تھا، اس نے سدھوراں کو بتایا کہ جہاں داد یعنی اس کے باپ میر منصب خان کی رہائشگاہ کا پتہ لگ گیا ہے، جو ڈیفنس کے علاقے میں ہے۔ بس پھر کیا تھا سدھوراں نے اپنی چادر سنبھالی اور پرویز کے ساتھ ہوئی، پرویز نے گھر کو تالا لگایا اور پھر دونوں بس اسٹاپ پر آ گئے، سدھوراں کا دل جانے کیوں اندیشناک و سوسوں تلے بری طرح دھڑک رہا تھا، اسے بار بار یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ دانستہ خوخنوار بھیڑیوں کی کچھار میں جا کر غلطی کر رہی ہے مگر پھر پرویز کی موجودگی محسوس کر کے اسے قدرے حوصلہ ہوا۔

دونوں میاں، بیوی بس کے انتظار میں کھڑے تھے، سدھوراں گرد و پیش پر بھی محتاط نظریں رکھے ہوئے تھی پھر ذرا دیر بعد ان کے مطلوبہ نمبر کی بس آ گئی، وہ دونوں جلدی سے اس میں سوار ہو گئے، پرویز نے سدھوراں کو یہ بھی بتایا تھا کہ اس نے کونسی کا پتہ لگانے کے بعد اپنے آدمی کو روانہ کر دیا تھا۔ ڈیفنس کا علاقہ یہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔

دونوں میاں، بیوی چورنگی پار کرنے کے بعد ڈیفنس کے علاقے میں داخل ہو گئے، پرویز چونکہ پہلے اپنی مطلوبہ کونسی کا پتہ معلوم کر کے آیا تھا، اس لئے ان دونوں کو اس کی تلاش میں بھٹکانہ پڑا مگر میر منصب خان کی کونسی تک کا راستہ انہیں پیدل ہی طے کرنا تھا، دونوں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگے، اندر کا علاقہ خاصا ویران تھا، دُور روہ عا لیشان بنگلوں اور کونسیوں کی قطاریں تھیں، اچانک انہیں اپنے عقب میں کسی گاڑی کے انجن کی گرگرہٹ محسوس ہوئی پھر دوسرے ہی لمحے ایک سفید رنگ کی لینڈ کروزر ان کے بالکل پہلو میں ایک جھٹکے سے رکی، وہ دونوں ٹھٹک کر رکے، ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ لینڈ کروزر سے چار پانچ مسلح آدمی اترے اور ان پر اپنی رائفلیں تان کر غصیلے لہجے میں بولے۔ ”خبردار! کوئی حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ ادھر ہی تم دونوں کو گولیوں سے بھونک دیا جائے گا۔“

سدھوراں کی سہمی ہوئی نگاہ لینڈ کروزر کی اگلی نشست پر بیٹھے جہاں داد پر پڑی تو اسے غش آ گیا، پرویز بھی اس صورت حال سے پریشان ہو گیا تب آنا فانا ان مسلح افراد نے سدھوراں کو سنبھالتے ہوئے حیران و پریشان کھڑے پرویز کو بھی لینڈ کروزر میں سوار کروا دیا اور وہاں سے ہوا ہو گئے۔

☆=====☆=====☆

خلاف پرچہ کٹوا دوں گا..... ویسے میں نے اچھا کیا کہ جب جہاں داد کے آدمی مجھے جمنی دینے میرے ہوٹل آئے تھے تو میں نے اپنے ایک آدمی کو ان کے تعاقب میں روانہ کر دیا تھا، وہ ان کے ٹھکانے کا پتہ لگا کر مجھے بتائے گا۔“

”یہ تم نے بہت اچھا کیا۔“ سدھوراں جلدی سے بولی۔ ”ایسا کرنا، جب تمہیں اچھی طرح میر منصب خان کے گھر کے بارے میں پتہ لگ جائے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا، میں خود بھی وڈے سائیں سے ہاتھ جوڑ کر گزارش کروں گی کی وہ اپنے لاڈلے بیٹے کو سمجھائے، سائیں وڈا بذات خود ایک شریف آدمی ہے۔“

”مگر تم نے تو بتایا تھا کہ جہاں داد کے باپ میر منصب خان کی تھر میں نجی جیل بھی ہے پھر وہ بھلا تمہارے جیسی ایک غریب باری کی بیٹی کی فریاد کو کیا اہمیت دے گا؟“

”نہیں سائیں.....! تھر میں جو نجی جیل ہے، وہ جہاں داد اور اس کے منشی کی ملی بھگت سے ہے، جو ویسے بھی ہم گریب باریوں کے بارے میں وڈے سائیں کے کان بھرتا رہتا ہے۔“

سدھوراں کی بات پرویز اپنے سر کو تھمبی جنبش دینے لگا پھر کسی پریشان کن خیال کے تحت وہ سدھوراں سے بولا۔ ”مگر سدھوراں.....! کیا تمہارا میرے ساتھ چلنا خطرے سے خالی نہ ہوگا؟“

”سائیں..... ایک بڑے خطرے سے نمٹنے کے لیے ہمیں تھوڑا بہت خطرہ مول لینا ہی پڑے گا اور پھر تم بھی تو میرے ساتھ جاؤ گے پھر ڈر کس بات کا.....؟“ سدھوراں نے یہ کہتے ہوئے فخریہ انداز میں پرویز کی طرف دیکھا۔ تب پرویز کا سینہ فخر سے تن گیا اور اس نے تھوڑی رد و قدح کے بعد سدھوراں کی بات مان لی۔

سدھوراں کو اگرچہ اپنے شوہر کی کل والی بات انتہائی ناگوار ضرور گزری تھی لیکن اس نے بھی دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ پرویز کو ایک نہ ایک دن شریفانہ زندگی گزارنے پر مجبور کر دے گی۔

اگلے دن علی الصباح پرویز، سدھوراں کو محتاط رہنے کی ہدایت کر کے اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا اور اس سے یہ بھی کہا کہ اگر اس کا آدمی جسے وہ جہاں داد کے تعاقب میں روانہ کر چکا تھا، کامیاب لوٹا تو پھر وہ جلد ہی ہوٹل سے گھر لوٹ آئے گا اور بعد میں وہ دونوں میر منصب خان کی رہائشگاہ کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔

پرویز کے جانے کے بعد سدھوراں جلدی جلدی گھریلو کام نمٹانے لگی، لگ بھگ کوئی

شارہ کیا۔ کارندے نے جلدی سے ایک اسٹیپ پیپر نما کاغذ جہاں داد کو تھما دیا جسے وہ پرویز نے پریشان کن نظروں کے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔ ”یہ لو..... یہ طلاق نامہ ہے..... تم نے اسی وقت اپنی بیوی کو طلاق دینا ہے.....“ یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ایک قلم نکالا۔ پرویز کی طرف بڑھایا۔

پرویز اس صورت حال سے پریشان ہو کر اس سے بولا۔ ”مگر..... کیوں.....“
 اے کیوں طلاق دوں..... یہ میری بیوی ہے..... ہم نے رضا خوشی سے شادی کی ہے.....
 ”ہوں..... رضا خوشی.....“ جہاں داد اس کی بات پر استہزائیہ ہنسی کے ساتھ بولا۔
 ”اب تیرے کو اسی رضا خوشی کے ساتھ اپنی بیوی کو طلاق دینی ہے..... ورنہ..... اس کا دوسرا طریقہ ہمارے پاس موجود ہے..... جو آسان بھی ہے..... تجھے قتل کر کے..... تیری لاش گم کر دیں گے۔“ جہاں داد نے بڑی سفاکی سے کہا۔

پرویز کے ساتھ کھڑی سدھوراں نے یک دم متوحش ہو کر جہاں داد سے کہا۔
 ”نہیں..... تم ایسا نہیں کر سکتے.....“

سدھوراں کے سراسیمہ لہجے پر جہاں داد مکروہ ہنسی کے ساتھ تہدیدي انداز میں بولا۔
 ”اگر تجھے اپنے شوہر کی جان عزیز ہے تو پھر اس سے کہو..... یہ تجھے ابھی طلاق دے..... ورنہ.....“ اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا اچھوڑا..... پرویز اپنی بیوی سدھوراں کے شانے پر ہاتھ رکھ کر جہاں داد سے بولا۔

”ہرگز نہیں..... میں اپنی بیوی کو بالکل طلاق نہیں دوں گا.....“
 یہی وہ لمحہ تھا جب سدھوراں کے اندر کی عورت یک دم بیدار ہو گئی..... اپنے شوہر پرویز کے یقین بھرے لہجے نے اسے سرشار کر دیا اور..... اب وہ بالکل بے خوف نظر آنے لگی۔ جہاں داد نے سنسناتی ہوئی نظروں سے پرویز کو گھورا پھر اپنے کارندوں سے بولا۔
 ”مکو..... مولا بخش.....! ذرا اس شوہر نامدار کو فوراً اس دنیا سے رخصت کر ڈالو..... اسے بڑیل زال (بیوی) سے کچھ زیادہ ہی محبت ہے.....“

اس کا حکم سن کر جب دو کارندے جار جانہ انداز میں پرویز کی طرف بڑھے تو سدھوراں ایک دم پرویز کے آگے آگئی اور بھری ہوئی شیرینی کی طرح جہاں داد کی طرف نمڑتے ہوئے بولی۔ ”خبردار..... جہاں داد.....! اگر تُو نے میرے شوہر کو کوئی نقصان پہنچنے کی کوشش کی تو..... میں بھی اپنی جان دے دوں گی۔“

لینڈ کروزر کے پچھلے حصے میں، جہاں داد کے مسلح کارندوں نے سدھوراں اور پرویز کو مضبوطی سے دبوچ رکھا تھا..... سدھوراں تو بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔ لینڈ کروزر کے روانہ ہوتے ہی پرویز کے سر پر کند آہنی شے سے وار کر کے اسے بھی تھوڑی دیر بعد دنیا مافیہا سے بے نیاز کر دیا گیا۔

سب سے پہلے پرویز کی آنکھ کھلی۔ اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے گئے تھے۔ وہ سیلن زدہ سے ننگے فرش پر چٹ لیٹا ہوا تھا اور قریب ہی اس کی بیوی سدھوراں بے سدھ پڑی تھی۔ کمرے میں وہ سب موجود تھے اور پرویز کو خونخوار نظروں سے گھور رہے تھے۔ سب سے آگے جہاں داد کھڑا تھا۔ اس کی قہر آلود نظریں پرویز کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں..... ایک کارندے کے ہاتھ میں پانی کا جگ نظر آ رہا تھا۔ غالباً اس نے ہی پرویز کے چہرے پر پانی پھینک کر اسے ہوش میں آنے پر مجبور کیا تھا اور اب وہی پرویز کے قریب بے ہوش پڑی سدھوراں کے چہرے پر پانی پھینک رہا تھا۔ پھر ذرا ہی دیر بعد سدھوراں بھی کسمسا کر ہوش میں آ چکی تھی اور متوحش نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

پرویز کو اپنے سر پچھلے حصے میں دھن کا احساس ہوا مگر وہ اس کی پروا کئے بغیر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا..... اسے ایک دم چکر اس آ گیا۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے وہ تھوڑا لڑکھڑانے کے بعد تن کر کھڑا ہو گیا۔

”تم لوگ کون ہو..... ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے.....؟“ پرویز جہاں داد سے قدرے درشت لہجے میں بولا تو جہاں داد نے چند قدم اس کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے بھاری ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ تھپڑ کی شدت سے پرویز چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑاسا گیا۔ ایسے میں سدھوراں جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے اپنے شوہر کو سنبھالا۔

”تُو نے اس چھو کر کے ساتھ..... شادی کرنے کی جرأت کیسے کی.....؟“ جہاں داد نے پرویز کی طرف گھورتے ہوئے سخ پالہجے میں کہا۔ ”تُو جانتا نہیں کہ..... یہ چھو کر ہماری کیا لگتی ہے.....؟“

”یہ میری بیوی ہے..... اور..... اور..... میں تم کو نہیں جانتا.....“ پرویز نے اپنا گال سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”چنگا..... اب جان لے..... یہ میری رکھیل ہے اور..... تُو نے اب اس کو طلاق دینی ہے۔“ جہاں داد نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر اپنے ایک کارندے کو مخصوص

بہ ظاہر ایک سیدھی سادی دیہات لڑکی نظر آنے والی سدھوراں کو یکا یک ایک ایک دو تیزہ کے روپ میں دیکھ کر ایک لمحے کے لیے جہاں داد چونک کر اس کا شعلہ فشاں چہرے پر لگا۔ مگر پھر دوسرے لمحے جہاں داد کے چہرے پر زہرناک خونخواری عود کر آئی۔ بذات خود جرائم کی دنیا سے تعلق رکھتا تھا اور ایسے حالات سے اس کا کئی بار واسطہ پڑ چکا تھا۔ اس نے فوری طور پر پیش آمد صورت حال کا اندازہ لگاتے ہوئے..... ایک فیصلہ کیا اور چونکہ کرگھات میں لگے ہوئے شکرے کی طرح..... اس نے بغور بد معاشوں کی طرف دیکھا۔ جہاں داد کے علاوہ ان کی تعداد چار اور ان سب کے ہاتھ میں رانفلین دبی ہوئی تھیں۔ غصے میں چیخ و تاب کھاتے ہوئے جہاں داد نے ملکوار مولانا بخش سے گرجدار آواز میں کہا۔ ”اڑے تم دونوں کیا منہ تک رہے ہو..... آگے بڑھو اور اس ہیرو کو ادھڑ کر رو ڈالو.....“

ملکو اور مولانا بخش جیسے ہی پرویز کی طرف بڑھے..... پرویز بہ ظاہر پریشان نظر آنے کی اداکاری کرنے لگا مگر..... اندر سے وہ اپنے نیفے میں اڑے سے چھلی نما چاقو کو نکال کر اسے استعمال میں لانے پر غور کرنے لگا..... مگر اسے اپنا چاقو نکالنے کا موقع نہ مل سکا البتہ اسے ایک دوسرا سنہری موقع ہاتھ آ گیا..... لہذا جیسے ہی سب سے پہلے ملکوار نے اپنی کارگزاری دکھاتے ہوئے..... پرویز پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی..... تو پرویز نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اپنی دھنی ٹانگ کے گھٹنے کی ایک زوردار ضرب اس کے پیٹ پر رسید کر دی..... ملکوار کے لیے..... پرویز کی یہ جارحانہ حرکت قطعی غیر متوقع تھی..... گھٹنے کی ضرب شدید کھا کر اس کے حلق سے ”اوغ“ کی آواز نکلی اور وہ..... آگے کو جھک آیا پھر اس سے پہلے کہ..... جہاں داد اور اس کے باقی کارندوں کو اس غیر متوقع اور اچانک بدلنے والی صورت حال کا ادراک ہوتا پرویز نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ..... درد سے بے حال ہوتے ملکوار خود کار رانفل پر قبضہ جمالیا پھر اگلے ہی لمحے اس نے..... ملکوار کو..... مولانا بخش پر دھکا دیا اور..... جہاں داد کی گردن سے رانفل کی نال چپکاتے ہوئے غرایا۔ ”اپنے ساتھیوں سے کہو کہ اپنے ہتھیار پھینک دیں ورنہ..... تیری گردن میں سوراخ کر دوں گا.....“

پرویز کی سفاک غراہٹ سے مرعوب ہوئے بغیر جہاں داد اپنی جگہ جمے ہوئے دانت پیس کر بولا۔ ”تم خود کو بہت بڑے جنجال میں ڈال رہے ہو..... جاننے نہیں..... میں کون ہوں.....“

”میں تجھے تو اچھی طرح جانتا ہوں..... مگر شاید تو مجھے اچھی طرح نہیں جانتا.....“

☆=====☆

ڈاکٹر فوزیہ..... اس سیلن زدہ سے قید خانے کے بند دروازے سے لگی بیٹھی کافی دیر تک روتی رہی تھی تب اچانک اسے باہر ایک آواز سنائی دی..... اس نے جھٹ سے..... دروازے کی جھری سے باہر جھکا نکا..... کیا دیکھتی ہے..... ایک چھکڑا پاس سے بھوسہ لادے گزر رہا تھا..... اس کی ٹوٹی ہوئی ہمت قوی ہونے لگی..... اس نے اپنی راڈ اٹھا کر زور زور سے اپنی دروازے پر ضربیں لگانی شروع کر دیں..... پاس سے گزرتے ہوئے چھکڑے سے ایک عمر رسیدہ شخص اور اس کا ایک نودس سالہ بچہ سوار تھا۔ اس کے کانوں تک شور کی آوازیں پہنچیں تو اس نے فوراً اپنے گدھے کی باگیں چھینچ لیں اور حیرانی سے اس بوسیدہ سی درام نما عمارت کو تکتے لگے۔

ڈاکٹر فوزیہ نے اب اندر سے باقاعدہ شور بھی مچانا شروع کر دیا تھا۔ وہ شخص چونکا پھر ہنسنے لگا۔ ”کلو“ سے باندھ کر نیچے اتر آیا۔ گودام سے اس کا

آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا..... چھکڑا روانہ ہوا۔

چھکڑے پر سسکڑی سسکی بیٹھی فوزیہ متوحش نگاہوں سے آس پاس کا بھی جائزہ لیتی جا رہی تھی۔ اسے یہ علاقہ شہر کا مضائقہ نہ تھا۔ فضا میں نرم نرم ہوا کے جھونکے جو خرام تھے اور ان میں نمی سی محسوس ہو رہی تھی..... فوزیہ نے اندازہ لگا یا یہ علاقہ ساحل سمندر کے قریب کا تھا۔ چھکڑا ہچکولے کھاتا ہوا دھیمی رفتار سے چلا جا رہا تھا مگر فوزیہ کا دل سینے میں اس سے دگنی چوگنی رفتار سے دھڑک رہا تھا..... گاڑی بان آگے چوبی تختے پر بیٹھا گدھے کی رسی تھامے اسے ”لوکارنے“ میں مصروف تھا۔

چھدری چھدری خود رو جھاڑیوں کا میدان ختم ہوا تو کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا..... پھر کچھ کچھ مکانوں کے آثار نمودار ہونے لگے..... لوگ ادھر ادھر پیدل، چھکڑوں میں اور سائیکلوں پر سوار دکھائی دینے لگے..... چند ایک کھٹارا سی موٹر سائیکلوں پر بھی سوار نظر آئے تھے۔ سڑک اب ذرا ہی دور تھی۔

ڈاکٹر فوزیہ گٹھڑی بنی بیٹھی پریشان کن خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے رہ رہ کر اپنے ”مما پاپا“ کی فکر کھائے جا رہی تھی..... اسے اندازہ تھا کہ وہ اس سے کتنا پیار کرتے تھے اور اس کی چانک اور پُر اسرار گمشدگی سے کس قدر پریشان ہو رہے ہوں گے..... یہ رات ان پر کس قدر بھاری گزری ہوگی، یہ سوچ کر ڈاکٹر فوزیہ کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے..... پھر اسے جواد کا بھی خیال آیا..... جانے وہ بے چارہ کس حال میں ہو گا اب تو وہ بھی اس کی وجہ سے بے حال ہو رہا ہو گا؟

ڈاکٹر فوزیہ انہی خیالات میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک وہ ”ہارن“ کی آواز پر چونکی..... وہ چھکڑے کے پچھلے حصے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک اس کی نگاہ ایک کھٹارا سی نیکی پر پڑی، جو اس کے چھکڑے کے عقب میں دھیمی رفتار سے چلی آرہی تھی۔ نیکی کو دیکھ کر ڈاکٹر فوزیہ کھل اٹھی اور وہ اس غلت آمیز خوشی کے مائے جلدی سے چلتے چھکڑے سے نیچے کود پڑی..... اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس نیکی والے کا گھر شاید اسی علاقے میں تھا اور اب وہ دھندلے پر روانہ ہو رہا تھا۔ فوزیہ نے اسے مضطربانہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھوں سے رکنے کا اشارہ کیا۔ نیکی رک گئی..... فوزیہ پر اس سے اس قدر وحشت اور پریشانی سوار تھی کہ وہ بے چارے چھکڑے والے کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکی اور جلدی سے نیکی کا عقبی دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ نیکی والا درمیانی عمر کا تھا۔ وہ چونکا پھر گردن موڑ کر پوچھا۔ ”کہاں جانا ہے بی بی.....؟“

فاصلہ..... دس بارہ قدموں جتنا تھا..... وہ..... حیران اور ٹھنکی ہوئی نظروں سے گودام کے بند آہنی دروازے کو تکتا ہوا اس کی طرف بڑھا..... اندر سے فوزیہ نے اسے اپنی جانب پرستہ دیکھ لیا تھا چنانچہ جیسے ہی وہ دروازے کے ذرا قریب پہنچ کر کا تو فوزیہ نے گلو گری لے کر التجا کی۔ ”بھائی..... مجھے..... یہاں سے نکالو..... مجھے..... کچھ غنڈوں نے یہاں قید کر رکھا ہے..... تم تمہاری بڑی مہربانی ہوگی.....“

گاڑی بان کا دماغ ٹھنک گیا..... وہ ایک بھلا مانس شخص تھا۔ اسے صورت حال سمجھنے میں دیر نہ لگی..... لہذا وہ وقت ضائع کئے بغیر دروازے کے قریب منہ کر کے ڈاکٹر فوزیہ کو تال دیتے ہوئے بولا۔ ”بہن.....! تو فکر نہ کر..... میں دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا ہوں.....“ یہ کہہ کر اس نے باہر سے دروازے پر لگے قفل کا جائزہ لیا پھر..... اپنے چھکڑے کی طرف بڑھ گیا اور چھکڑے کے نیچے سے کہیں پھنسے ہوئے اوزروں سے وہ ایک آہنی ”تیسی“ اٹھالایا..... اور گودام کے دروازے کے پاس آ کر اس نے آہنی ”تیسی“ کے دو تین وار کر کے تالا توڑ ڈالا..... کنڈا کھول کر اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ڈاکٹر فوزیہ ہراساں ہرنی کی مانند باہر نکلی..... گاڑی بان ایک خوبصورت، جوان اور ماڈرن لڑکی کو اس حال میں دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ سر اسیمہ فوزیہ کے سر پر ہاتھ دھرتے ہوئے شفقت سے بولا۔ ”بیٹی.....! تیرا گھر کہاں ہے..... تو پریشان نہ ہو..... میں تجھے.....“

”تمہاری بڑی مہربانی..... میں خود کسی نیکی میں بیٹھ کر چلی جاؤں گی.....“ فوزیہ اچانک اس کی بات کا ٹکڑا کر بولی۔ اس کی متوحش نگاہیں آس پاس گردش کر رہی تھیں۔ اسے ہنوز جہاں داد اور اس کے غنڈوں کا خوف دامن گیر تھا۔

گاڑی والا اس کی پریشان کن غلت کو بھانپ کر ملائمت آمیزی سے بولا۔ ”بیٹی..... سڑک یہاں سے تھوڑی دور ہے..... نیکی تو شاید تجھے نہ ملے..... شہر جانے والی منیٹر ضرور مل سکتی ہے..... آؤ میرے ساتھ..... میں سڑک کی طرف جا رہا ہوں.....“ یہ کہتے ہی اپنے چھکڑے کی طرف بڑھا..... فوزیہ بھی لڑزنی ٹانگوں سے چلتی ہوئی چھکڑے کی طرف بڑھی..... گاڑی بان نے بھوسہ ادھر ادھر کھسکا کر فوزیہ کے بیٹھنے کی جگہ بنائی..... اور اسے سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ڈاکٹر فوزیہ اس گندے چھکڑے پر بیٹھنے کا قصد بھی نہ کرتی..... مگر اس وقت کیونکہ جان پہ بنی ہوئی تھی تو اسے وہ غنیمت لگا اور وہ اس کے سمٹ کر بیٹھ گئی..... بھوسہ کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا، نو دس، سالہ بچہ اپنی معصومانہ چہرے پر

”شاہراہ فیصل کی طرف چلو..... لیکن ڈرا جلدی.....“ ڈاکٹر فوزیہ نے چڑھتی اترتی سانسوں کے درمیان کہا۔

ٹیکسی والے نے ٹیکسی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا..... چھکڑے والے کو ابھی تک فوزیہ کے اترنے اور ٹیکسی میں بیٹھنے کا علم نہ تھا۔ وہ تو اسے اس وقت پتہ چلا..... جب عقب میں ٹیکسی کا بارن سن کر اس نے اسے راستہ دیا اور فوزیہ نے قریب سے گزرتے ہوئے اپنا سر اور ایک ہاتھ باہر نکالتے ہوئے چھکڑے والے کو خدا حافظ کہا۔ چھکڑے والا..... چونک کر اسے جاتا ہوا دیکھنے لگا پھر اس نے بھی جواباً ہاتھ ہلا دیا۔

”بھائی.....! یہ کون سا علاقہ ہے.....؟“ فوزیہ نے یونی ڈرائیور سے پوچھا۔

”بی بی.....! یہ ابراہیم تیدری کا علاقہ ہے.....“ ڈرائیور نے جواب دیا۔ بظاہر اس کی نظریں سامنے نکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں مگر وہ..... گا ہے بگا ہے عقبی آئینے سے یہ غور ڈاکٹر فوزیہ کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے ایک پکا ہوا پھل اس کی جھولی میں آن گرا ہو..... اب وہ اسے کھانے کی فکر میں مبتلا ہو گیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جب پختہ سڑک پر آیا تو بجائے بائیں مڑنے کے اس نے دائیں ہاتھ ٹیکسی موڑ لی۔ مضطرب بیٹھی فوزیہ کو سردست ڈرائیور کی بدیتی کا اندازہ نہ ہو سکا..... مگر اسے یہ بہر حال اندازہ تھا کہ ابراہیم حیدری کے بعد پہلا بڑا اسٹاپ کو رنگی کریک کا آتا تھا..... ادھر ٹیکسی ڈرائیور..... جب اسے خاصی دور نسبتاً ویران علاقے میں لے آیا تو اس کا ماتھا ٹھکا۔

ایک شیطان کے چنگل سے بچ کر نکلنے پر وہ بھول بیٹھی تھی کہ وہ کسی دوسرے شیطان کے ہتھے بھی چڑھ سکتی ہے۔ گھبراہٹ میں اس بھول کا اسے تب ادراک ہوا جب پانی سرے اونچا ہونے لگا۔ ڈرائیور نے اچانک ٹیکسی جب دائیں جانب قد آدم خود رو جھاڑیوں میں موڑی تو فوزیہ نے چلا کر کہا۔ ”اے بھائی.....! ادھر کہاں لے جا رہے ہو مجھے.....“

”خاموش ہو کر بیٹھی رہ..... بھائی ہوں گے تیرے گھر پر..... اس وقت تو میری جھولی میں گرا ہوا پکا پھل ہے.....“ ڈرائیور نے غصیلے لہجے میں کہا تو فوزیہ کی روح فنا ہو گئی اور کنپٹیاں سامنے سائیں بکرنے لگیں۔

جب جان اور عزت پر بن آئے تو ایک مجبور عورت اسے بچانے کی خاطر آگ میں بھی کود پڑی ہے..... فوزیہ بھی انجام کی پروا کئے بغیر اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر کود پڑی..... ٹیکسی کی رفتار..... ہم ضرور تھی مگر چلتی زمین پر پاؤں رکھنے سے قدم لڑکھڑاہی جاتے ہیں..... فوزیہ بھی باہر گر کر خود رو جھاڑیوں میں خاصی دور تک لڑکھنیاں کھاتی چلی گئی۔

اس کے حلق سے چیخیں ابل پڑیں..... پورا وجود خراشوں کی زد میں آ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ذرا گاڑی روک لی اور..... اور کچے ہوئے پھل کی طرف لپکا۔

فوزیہ کا سر چکرا رہا تھا..... مگر وہ یہ مشکل تمام اٹھ کر ہراساں ہرنی کی مانند دوڑ پڑی..... اطراف میں چھائی ویرانی اسے طاغوتی قہقہے مارتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

فوزیہ کی ٹانگوں میں اب بھاگنے کی سکت نہ تھی۔ تاہم زمین پر اندھا دھند دوڑنے سے وہ ایک بار پھر گر پڑی..... وہ بد خصلت ٹیکسی ڈرائیور اس کے سر پر پہنچ گیا۔ فوزیہ کی سانسیں بری طرح پھول رہی تھیں۔ وہ خوفزدہ نظروں سے اس شیطان کے مکروہ چہرے کو دیکھنے لگی۔ اس شیطان نے جھک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب جان سے زیادہ عزت عزیز ہو گئی۔ ایسے میں فوزیہ کی خالص نسوانی خوئے چلتر بیدار ہوئی اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں شیطان صفت ڈرائیور سے کہا۔ ”دیکھو میں کوئی پاکباز عورت نہیں ہوں۔ کیا تمہارا گھر نہیں ہے وہاں مجھے لے چلو۔“

ڈرائیور کی دست درازی کو اچانک بریک لگ گیا۔ وہ شیطان فوراً بولا۔ ”پھر..... تو بھاگی کیوں تھی.....؟“

”میں سمجھی تھی کہ تم بھی انہی لوگوں میں سے ہو جو رقم کے لالچ میں عزت لوٹ کر قتل کر دیتے ہیں۔“ فوزیہ نے دوسرا پانسہ پھینکا۔ ڈرائیور کی آنکھیں ”رقم“ کا سن کر مزید پھیل گئیں۔

”کیسی رقم.....؟“ اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔ اس کی خوفناک ابلیتی آنکھوں میں پیسے کی تمنا بھی چمکی۔

”وہ..... رقم ہم نے اس علاقے کے ایک شادی گھر سے لوٹی تھی..... جہاں سے تم مجھے لے کر آئے تھے.....“ فوزیہ نے ایک نئی کہانی کا آغاز کیا۔ اس کے ذہن میں شب گزشتہ گودام ہما قید خانے کے سامنے سے گزرتی بارات کا منظر عود کر آیا تھا۔

”ہاں..... اس علاقے میں پھکو پہلوان دودھ والے کی بیٹی کی شادی تو تھی..... مگر..... اب وہ رقم کہاں ہے؟“ انسان کے روپ میں شیطان ڈرائیور خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ فوزیہ اپنی من گھڑت کہانی میں زور ڈالتے ہوئے بولی۔

”جب میں نے دیکھا کہ میرے چاروں ساتھیوں کی نیتوں میں فتور آ گیا ہے..... یونی وہ..... میری عزت سے کھیلنے کے بعد میرا حصہ بھی چھین لینے کی غرض سے مجھے موت کے گھاٹ اتارنے والے ہیں تو میں نے رقم کا تھیلیا..... وہیں چھپا دیا تھا..... رقم..... دو لاکھ

کے قریب تھی..... زیورات اس کے علاوہ تھے۔“

ڈرائیور کو اپنے ہاتھوں کی..... نہیں بلکہ اپنے پیروں کی انگلیاں بھی انگوٹھیوں سمیت کڑھائی بھرے تیل میں تریتر نظر آنے لگیں۔ ”چل اٹھ میرے ساتھ..... کہاں ہے وہ رقم جو تو نے چھپا رکھی ہے.....؟“

فوزیہ کپڑے جھاڑ کر انھی..... پھر اپنی کہانی کو مزید اثر انگیز بنانے کی غرض سے بولی۔ ”دیکھو.....! اس میں سے آدھا حصہ میرا ہوگا..... آدھا تمہارا..... اور پھر..... میں بھی تمہاری.....“

”ہاں..... ہاں..... مجھے منظور ہے..... چل میرے ساتھ.....“ ڈرائیور لالچ سے اندھا ہو گیا تھا..... زن اور زرنے اس کی مت مادی تھی..... فوزیہ اس کے ساتھ چلنے لگی۔ اس نے قیامت خیز لمحات کو عین سر پر آنے سے روک تو لیا تھا مگر اب بھی وہ محفوظ نہ تھی..... ہاں کچھ مہلت ضرور مل گئی تھی۔ قیامت ڈرادیور کو سر سے ٹل گئی تھی۔ دونوں ٹیکسی میں آ بیٹھے۔ زیر اور زبردست میں معاہدہ ہو گیا تھا..... اب دونوں بالادست تھے۔

اگلی نشست پر اب دونوں براجمان تھے۔ ڈرائیور نے ٹیکسی اشارت کی۔ ”کاش مجھے..... کار چلانا آتی تو میں..... ساری رقم بٹور کر ان کی گاڑی لے کر فرار ہو جاتی..... پھر بلا شرکت غیرے میں اس بڑی رقم کی مالک ہوتی.....“ فوزیہ نے ٹیکسی میں براجمان ہوتے ہی ایک تیر پھینکا۔

”ہوں..... اب بھی شکر کرو..... تمہیں آدھا حصہ تو مل ہی جائے گا ناں.....“ ڈرائیور کمرہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ دل میں وہ لڑکی کی بے وقوفی پر ہنس رہا تھا۔ بے چاری! اب بھی آدھے حصے کی تمنا کئے ہوئے ہے..... چور کو مور پڑ گئے تھے مگر تقدیر خود ڈرائیور کی بے وقوفی پر مسکرا رہی تھی۔ اس نے جیسے ہی گیر بدلتا تو فوزیہ اپنے گلے پر ہاتھ پھیر کر چلائی۔

”اب کیا ہوا.....؟“ ڈرائیور نے جھنجھلا کر پوچھا۔

”وہ..... وہ..... میرا بیروں کا بار جو میرے گلے میں تھا..... شاید..... باہر جھانڑیوں میں..... کہیں گر گیا ہے..... ٹھہرو میں ڈھونڈ کر آتی ہوں.....“ یہ کہہ کر فوزیہ نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا..... مگر ڈرائیور کی آنکھیں بیروں کے تذکرے پر اندھی ہو گئی تھیں بلکہ عقل بھی۔

وہ درشت لہجے میں فوزیہ کو روکتے ہوئے بولا۔ ”خاموش بیٹھی رہو..... میں اتر کر

دیکھتا ہوں.....“

وہ کچا کھلاڑی تھا جو صرف لوٹ کے مال کے اچانک ہاتھ لگ جانے پر عقل خط کر بیٹھتا ہے۔ وہ فوزیہ کا تریانہ جان سکا..... ٹیکسی کے گیر کو دوبارہ نیوٹرل میں ڈالا..... اور انکیشن سوچنے آنے کرنے بھی زحمت گوارا نہ کی..... ایسے ہی باہر اتر گیا۔ پھر وہ جیسے ہی ”ہیروں کا بار“ تلاش کرتا ہوا ٹیکسی سے ذرا دور ہوا فوزیہ کے وجود میں جیسے پارہ دوڑ گیا۔ وہ بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ برابر کی ڈرائیونگ سیٹ پر سرک آئی..... گیر ڈالا اور ہوا ہو گئی..... کچا کھلاڑی..... اپنا سامنے بکتارہ گیا وہ جسے پکا پھل سمجھتا تھا خود پکا پھل ثابت ہو کر ہاتھ ملتارہ گیا تھا۔

☆=====☆=====☆

ملوکان کی بات پر سکھو چاچا کو اس کی ماں عجیباں اور بھائی خالقو پر بڑا غصہ آیا جو چند نگوں کے عوض اس کا ایک عمر رسیدہ شخص سے نکاح کرنا چاہتے تھے۔ چاچا سکھو نے ملوکان کو اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ ساتھ کی جھگی میں موجود دونوں لاپچی ماں بیٹے بیٹھے اندر ہی اندر کڑھ رہے تھے۔

”امڑ.....! تو جا کر..... چاچا سکھو کو سمجھا دے وہ ملوکان کو ہمارے حوالے کر دے اور ہمارے معاملے میں پڑنے کی کوشش نہ کرے..... ورنہ اچھا نہ ہوگا..... میں پھر بڑے چھوٹے کا لحاظ نہ کروں گا۔“ خالقو نے اپنے کان میں انکی بچھی ہوئی بیڑی اتار کر اپنے ہونٹوں پہ دابتے ہوئے ماں سے کہا۔

”سکھو بھلا ہمارا کیا کر لے گا..... جب خود ہماری آپڑیں ملوکان ہی اس کے پاس جا بیٹھی ہے.....“ مائی عجیباں نے زنج ہو کر کہا۔

خالقو..... بیڑی کو سلگاتے ہوئے پھر ایک گہرا کش لے کر بولا۔ ”ٹھیک ہے پھر..... تو نہیں سمجھتی تو میں خود چاچا سکھو سے بات کروں گا.....“

”اڑے چر یا تو کیا بات کرے گا..... ملوکان ہمارے ساتھ آنے پر راضی ہی نہیں.....“

”میں گوٹھ کے چند معتبر لوگوں کو ساتھ لے کر آؤں گا..... پھر دیکھتا ہوں..... چاچا سکھو..... کس طرح ہماری اجازت کے بغیر ملوکان کو رکھتا ہے آپڑیں پاس.....“

”او..... بے وقوفا..... تو سمجھتا کیوں نہیں..... چار آدمی لے کر آئے گا تو وہ بھی ہمارے نمائندہ پر جوتا ماریں گے..... کوئی اور تدبیر سوچیں گے، غصہ مت کر..... پہلے ہی تیری جلد

کرنیں ابھی سنہری نہیں ہوئی تھیں اور میراں نے ملوکاں کو سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ وہ سورج کے جھکنے سے پہلے ہی واپس لوٹ آئے۔

بہر طور زبادیر بعد ملوکاں..... ماما اللہ رکھیو کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی..... آج اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ کم از کم ماما اللہ رکھیو سے اپنی اصل مجبوری اور مشکل بتا کر رہے گی۔ اس کے دل کی عجیب کیفیت ہونے لگی تھی اور دل بے طرح دھڑکنے لگا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر اندر سے کھانسنے کی آواز ابھری..... یہ ماما اللہ رکھیو تھا۔

”کون ہے بابا..... آتا ہوں.....؟“ پھر دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ سامنے ملوکاں کو دیکھ کر وہ ذرا چونکا اور پھر اسے راستہ دیتے ہوئے ایک طرف ہو گیا۔ ملوکاں نے اسے سلام کیا اور سر کی چادر درست کئے اندر آ گئی۔

”دھیئے..... خیریت تو ہے..... ٹو ادھر.....“

”ہاں..... ماما..... خیریت ہی تو نہیں ہے!“ ملوکاں نے متلاشی نگاہوں سے صحن میں ادھر ادھر دیکھا اور غمزدہ لہجے میں بولی۔ ”ماما! میرا بیو..... فوت ہو گیا ہے.....“

اس کی بات سن کر ماما اللہ رکھیو زیر لب بڑبڑایا۔ ”جو حکم اللہ کا“ کہتے ہوئے اس کے سر پر ازراہ شفقت اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”دھیئے.....! اللہ سائیں تجھ پر رحم کرے، مجھے بھی ٹھٹھل کی وفات کا دکھ ہوا پر یہ بتانا..... بات کیا ہے تو کچھ پریشان نظر آ رہی ہے۔“

اس کے شفقت اور اپنائیت بھرے لہجے پر ملوکاں رو پڑی پھر اس نے ہچکیوں کے درمیان اسے اپنی ماں اور بھائی خالقو کے عزائم سے آگاہ کیا جسے سن کر ماما اللہ رکھیو چند ثانیے ہنسوج خاموشی میں مستغرق سا ہو گیا۔ پھر قدرے پرتفکیر لہجے میں بولا۔ ”دھیئے..... اللہ بہتر کرے گا..... ٹو پریشان نہ ہو..... ابھی تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ ٹو اپڑیں چا چا سکھیو کے پاس ہی رہ..... ویسے میں کسی وقت تیرے گھر آؤں گا..... تیری ماں اور خالقو سے ملاقات کروں گا.....“

اس کی بات سن کر ملوکاں نے ایک لمحے ذرا چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو ماما اللہ رکھیو کو اس کی آنکھوں میں امید کے خاموش چراغ جلتے ہوئے نظر آئے۔ وہ جانتا تھا کہ اس چراغ کی دھیمی دھیمی آج پر کیسے معصوم خوابوں کی متوقع تعبیر پک رہی تھی۔ وہ ملوکاں کے اس طرح آنے اور اپنی ”پریشانی“ کی اصل وجہ بتانے سے بھی بہ خوبی آگاہ تھا۔

”دیکھ دھیئے.....! میں تیری پریشانی کی وجہ جانتا ہوں..... اور مجھے اس بات کا بھی اندازہ ہے کہ ٹو سانول سے کیا چاہتی ہے..... مجھے تم دونوں کی شادی پر کوئی اعتراض نہیں

بازی اور غصے کی وجہ سے ملوکاں..... چا چا سکھیو کے پاس جا بیٹھی ہے.....“ مائی عجیباں نے بیٹے کو سرزنش کرتے ہوئے زمانہ چشیدہ لہجے میں کہا تو خالقو برا سامنہ بنا کر چپ ہو رہا۔

ملوکاں کو اگرچہ چا چا سکھیو کے پاس آ کر قدرے ذہنی سکھ ملا تھا..... مگر اسے اب یہ احساس بھی ستانے لگا تھا کہ وہ ان پر بوجھ بن کر رہ گئی ہے..... اس کا حل اس نے یہ نکالا کہ میراں سے درخواست کر کے اس کی سلائی کڑھائی کا آدھا کام بانٹ لیا۔ میراں..... ملوکاں کی خودداری سے بہ خوبی واقف تھی، اس لئے اس نے پاس پڑوس کے لوگوں کا کام ملوکاں کو لے دیا تھا..... ساتھ ہی اس نے ملوکاں کو سندھی نوپیاں اور خوبصورت جھلملاتے پراندے اور سندھی بلوچی کڑھائی والے زنانہ کرتے اور بھرت والے گلے بھی بنانا سکھا دیئے تھے۔

ملوکاں شتم شتم زندگی گزار رہی تھی۔ وہ سانول کی طرف سے بدستور بے چینی کا شکار تھی..... میراں اس کی پچازاد ہی نہیں بلکہ رازداں سہیلی بھی تھی اور اس کے حال دل سے بھی واقف تھی..... مگر اکثر وہ بھی ملوکاں کو سمجھاتے ہوئے کہتی۔ ”ملوکاں..... تیرا سانول سے اس طرح بار بار ملنا ٹھیک نہیں ہے..... پہلے ہی تیرا چرسی بھائی اور ماں تجھ پر خار کھائے بیٹھے ہیں.....“

”ہم کہاں ملتے ہیں..... میراں.....!“ ملوکاں نے اپنی سرگیں آنکھوں میں بے تعبیر خواب سموتے ہوئے کہا۔ ”سانول تو مجھے دیکھتے ہی بھڑک اٹھتا ہے..... سمجھ میں نہیں آتا..... اسے مجھ سے کیوں نفرت ہے.....“

”اڑی چری.....! وہ تجھ سے ہی نہیں..... بلکہ..... سبھی عورتوں سے نفرت کرتا ہو گا..... اور ایسا یقیناً اس کی سنگتیر سدھوراں کی بے وفائی کی وجہ سے ہوا ہے.....؟“ میراں نے اس کے گہری اداس آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”اگر ایسا ہے تو ایسا ہی سہی..... دیکھنا میں بھی اس پتھر کو ایک روز پگھلا کر رہوں گی.....“ ملوکاں نے قطعیت آمیز لہجے میں کہا۔

وہ دونوں اس وقت حسب معمول نہر پر پانی بھرنے آئی تھیں..... ملوکاں، میراں کی منت سماجت کر کے اسے وہیں موجود رہنے کا کہہ کر آگے بڑھ گئی تھی۔ سانول کا گھر نہر کے پار ہی تھا۔ وہ ایک پلیا سے گزرتی ہوئی نہر کی دوسری طرف آئی۔ پھر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی کھیتوں کے درمیان سے ہوتی..... اپنے محبوب کی گل میں داخل ہو گئی.....

دور مغرب میں..... جو ار اور باجرے کے کھیتوں کی طرف..... جھکتے ہوئے سورج کی

دینے کا فیصلہ کیا مگر جیب چھوڑنے سے پہلے وہ..... بچپیلی سیٹ پر رکھا ہوا تھیلا اٹھانا نہیں بھولا تھا۔ اس نے تھیلے کی زپ کھول کر اس کی تلاشی لی تو اندر سے سگریٹ اور ماچسوں کے بندل سے ملا وہ پانی سے بھری ہوئی بوتل برآمد ہوئی۔ سارنگ نے صرف پانی کی بوتل اٹھالی اور باقی تھیلے کو وہیں چھوڑ کر آگے روانہ ہو گیا۔

ریت رفتہ رفتہ بھر بھری مٹی کی صورت اختیار کرنے لگی تھی..... آس پاس ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔ سورج آگ برسا رہا تھا۔ گرم ہواؤں کے تھپڑے چہرے کو ہی نہیں بلکہ پورے وجود کو جھلسائے دے رہے تھے۔ تاہم جیب کے ذریعے اتنا فاصلے ضرور طے ہو گیا تھا کہ اب تھوہری جھاڑیوں کی جگہ کھجور کی خورد درجہ جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اچانک سارنگ کو سامنے ایک چھتھنا درخت تلے جھونپڑی سی نظر آئی۔ سارنگ کے دماغ میں جھماکہ کا سا ہوا اسے یوں لگا جیسے وہ اپنی مطلوبہ منزل ”گدرا“ یا ”باولی“ تک آ پہنچا ہے..... اور یہ اس راجستھانی سنیا سی، جیوش بابا کی کنیا ہے..... اس کے اندر اب آگے بڑھنے کی ایک نئی ہمت عود کر آئی..... وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ ساتھ ہی اپنی آئندہ کی حکمت عملی پر بھی غور کرتا جا رہا تھا کہ جیوش بابا کے ذریعے اس دعا باز گاتریا کے بارے میں کس طرح استفسار کرے..... کیوں کہ سارنگ کو یاد تھا کہ املی نے اسے جیوش بابا کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ جیوش بابا در پردہ کس قسم کا ”بابا“ تھا۔ اس کا درحقیقت پردہ فروشوں کے ٹولے سے تعلق تھا اور وہ ایک پینچے ہوئے ”بابا“ کا بھیس بدل کر لوگوں کو بے وقوف بنا رہا تھا..... اور مزید یہ کہ گاتریا اس کا مقرب خاص تھا۔ بہر طور سارنگ نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ بندی کی اور بدستور آگے چلتا رہا..... یہاں تک وہ جھونپڑی کے قریب پہنچ گیا۔ جھونپڑی کے آس پاس سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سارنگ جھونپڑی کے سامنے پہنچ کر ذرا پروا پر کورکا..... سامنے ٹاٹ کا پردہ جھول رہا تھا۔ اچانک اندر سے ایک بخاری بھرم آواز ابھری ”کون ہے باہر..... اندر آ جاؤ.....“

آواز سن کر سارنگ چونک گیا پھر دوسرے ہی لمحے وہ اللہ کا نام لے کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر ایک بوسیدہ سی چٹائی پر ایک سیاہ روٹھنٹ آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ اس کی عمر ستر اسی سال کے لگ بھگ نظر آتی تھی مگر وہ تھا خاصا موٹا تازہ اور تنومند..... اس کی ہر ہمت پیشانی پر ترشول کا نشان لگا ہوا تھا۔ اس نے خاص پجاریوں کے سے انداز میں میز پر سارنگ کی دھوتی باندھ رکھی تھی..... اس کے گلے میں موٹے موٹے منکوں کی مالائیں بھی جھول رہی تھیں۔ قریب ہی ایک ترشول رکھا تھا۔ سارنگ نے فوراً جان لیا کہ یہی جیوش

ہے بلکہ مجھے خوشی ہوگی کہ تو اس کی دلہن بن کر یہاں آجائے..... اور میں آپڑیں سانول کے لیے تیرا ”سنگ“ مانگنے کی بھی ہمت رکھتا ہوں..... پر سانول.....“ وہ اتنا کہہ کر دانستہ خاموش ہو گیا اور ملوں اچانک اپنا سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اسے اپنی جانب مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پا کر ماما اللہ رکھیو اپنی ادھوری بات مکمل کرنے کی غرض سے مزید بولا۔ ”پتہ نہیں سانول کیا چاہتا ہے..... میں نے اس سے تیرے بارے میں تنہائی میں رائے بھی لینے کی کوشش کی ہے پروہ..... مجھے نالتا ہی رہتا ہے۔ خیر اب میں اسے تیری مجبوری بتا کر سمجھانے کی کوشش کروں گا تو بے فکر رہ۔ چل میں تجھے چھوڑ آؤں۔“

”ماما..... کیا سانول گھر پر نہیں ہے۔“ ملوکاں نے اچانک کسی خیال کے تحت پوچھا تاہم اسے ماما اللہ رکھیو کی باتوں سے کافی تسلی ہو گئی تھی۔

”ہاں وہ باہر گیا ہے کام پر..... آتا ہی ہوگا۔ کیا اس سے ملے گی تو.....؟“

”ہاں..... نن..... نہیں.....“ ماما کے اچانک استفسار پر وہ ذرا گڑبڑا سی گئی پھر دوسرے ہی لمحے اپنی بات پوری کرتے ہوئے بولی۔ ”میں مل کر گیا کروں گی اس سے..... وہ تو مجھے دیکھتے ہی خار کھانے لگتا ہے۔ اچھا نانا.....! میں اب چلتی ہوں..... پر دیکھ ماما تو اپڑاں وعدہ یاد رکھنا..... اور ہاں..... سانول کو بتا دینا، میری ماں اور لالچھی بھائی خالقو نے زبردستی میری شادی اس بڑھے آچر خان سے کرنے کی کوشش کی تو..... تو..... میں زہر کھا کر آب گھات (خودکشی) کر لوں گی۔“ ملوکاں اتنا کہہ کر پھر نہیں رکی..... اور اپنی اجرک کی چادر میں منہ چھپائے باہر نکل گئی۔

وہ جیسے ہی گلی میں آئی تو اچانک سامنے دو افراد پر نگاہ پڑتے ہی اس کا خون خشک ہونے لگا۔ سامنے اس کا بھائی خالقو اور بڑھا آچر خان کھڑے اس کی طرف خونیں نظروں سے گھور رہے تھے۔

☆=====☆=====☆

سارنگ خاصی تیز رفتاری سے بیکراں پھیلے ہوئے صحرا کی وسعتوں میں جیب دوڑائے چلا جا رہا تھا پھر قریباً جب گھٹنے پھر کی مسافت طے کر آئے تو اچانک اس کی جیب کا انجن بند ہو گیا۔ سارنگ نے اسے روک کر دو تین بار اشارت کرتے ہوئے کوشش کی مگر بے سود..... جیب کا ایندھن شاید ختم ہو گیا تھا۔ ”فیول“ بتانے والی سوئی ایک طرف کو مکمل طور پر جھک گئی تھی۔ سارنگ نے جھنجھلا کر اسٹیئرنگ پر مکا جمایا اور پھر اس نے جیب کو ادھر ہی چھوڑ

بابا ہے، اس کا مطلوبہ شخص!

”کون ہے ٹو بائکے؟ لگتا ہے ٹو مسافر ہے؟“ اس نے بدستور آنکھیں موندے ہوئے پوچھا تو سارنگ کو اس کی قیافہ شناسی پر حیرت ہوئی مگر پھر اس نے بے زنی سے سوچا کہ یہ سب ایسے مکروہ لوگوں کی بازی گری ہوئی ہے، وہ مرعوب ہونے کے انداز میں ذرا آگے بڑھا اور فرش پر ہی بیٹھ گیا اور متاثر کن لہجے میں بولا۔

”سوامی جی! جیسا آپ کے بارے میں سن رکھا تھا ویسا ہی پایا۔ آپ تو بند آنکھوں سے پورا سنسار پہچان لیتے ہیں۔ میں ایک مسافر ہوں اور آپ کی شہرت سن کر ایک دور پرے کی ہستی سے آیا ہوں۔ کیا..... کیا آپ ہی جیوش بابا ہیں۔“

سارنگ کی بات سن کر اس پجاری نے ایک دم اپنی آنکھیں کھول کر اس کی طرف گھورا..... سارنگ کو کیا یک جانے کیوں اس کی اپنی جانب گھورتی ہوئی آنکھیں اپنے دجور میں اترتی محسوس ہوئیں۔

”ٹو کسی اور ہی دھرتی کا منش لگے ہے..... کیا لینے آیا ہے میرے دوار.....؟“ اس نے پوچھا۔

سارنگ نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”سوامی جی! تم نے ٹھیک اندازہ لگایا.....“

”اندازہ نہیں مورکھ..... جان کاری کہو۔“

اچانک جیوش بابا نے برہم ہو کر اس کی بات کاٹی تو سارنگ کو فوراً اپنی غلطی احساس ہوا اور ایک دم وہ خوفزدہ سے لہجے میں بولا۔ ”چھما کر دو سوامی جی..... غلطی ہو گئی..... زبان پھسل گئی..... وہ..... وہ..... میں..... میگو اٹو قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں..... ادھر سرحد پار ہمارا قبیلہ ہے..... میں خود..... وہاں کے کھیا کلہیا ہوں..... دراصل ہمارے قبیلے میں ایک بڑی جان لیوا اور پراسرار بیماری پھیل گئی ہے..... کسی نے بتایا تھا کہ اگر ہم میں سے کوئی جیوش بابا کے پاس جا کر اس کی چالیس دنوں تک سیوا کرے تو ہمیں اس جان لیوا بیماری سے نجات مل جائے گی.....“ سارنگ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بڑی مکاری سے بولا۔

”سوامی جی! مجھے چالیس دنوں تک اپنے چرنوں میں جگہ دے دو میں آپ کی سیوا کرتا ہوں۔“

اس کی بات سن کر جیوش بابا نے اسے پہلی بار بغور دیکھا پھر جیسے یک دم کچھ سوچ کر غصیلے لہجے میں بولا۔ ”چل چل جا یہاں سے..... میری سیوا کے لئے یہاں کے لوگ ہی کافی

ہیں..... میں انہیں بھی اپنے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دیتا.....“

سارنگ نے اس کی بات سن کر دل میں کہا۔ ”میں اچھی طرح جانتا ہوں رذیل انسان کہ ٹو اپنے ساتھ کیوں کسی کو رہنے کی اجازت نہیں دیتا تاکہ کوئی تیرے کالے کرتوتوں کا پتہ نہ چلا لے.....“

”نہیں سوامی جی! مجھ گریب پر یہ ظلم نہ کرو..... میں میلوں کا سفر اور جانے کتنے کٹ بھوگتا ہوا تمہارے چرنوں تک پہنچا ہوں..... میں اب چالیس روز پورے کئے بغیر یہاں سے ہلوں گا بھی نہیں.....“

سارنگ کی بات سن کر جیوش بابا کے خاکستری چہرے پر پریشانی کے تاثرات ابھرے..... اس نے قریب پڑی ایک چھڑی اٹھالی اور طیش میں آ کر..... اس چھڑی سے سارنگ کو پینٹنے لگا۔

سارنگ نے اف تک نہ کی..... بلکہ الٹا خوشی سے سرشار ہو کر بولا۔ ”واہ سوامی جی! واہ..... تمہارے ہاتھوں کی تو مار کھا کر بھی ایسا لگتا ہے جیسے میرے من کے سارے پاپ دھل رہے ہوں..... واہ..... واہ..... سوامی جی! اور مارو مجھے..... اور مارو..... مجھے.....“

اچانک باہر آہٹ اٹھری..... جیوش بابا کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے چھڑی ایک طرف پھینک دی۔ اس کی نظریں سارنگ کے چہرے سے ہٹ گئیں۔ باہر کچھ لوگوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ساتھ ہی کسی عورت کی ہسٹریائی چیخیں بھی سنائی دینے لگیں۔

سارنگ ٹھٹک گیا..... مگر پھر فوراً ایک کونے میں سکڑ سمٹ کے بیٹھ رہا..... اچانک جھوپڑی کا ٹاٹ ایک طرف کو ہٹا اور..... اس نے دو عمر رسیدہ مرد عورت کو اندر آتے دیکھا..... انہوں نے ایک جوان لڑکی کو بازوؤں سے دیوچ رکھا تھا۔ لڑکی دہلی پتلی اور خاصی خوبصورت تھی۔ مگر اس کی حالت بہت غیر ہو رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر وحشتوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ یہ لوگ مقامی باشندے معلوم ہو رہے تھے۔

”مہاراج..... رکنی کو ہم لے آئے ہیں..... اس کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی ہے..... اب آپ کچھ کرو..... یہ گھر بہت ہنگامہ مچانے لگی ہے۔“ عمر رسیدہ شخص نے جیوش بابا سے مخاطب ہو کر پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

جیوش بابا نے بہ غور لڑکی کے چہرے کا جائزہ لیا پھر بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔

”ہوں.....! لگتا ہے آسیب نے اسے پوری طرح جکڑ لیا ہے اور اب اس کے سر نہیں رہے، اسے پھول سگھانے پڑیں گے، دھونی دینی پڑے گی۔“

”مہاراج..... اب تم جو بھی کرو..... پر مہری بچی کو اس بھوت سے نجات دلا دو۔“ اس بار عمر رسیدہ عورت نے قدرے رو بانے لہجے میں کہا تو ایک طرف کونے میں دبے ہوئے سارنگ کو یہ سمجھنے میں چنداں دیر نہ لگی کہ یہ دونوں بوڑھے میاں بیوی درحقیقت اپنی بیٹی رکنی کا آسیب اتارنے کی غرض سے اسے یہاں لے کر آئے ہیں۔ ”ٹھیک ہے..... تم دونوں اسے یہاں چھوڑ جاؤ..... میں آج رات، میں اس کا چھپیت اتارنے کی کوشش کروں گا۔“ جیوش بابا نے رکنی کو جلا دایسی نظروں سے، گھورتے ہوئے کہا اور پھر اس لڑکی کے ہاں باپ خاموشی سے اپنا سر اثبات میں بلاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

”ان کے نکلنے ہی رکنی نے بھی جھوپڑی سے بھاگنے کی کوشش کی تو جیوش بابا نے آگے بڑھ کر قصاب کی طرح اسے دبوچ لیا اور اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ کر واپس اندر کھینچ لیا۔ لڑکی کے حلق سے ہذیانی چیخیں خارج ہو گئیں۔“

”چھوڑ دے مجھے..... میں کہتا ہوں چھوڑ دے مجھے ورنہ تجھے جلا کر رکھ دوں گا بڑھے۔“ رکنی نے اچانک بدلے ہوئے خرخراتے لہجے میں جیوش بابا کو خوں فشاں نظروں سے گھور کر کہا تو ایک لمحے کو سارنگ بھی اس کے خالص مردانہ لب و لہجے پر ششدر سا رہ گیا۔ جیوش بابا اس کے خونخوار لہجے سے خائف ہوئے بغیر پیش میں بولا۔ ”خبردار.....! اس ناری کا پیچھا چھوڑ دے مورکھ..... ورنہ میں تجھے جلا کر رکھ کر دوں گا۔“

جیوش بابا نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر زور سے جھنجھوڑا تو اس بار رکنی کی چیخیں بلند ہو گئیں۔ اس کے بعد جیوش بابا نے سارنگ کو مخاطب کر کے کرخت لہجے میں کہا۔ ”اٹھ زے..... ادھر سی پڑی ہے..... اس لڑکی کے ہاتھوں کو اچھی طرح کس کر باندھ دے۔“

سارنگ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے جلدی سے اٹھا اور ایک طرف پڑی سی اٹھا کر رکنی کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے باندھ دیئے..... جیوش بابا نے اس کے بال چھوڑ دیئے..... رکنی اب پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ جیوش بابا کے بد ہیئت ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

سارنگ اس شیطان کے ہونٹوں پر کھیلنے کا، مسکراہٹ کو، کچھ رہا تھا جبکہ رکنی ایک طرف کونے میں بیٹھ کر..... لایاں لے رہی تھی، اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ وجہ سے وہ بے چاری اپنے آنسو بھی نہیں پونچھ پارہی تھی، یہی سبب تھا کہ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ سارنگ کو اس غریب لڑکی پر ترس آ رہا تھا۔ مگر وہ مجبور تھا تاہم اس نے دل

میں معم نہ کر لیا تھا کہ اگر جیوش بابا نے اس پر گندی نظر ڈالنے کی کوشش کی تو وہ اسے اچھی طرح مزہ چکھا دے گا۔

”اوئے ٹوکیا کر رہا ہے..... جا..... جا کر پانی کا مٹکا بھرا۔“ وہ جیوش بابا کی کرخت آواز سن کر چونکا۔

”مم..... مجھے تو نہیں معلوم کدھر سے پانی بھرنا ہے سوامی.....!“ وہ اپنے لہجے میں سادہ لوحی سموتے ہوئے بولا۔

”چل ٹو مٹکا اٹھا، میں تجھے بتاتا ہوں۔“ جیوش بابا نے کونے میں دھرے بڑے سے پٹے کی طرف اشارہ کیا تو سارنگ نے جھٹ آگے بڑھ کر وہ مٹکا اٹھا لیا اور پھر جیوش بابا کے ساتھ جھوپڑی سے باہر آ گیا۔

”وہ سامنے دیکھ رہا ہے کھجور کا جھنڈ.....؟“ جھوپڑی سے باہر آ کر جیوش بابا نے سامنے داہنی طرف اشارے سے سارنگ کو بتایا۔ ”وہاں ایک برساتی ٹوبہ ہے، وہیں سے بھر لاپانی جا.....!“ یہ کہہ کر جیوش بابا جھوپڑی کے اندر واپس چلا گیا۔

سارنگ مٹکا سنبھالے آگے بڑھا تو اچانک اسے خیال آیا کہ کہیں یہ مردود اسے بہانے سے باہر تو نہیں نکال رہا تھا کہ اس کا کام آسان ہو سکے اور اس مجبور لڑکی رکنی کی عزت کے ساتھ کھیلنے کی کوشش کرے۔ اس خیال کے آتے ہی سارنگ کے قدم رک گئے اور پھر وہ واپس جھوپڑی کی طرف پلٹا، مٹکا اس نے ریت پر رکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا جھوپڑی کی عقبی طرف آیا۔ یہ جھوپڑی بانسوں کے ڈھانچے سے بنی ہوئی تھی جسے سوکھی گھاس، پھونس اور کھجوروں کی گھنی شاخوں سے ڈھک دیا گیا تھا تاہم اس کے اندر کہیں کہیں رخنے بھی موجود تھے۔ وہ آہستگی کے ساتھ ایک روزن کو تلاش کر کے قدرے جھک کر جھوپڑی کے اندر جھانکنے لگا۔

اندر کیا دیکھتا ہے کہ وہ اہلس شخص اس لڑکی رکنی کو بہلانے پھسلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”دیکھ ری.....! میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں ٹو یہ سب چھل فریب کر رہی ہے، تیرے سر پر کوئی سایہ دایا نہیں ہے، کیا ٹو کسی لڑکے سے پریم کرتی ہے، اگر ایسا ہے تو میں خود تیری مدد کروں گا ورنہ ٹو جانتی ہے کہ بستی کے سارے لوگ اور خود تیرے اپنے ماما، پتا (مال، باپ) مجھے پر کس قدر اعتماد کرتے ہیں..... میں بھوت اتارنے کے بہانے تیرا مار مار کر بھر کس نکال دوں گا۔“

جیوش بابا کی دھمکی پر رکنی بری طرح لرز گئی اور آنسوؤں بھرے چہرے سے اس کی

طرف تکتے ہوئے بولی۔ ”ہاں.....! میں یہ سب اس لئے کرتی ہوں کہ میرے ماما، پاپا، کرمیری شادی و کرماجیت سے کر دیں۔“ بالآخر رکنی نے جیوش بابا کے اندھیرے میں چھوڑے ہوئے تیر سے مرعوب ہو کر اصل حقیقت کہہ ڈالی۔ تب پھر سارنگ نے دیکھا کہ جیوش بابا نے رکنی کے دونوں ہاتھوں کی رسی کھول دی پھر بڑی چالاکی سے بولا۔

”اگر تو چاہتی ہے کہ وکرماجیت سے تیری شادی ہو جائے تو میں تیرا یہ کام آسان کر سکتا ہوں۔“ اس کی بات سن کر الم نصیب رکنی امید بھری نگاہوں سے اس شیطان کو دیکھنے لگی پھر اسی لہجے میں بولی۔

”کک..... کیا..... تیت..... تم صحیح کہہ رہے ہو؟“ اس کے لہجے میں غیر یقینی تھی۔

”ہاں.....! بھلا میرا حکم ٹالنے کی کسے جرأت ہوگی، میں تیرے ماما، پاپا سے کہہ دوں گا کہ اگر وہ وکرماجیت کو اپنا داماد بنالیں تو ان کی بیٹی کے سر سے یہ آسیب ہمیشہ کے لیے اتر جائے گا۔“ جیوش بابا نے اسے بڑی مکاری سے سبز باغ دکھاتے ہوئے کہا کہ تو رکنی کا پڑا مردہ چہرہ یکدم کھل اٹھا۔

”پر تجھے اس کے لیے میرا بھی ایک کام کرنا پڑے گا۔“ اس کے چہرے پر خوشی کے سوتے پھوٹنے دیکھ کر جیوش بابا گویا فوراً اپنے مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولا۔

رکنی نے پوچھا۔ ”ہاں..... ہاں..... مہاراج.....! میں تمہاری ہر بات مانوں گی، بس میری کسی طرح وکرماجیت سے سگائی ہو جائے۔“

”تو ٹھیک ہے پھر..... پھر.....!“ جیوش بابا بولا۔ ”تجھے کچھ عرصے تک میری دای بن کر رہنا ہوگا اور جیسا میں کہوں، ویسا کرنا ہوگا۔“

اس کی بات سن کر رکنی نے وحشت زدہ نگاہوں سے اس شیطان کی طرف دیکھا، اس کی نگاہوں نے اس آنکھوں میں ناچتی ہوئی ایک خاص قسم کی چمک دیکھ لی تھی۔

ادھر سارنگ بھی جیوش بابا کے مکروہ عزائم پر ٹھٹھکے بغیر نہ رہ سکا تھا، اسے اب جیوش بابا جیسے رذیل انسان پر مزید طیش آنے لگا، وہ سادھو کے بھیس میں ایک سیاہ کار شخص تھا اور ایک معصوم اور مجبور لڑکی کی عزت سے کھینے کے منصوبے بنا رہا تھا۔

رکنی گومگو میں مبتلا ہو گئی تھی اگرچہ اس کے وجدان نے بھانپ تو لیا تھا کہ یہ بھیڑیا اس سے کیا چاہتا ہے مگر پھر بھی وہ اپنی سادگی میں یہ سمجھ رہی تھی کہ جیوش بابا شاید بوڑھا ہونے کی وجہ سے کچھ روز اس سے اپنی خدمت کروانا چاہتا ہے لہذا اس نے کچھ سوچ کر اپنا سر جھکا لیا۔ جیوش بابا کی آنکھوں میں شیطانی چمک فزوں ہونے لگی، ادھر سارنگ کسی ناخوشگوار واقعے

☆ ===== ☆ ===== ☆

حل کرنا چاہئیں..... ہمیں اس وقت ہی متعلقہ تھانے میں جہاں داد کے خلاف پرچہ کٹوا دینا چاہئے تھا جب وہ میری غیر موجودگی میں اپنے ساتھیوں سمیت تمہیں یہاں اغوا کرنے آیا تھا، چلو اٹھو..... ہمیں ابھی تھانے چلنا چاہئے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑا ہوا مگر سدھوراں کے چہرے پر گہرے تذبذب کے آثار نمودار ہو گئے پھر وہ کسی خیال کے تحت پرویز سے بولی۔

”سائیں.....! میری بات مانو تو ابھی تھانے یہ بات نہ پہنچاؤ تو اچھا ہے۔“

پرویز اس کی بات سن کر چونک کر بولا۔ ”مگر سدھوراں.....! آخر کیوں.....؟ تم تھانے سے کیوں کتر رہی ہو؟“

اس کے استفسار پر سدھوراں ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”سائیں.....! اگر ہم پولیس کے پاس جائیں گے تو وہ ضرور ہم سے جہاں داد کی دشمنی کی وجہ پوچھے گی اور آپ جانتے ہو کہ ہم اگر اصل بات بتائیں گے تو ہماری مکمل میں بلا وجہ بدنامی ہوگی..... میرا ہاں اچھالا جائے گا اور اس طرح آپ کی عزت پر بھی حرف آئے گا۔“

اس کی بات سن کر پہلی بار پرویز کے چہرے پر گہری سوچ کی لکیریں نمودار ہوئیں اور وہ بارہ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے شکست خوردہ سے انداز میں بولا۔ ”تو پھر تم ہی بتاؤ کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے..... ویسے اس کمینے جہاں داد کو لگام ڈالنی ضروری ہے ورنہ وہ اس طرح ہمارا ہچکچائیں چھوڑے گا۔“

”اس کا ایک ہی حل ہے سائیں.....!“ سدھوراں نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا اور پرویز مستفسرانہ نظروں سے اس کا چہرہ تنکے لگا۔

”ہمیں ایک بار میر منصب خان سے مل لینا چاہئے۔“ سدھوراں نے اپنی بات مکمل کی۔ پرویز قدرے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”مگر کس طرح.....؟ جہاں داد ہر وقت بھوکے بھیڑیے کی طرح اپنے غول سمیت ناری گھات میں بیٹھا رہتا ہے۔“

”سائیں.....! ہمیں اتنی ہمت تو کرنا ہی پڑے گی۔“ سدھوراں نے ہولے سے کہا۔

پرویز ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”ٹھیک ہے پھر ہمیں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔“

”سائیں.....! یہی وقت مناسب ہے میر صاحب سے ملنے کا.....“ اچانک نموداروں نے کچھ سوچتے ہوئے قدرے جوشیلے لہجے میں کہا۔

”وہ دونوں میاں، بیوی اپنی بروقت حاضردماغی اور غیر معمولی جرأت مندی سے کام لیتے ہوئے جہاں داد اور اس کے بد معاش حواریوں کے چنگل سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے، ٹیکسی میں وہ دونوں خاموش بیٹھے تھے، سدھوراں کبھی کبھی سرگھا کر عقب میں دیکھتی کہ کہیں جہاں داد کی جیب اس کے تعاقب میں تو نہیں آرہی، کوئی بیس پچیس منٹ بعد ٹیکسی نے انہیں گھر کے سامنے اتار دیا، پرویز نے ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر اسے فارغ کیا اور جیب سے چابیاں نکال کر دروازے پر پڑے تالے کو کھولا اور پھر وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔“

دونوں نے پانی پیا پھر اپنے کمرے میں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

”میرے خیال میں ہمیں واپس نہیں لوٹنا چاہئے تھا۔“ سدھوراں نے پُر خیال انداز میں پرویز سے کہا۔

”تو پھر کیا کرتے..... کہاں جاتے.....؟“ پرویز نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہمیں کم از کم جہاں داد کے باپ میر منصب خان سے مل لینا چاہئے تھا۔“ سدھوراں نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ اب اس سے ملنے کی ضرورت نہیں۔“ پرویز کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”میں اب سیدھا پولیس اسٹیشن جاؤں گا اور جہاں داد اور اس کے حواریوں کے خلاف رپورٹ درج کراؤں گا پھر انہیں لے کر ویران جنگلے میں چھاپہ لگواؤں گا، مجھے یقین ہے کہ وہ جنگلہ جہاں داد کی ملکیت ہی ہوگا۔“

”کیا یہ بہتر نہ ہوگا سائیں کہ ہم پہلے ڈاکٹر فوزیہ سے ایک ملاقات کر کے ان سے مشورہ کر لیں.....؟“ سدھوراں نے پرویز کے چہرے کی طرف دیکھ کر تجویز دی۔

وہ فوراً نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں.....! ہمیں اب اپنے معاملات خود

اٹھ کر دبے پاؤں چلتی ہوئی اپنے کمرے کے دروازے کے قریب آئی اور جھری
باہر صحن میں جھانکا تو اس نے دیکھا کہ پرویز، دلدار حسین کو بیٹھک میں بٹھانے کی
جائے باہر صحن میں ہی اس سے باتیں کر رہا ہے، سدھوراں کے کانوں تک ان دونوں کی
گفتگو کرنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

”یار پرویز! ٹوٹنے بڑے دن لگا دیئے، کیا ابھی تک بھابی کو راضی نہیں کر سکا، اس
مردودا انپکڑیا اور حیات سے نہ ناک میں دم کر رکھا ہے، سارا دھندا چو پٹ کر دیا ہے۔“ یہ دلدار
حسین تھا، سدھوراں کو اس کی باتیں زہر لگتی تھیں، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کمینے شخص کا
مذہب لے کر اب وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ جواب میں اس کا شوہر پرویز سے کیا کہتا ہے۔

”یار دلدارے! تھوڑے دن اور ٹھہر جا، آج کل میں ایک مسئلے کا شکار ہوں۔“
”ارے یار! اس سے بڑھ کر اور کیا مسئلہ ہو سکتا ہے، پہلے اپنی بیوی کو انپکڑیا اور کے
پاس!۔۔۔۔۔“

”دلدارے!۔۔۔۔۔“ اچانک سدھوراں کو پرویز کی جوش غیرت سے لبریز کرخت
آواز سنائی دی، پرویز کی اس گرجدار آواز میں بلا کی سختی تھی جس نے سدھوراں کا دل سرشار
کر دیا تھا۔ سدھوراں پھر زیادہ دیروہاں نہیں کھڑی رہی اور کمرے سے نکل کر صحن میں آگئی
اور دلدار حسین کے قریب آکر اسے گھورتی ہوئی ناگن کی طرح پھنکار کر بولی۔

”کیوں ڈرے! کیا تیری کوئی بیوی، بیٹی نہیں ہے، تو اسے کیوں نہیں بھیج دیتا اس
کمینے انپکڑ کے پاس!۔۔۔۔۔ میں کہتی ہوں دفع ہو جا یہاں سے!۔۔۔۔۔“

دلدار کے لئے یہ سب قطعاً غیر متوقع صورت حال تھی، اس نے ایک نظر پرویز کی
طرف دیکھا مگر پرویز کے چہرے پر بدستور کھنڈی ہوئی سرد مہری محسوس کر کے وہ زہر خند
انماز میں دانت پیس کر واپس مڑا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

سدھوراں نے پرویز کے چہرے کی طرف دیکھا، وہاں اب پریشانی کے آثار عود کر
آئے تھے، سدھوراں نے بڑی محبت کے ساتھ اس کا ہاتھ تھاما اور حلاوت بھرے لہجے میں
”اے!۔۔۔۔۔“ کیا ہوا سائیں!۔۔۔۔۔ آپ کیوں پریشان ہیں!۔۔۔۔۔ اچھا ہی ہو، جو اس مردود کو ہم نے
عاف جواب دے دیا!۔۔۔۔۔ اب یہ دوبارہ آپ کو تنگ نہیں کرے گا اور نہ ہی یہاں آنے کی
فراہم کرے گا۔“

”مگر سدھوراں!۔۔۔۔۔ یہ مردود میرے لئے مشکل کھڑی کر سکتا ہے۔“ پرویز نے جواباً
مگر بھرے لہجے میں کہا۔

پرویز نے ایک لمحے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر تائیدی لہجے میں بولا۔ ”خیر
پھر چلو یہ قضیہ آج ہی مناد دیتے ہیں لیکن اگر جہاں داد پھر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو میں
پھر اپنے آدمیوں کے ذریعے اس سے نمٹوں گا تاکہ اسے بھی پتہ چلے کہ اس نے کس سے کر
لی ہے۔“ پرویز نے غصے سے اپنی منھیاں بھینچ لیں۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔۔۔۔۔ سدھوراں کا دل دھک سے رہ گیا۔
پرویز اس کی پریشانی بھانپتے ہوئے بولا۔ ”ڈر نہیں اس کمینے جہاں داد کی اتنی جرات
نہیں کہ وہ اب دوبارہ ادھر آنے کی کوشش کرے!۔۔۔۔۔ میں جا کر دیکھتا ہوں۔“
”نہیں سائیں!۔۔۔۔۔ اس طرح دروازہ مت کھولنا نجمانے باہر!۔۔۔۔۔“

”کچھ نہیں ہوتا، تو آرام سے بیٹھ۔۔۔۔۔“ پرویز نے اسے تسلی دی پھر قریب دھری میز
کی دراز سے سیاہ رنگ کا چمکتے ہوئی ٹی پستول نکال لیا اور کمرے سے باہر نکل گیا، سدھوراں
بھی قدرے ہراساں انداز میں چلتی ہوئی کمرے کے عقب میں ہوئی، اس کا دل انجانے
اندیشوں کی آماجگاہ بناتیزی سے دھڑک رہا تھا۔

”کون ہے!۔۔۔۔۔“ پرویز نے دروازے کے قریب پہنچتے ہوئے با آواز بلند پوچھا۔
”میں ہوں دلدار حسین!۔۔۔۔۔“ باہر سے ایک شناسا آواز ابھری تو پرویز نے مسکراتے
ہوئے اپنا سر جھٹک کر پستول اپنی قمیض کے اندر اڑس لیا۔ سدھوراں نے بھی دلدار کی آواز
سن لی تھی اور اس نے ہراساں نہ بنایا تھا، وہ اس کمینے شخص سے شدید نفرت کرنے لگی تھی جو
اپنے دوست کی بیوی کو بری راہ پر لگانے کی پٹیاں پڑھاتا رہتا تھا۔

”سدھوراں!۔۔۔۔۔! تو اندر جا!۔۔۔۔۔“ پرویز نے پیچھے مڑ کر سدھوراں سے کہا تو
سدھوراں منہ بسور کر اندر کمرے میں آگئی تاہم اسے اپنے شوہر کی یہ بات پسند آئی تھی۔ یہ
پہلا موقع تھا جب پرویز نے اسے پردہ کروایا تھا ورنہ اس سے پہلے پرویز اسے بن سنور کر
دلدار حسین کے سامنے نخر سے پیش کیا کرتا تھا۔ سدھوراں محسوس کرنے لگی تھی کہ پرویز کے
اندرشاید اب انقلابی تبدیلی آنے لگی۔ وہ اندر آکر بیڈ پر بیٹھ گئی، وہ دلدار حسین کے آنے کا
مقصد اچھی طرح جانتی تھی، وہ شاید اپنے مکروہ مقصد کی تکمیل کے لیے ہی یہاں آیا تھا۔
در اصل دلدار حسین نے پرویز کو چند روز قبل اس مکروہ فعل پر راضی کر لیا تھا کہ پرویز اپنی بیوی
سدھوراں کو انپکڑیا اور حیات کے حوالے کر دے تو پھر وہ کبھی بھی ان کے دو نمبر کے دھندوں
کے آگے روڑے نہیں اٹکائے گا۔

اب سدھوراں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کا شوہر اسے کیا جواب دیتا ہے پھر یہ سوچ کر

دیکھا تو جیسے دوبارہ جی اٹھے۔ سرجن وصی شاہ پہلے ہی علاقے کے ایس پی اور ٹی پی او کو اپنی بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوا چکے تھے، بیگم وصی شاہ کا خیال تھا کہ معاملہ بادینا چاہئے مگر دونوں باپ، بیٹی ان مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا تہیہ کر چکے تھے لہذا سرجن وصی شاہ نے فوراً پولیس آفیسرز سے رابطہ کیا اور نئی صورت حال سے انہیں آگاہ کیا۔

چونکہ انہوں نے پہلے ہی اپنی بیٹی فوزیہ کے اغوا سے متعلق واردات کو راز میں رکھنے کی درخواست کی تھی، اس لیے ٹی پی او اور ایس پی ضابطے کی کارروائی کے لیے سادہ لباس میں ان کی کوٹھی پہنچے۔ دیکھتے ہی ان تینوں کے درمیان گہرے دوستانہ مراسم تھے لہذا جب فوزیہ سے ملازموں کے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی تو فوزیہ نے بلا کم و کاست اغوا کنندگان کے بارے میں انہیں تفصیلاً بتا دیا۔ فوزیہ نے دونوں پولیس آفیسرز کو یہ بھی بتایا کہ جہاں داد تھر کے ایک با اثر زمیندار وڈیرے میر منصب خان کا اکلوتا بیٹا ہے جن کی رہائشگاہ کراچی میں بھی ہے۔ میر منصب خان کا نام انسپٹر مشتاق احمد کے لیے شناسا تھا نہ صرف یہ بلکہ وہ میر منصب خان کی ڈیفنس والی رہائشگاہ سے بھی بخوبی واقف تھا لہذا انہوں نے فوری طور پر میر منصب خان سے ملاقات کا ارادہ کیا۔

”محض ملاقات کرنے سے کچھ نہیں ہو گا ٹی پی او صاحب.....!“ سرجن وصی شاہ نے غصے سے تمللا کر کہا۔ ”آپ کو انہیں حکم دینا ہو گا کہ وہ اپنے لاڈلے بیٹے جہاں داد کو فوراً گرفتاری کے لیے پیش کرے، اس نے کسی معمولی باری کی بیٹی کو اغوا نہیں کیا ہے، اسے کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہئے۔“

”ایسا ہی ہو گا یار.....! تمہیں کیوں فکر کرتے ہو۔“ انسپٹر مشتاق احمد نے دوستانہ لہجے میں کہا پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”میں میر منصب خان کو جانتا ہوں، وہ ایک شریف اور عام روایتی وڈیروں سے ہٹ کر ایک اچھا انسان ہے، تم دیکھنا وہ خود ہی اپنے بیٹے کو ہمارے حوالے کر دے گا لیکن.....!“ انسپٹر مشتاق احمد نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

سرجن وصی شاہ یکدم بولے۔ ”لیکن کیا یار.....؟“

ان کے قدرے حیرت آمیز استفسار پر انسپٹر مشتاق صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے بولے۔ ”میرا خیال ہے جہاں تک آپ کی صاحبزادی کے اغوا کا معاملہ ہے، وہ دیرینہ دشمنی کا موجب نہیں ہے، اگر ہم جہاں داد کو گرفتار کرنے کی بجائے اگر آئندہ ایسی حرکت نہ کرنے کے بارے میں وارن کر دیں تو زیادہ بہتر رہے گا بصورت دیگر آپ بھی کوئی چھوٹی شخصیت نہیں ہیں، خواہ مخواہ معاملہ اچھالا جائے گا اور پھر کیا خبر دشمنی کا یہ سلسلہ

”سائیں.....! آپ ایسا کیوں نہیں کرتے، یہ خراب دھند ہی چھوڑ دیں اور مرز رزق حلال کمائیں، اللہ سائیں نے تم کو ہوٹل کی نیک کمائی کا ذریعہ دے تو رکھا ہے، یہی بات ہے۔“

بیوی کی بات سن کر پرویز نے چند ثانے گہری اور پُر سوچ خاموشی کے بعد کہا۔ ”بھیک ہے تیری بات سدھوراں.....! لیکن میں جن لوگوں کے ساتھ اس دھندے میں ملوث ہوں، وہ بہت خطرناک ہیں، اگر میں ان کا ساتھ چھوڑنا چاہوں تو وہ..... وہ لوگ مجھے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“

”مگر سائیں.....! اللہ سائیں سب سے بڑا ہے، آپ صدق دل سے تائب ہو جائیں تو وہ آپ کی ضرورت مدد کرے گا، اس پر بھروسہ رکھیں اور اسی سے مدد مانگیں۔“ سدھوراں نے اسے تشفی دی۔

وہ فہمی انداز میں اپنا سر ہلانے لگا پھر یکدم اپنا سر جھٹک کر بولا۔ ”اچھا ٹھیک ہے، اس مسئلے کو بھی دیکھ لیں گے، چلو دیر ہو رہی ہے، جہاں داد کے باپ سے ملنے نہیں چلنا.....؟“ سدھوراں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

☆=====☆

ڈاکٹر فوزیہ کو جیسے ٹیکسی کی صورت میں اڑا کر کھولا ہاتھ آگیا تھا جسے وہ اب فل اسپتال سے دوڑائے چلی جا رہی تھی، وہ بدطینت ٹیکسی ڈرائیور کو بڑی خوبصورتی سے دھوکا دے کر صاف بچ آئی تھی، اب وہ ٹیکسی کو پوری رفتار کے ساتھ بھاگ رہی تھی، سڑک سنسان تھی پھر جب ڈرائیور بعد وہ کورنگی کرکے کے چوراہے پر آئی تو سڑک کے کنارے ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے چند لوگوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکنا چاہا مگر فوزیہ ان پر توجہ دینے بغیر زانے سے نکل گئی، آس پاس لوگوں نے ایک جوان لڑکی کو ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں دیکھ کر دانتوں تلے انگلیاں داب لی تھیں مگر فوزیہ کو ان لوگوں کی حیرتوں کی پروا کب تھی، وہ جلد سے جلد اپنے گھر پہنچ جانا چاہتی تھی، وہ قیوم آباد چورنگی سے گزرنے لگی تو اسے سدھوراں کا خیال آیا، اس کا گھر بھی تو ادھر ہی تھا، اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ یقیناً سدھوراں سے ملنے ہوئی جاتی لیکن اس وقت تو فوزیہ کو خود اپنی بڑی ہوئی تھی، اس لیے وہ سیدھی ڈیفنس روڈ کے راستے آگے نکلی چلی گئی، بالآخر فوزیہ بخیر و عافیت اپنے جنگلے پر پہنچ گئی۔

اس کے ماما، پاپا کی حالت غیر ہو رہی تھی، انہوں نے جو اپنی لاڈلی بیٹی کو زندہ سلامت

دارز ہوتا چلا جائے۔“

کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا تھا میں نے تمہیں، بہر حال اب تم ذرا محتاط رہنا۔“
فوزیہ اس کی بات سن کر زیر لب مسکرا دی۔

☆=====☆=====☆

”یہاں کس سے ملنے آئی تھی تو بتا۔۔۔۔۔ میں ابھی اس کے کلبھاڑی سے ٹوٹے کر کے رکھ دوں گا۔“ خالقو چند ٹائے گھبرائی کھڑی اپنی بہن ملوکاں کو شعلہ بار نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

”میں۔۔۔۔۔ ماما۔۔۔۔۔ اللہ رکھو سے ملنے آئی تھی۔“ ملوکاں نے بدحواس ہو کر کہا۔
”یہ کون سا تیرا ماما ہے کہ جس سے میں واقف نہیں۔“ خالقو اسے آگ برساتی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا اور پھر آگے بڑھ کر ایک زنانے داتھڑاس کے گال پر رسید کر دیا۔ ”بکواس کرتی ہے کمینی۔۔۔۔۔ سچ سچ بتا، اپڑیں کون سے یار سے مل کر آرہی تھی، بتا ورنہ۔۔۔۔۔ ادھر ہی ”کاری“ کر کے تیرے کلبھاڑیوں سے ٹکڑے کر دوں گا، بول۔۔۔۔۔؟“
یہ موقع ایسا تھا کہ ملوکاں کی فطری سرکشی گھبراہٹ اور خوف تلے دب کر رہ گئی تھی مگر پھر بھی اس نے ذرا ہمت کر کے بھائی سے کہا۔ ”ادا سائیں۔۔۔۔۔! اگر تجھے میری بات کا یقین نہیں آتا تو ابھی چل میرے ساتھ۔۔۔۔۔ میں تجھے ماما اللہ رکھو سے ملاتی ہوں، وہی تجھے بتا دے گا کہ میں کس سے ملنے یہاں آئی تھی اور ماما اللہ رکھو کو تو بھی جانتا ہے ادا۔۔۔۔۔! یہ وہی شخص ہے جو مجھے اور میراں کو تمہارے پاس لے آیا تھا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔! میں اچھی طرح جانتا ہوں اسے، چل پھر میرے ساتھ۔۔۔۔۔“
خالقو نے غصیلے لہجے میں دانت پیش کر کہا اور پھر یہ لوگ جیسے ہی واپس ماما اللہ رکھو کے گھر کی طرف پلٹے تو اچانک ملوکاں کی نگاہ سامنے پڑی، وہ ٹھٹک کر رہ گئی، سامنے سے ماما اللہ رکھو آتا ہوا دکھائی دیا، اسے دیکھتے ہی ملوکاں ایک ہذیانی چیخ مار کر اس کی طرف دوڑی اور اس سے لپٹ کر رو پڑی۔

”ماما۔۔۔۔۔! مجھے بچا لو، میرا ادا خالقو مجھے ”کاری“ کر کے جان سے مارنا چاہتا ہے، اس کے ساتھ وہ مردود و آچر خان بھی ہے۔“ ملوکاں نے خوف سے لرزیدہ لہجے میں اس سے کہا۔
ماما اللہ رکھو فوراً اس کے سر پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے ازراہ تشفی ہو لے سے بولا۔
”حوصلہ کر دھینے۔۔۔۔۔! تیرے ادا کی آنکھوں میں اس وقت لالچ کی پٹی بندھی ہے، وہ تیرے کو مارنے کی غلطی کبھی نہیں کرے گا تو اس کے لیے سونے کی چڑیا ہے۔“ ماما اللہ رکھو کی بات

انسپکٹر مشتاق احمد کی مفاہمانہ صراحت پر سرجن وصی شاہ ایک لمحے کو کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے تاہم ان کے ساتھ بیٹھی فوزیہ نے اس کی بات کی غایت کو سمجھتے ہوئے فوراً کہا۔
”آپ کی بات بہت حد تک درست ہے انکل! واقعی ہمارے اور میر منصب خان کے بیچ کئی قسم کی کوئی دشمنی نہیں بس ایک چھوٹے سے معاملے پر جہاں داد کے دماغ میں ٹیڑھی آگئی ہے اور میں آپ کی اس بات سے بھی متفق ہوں کہ جہاں داد واقعی اپنے باپ دذیرے میر منصب خان سے بہت ڈرتا ہے، میرا خیال ہے یہی بہتر رہے گا۔“
”اور اگر دوبارہ اس نان سنس جہاں داد نے یہ اوجھی حرکت کر ڈالی تو۔۔۔۔۔؟“
سرجن وصی شاہ بولے۔

”تو پھر میرا وعدہ ہے کہ جہاں داد کو کڑی سے کڑی سزا دلوا کر رہوں گا۔“ انسپکٹر مشتاق احمد نے حتمی لہجے میں کہا۔ ”لیکن میرا نہیں خیال کہ وہ اب دوبارہ ایسی کوئی حرکت کرنے کی جرأت کرے گا، ایک بار انہیں مد مقابل کی طاقت کا اندازہ ہو جائے تو پھر خود ہی خاموشی سے پیچھے ہٹ جائیں گے۔“
”نھیک ہے پھر میرا خیال ہے یہی بہتر رہے گا۔“ بیگم وصی شاہ نے پہلی بار لب کشائی کی۔

یہ طے کرنے کے بعد دونوں پولیس افسران وہاں سے رخصت ہو گئے، ڈاکٹر فوزیہ نے اسی وقت ڈاکٹر جواد احمد کو فون کیا، پہلے تو اسے فوزیہ کی آواز سن کر یقین ہی نہیں آیا پھر اس نے جلدی سے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ وہ اسی وقت اس کے ہاں پہنچ رہا ہے۔ اس کی غفلت آمیز بے چینی پر فوزیہ زیر لب مسکرا دی۔ تقریباً پون گھنٹے بعد وہ فوزیہ کی رہائش گاہ پر تھا۔
”ہرگز نہیں اس کمینے جہاں دادا کو اس اوجھی اور مجرمانہ حرکت کی ضرور سزا ملنی چاہیے۔“ وہ ڈاکٹر فوزیہ سے ملنے اور اس سے ساری تفصیل سننے کے بعد بھنا کر بولا۔

”مگر جواد۔۔۔۔۔! انکل مشتاق احمد نے یہ نہیں کہا کہ وہ اسے یوں ہی چھوڑ دیں گے۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے بتایا اور اضافہ کیا۔ ”وہ اس کی ٹھیک ٹھاک نکلور کریں گے، میرا خیال نہیں کہ اس کے بعد وہ دوبارہ میرے سامنے آنے کی جرأت کرے اور پھر یہ بھی تو سوچو ناں کہ یہ ہماری عزت کا بھی معاملہ ہے۔“

اس کی بات سن کر ڈاکٹر جواد خاموش سا ہو گیا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔
”تھینکس گاڈ۔۔۔۔۔! شکر ہے کہ تم خیریت سے گھر آ پھینچیں۔۔۔۔۔ میں تو بہت پریشان ہو گیا تھا،

سن کر ملوکاں کو احساس ہوا کہ یہ بات درست ہے، خالقو اسے ہلاک کر کے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں مارے گا، وہ محض اسے ڈرانا چاہتا ہے۔ یہ سوچ کر ملوکاں کو ذرا حوصلہ ہوا، اس اثناء میں وہ دونوں ان کی طرف گھورتے ہوئے قریب آن پہنچے تھے۔

”اللہ رکھیو!..... میری بہن تجھ سے کیوں ملنے آئی تھی؟“ قریب پہنچتے ہی خالقو نے درشت نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

ماما اللہ رکھیو نے آہستگی کے ساتھ ملوکاں کو خود سے الگ کیا اور پھر خالقو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چند قدم اس کی طرف بڑھتے ہوئے انتہائی پرسکون لہجے میں اس سے بولا۔ ”یہ میری دھیوں (بٹیوں) جیسی ہے، کیا ایک دھی اپڑیں بابا سے نہیں ملنے آسکتی، چریا!.....“ ماما اللہ رکھیو نے ڈانٹا، وہ ایک جہانگیرہ شخص تھا، اسے بہر حال یہ معلوم تھا کہ ملوکاں درحقیقت کس سے ملنے آئی تھی اسی لئے اس نے اپنے لہجے سے کسی قسم کی پریشانی یا گھبراہٹ ظاہر ہونے نہیں دی اور پورے سکون کے ساتھ پُر اعتماد لہجے میں اس نے خالقو کو مطمئن کرنا چاہا تھا، یہی سبب تھا کہ خالقو اب کچھ تذبذب کا شکار نظر آنے لگا تھا لیکن اس کے ساتھ کھڑا آچر خان بغور ماما اللہ رکھیو کو گھورے جارہا تھا۔

خالقو کو خاموش پا کر اس نے چپتے ہوئے لہجے میں پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے ماما اللہ رکھیو سے پوچھا۔ ”تو اپڑیں گھر میں اکیلا رہتا ہے یا تیرے ساتھ دوسرا بھی کوئی ہے، میرا مطلب ہے تیرا کوئی بیٹا یا بھتیجا؟.....“

اس کے اس مکارانہ سوال پر ملوکاں ایک بار پھر پریشان سی نظر آنے لگی اور اس نے کن آنکھوں سے ماما اللہ رکھیو کی طرف دیکھا کہ اب وہ کیا جواب دیتا ہے۔ ماما اللہ رکھیو بھی ایک کائیاں شخص تھا، وہ اس سوال پر ذرا بھی نہ بوکھلایا اور بڑے اطمینان کے ساتھ ہولے سے مکار آچر خان کے چہرے کی طرف نکتے ہوئے بولا۔ ”تو اس چھوکری ملوکاں کا کیا لگتا ہے.....؟“ اس کے پوچھنے پر آچر خان ایک لمحے کو گڑبڑا سا گیا مگر پھر ڈھٹائی سے بولا۔ ”پہلے میرے سوال کا جواب دے۔“

”کیوں میں پہلے تیرے سوال کا جواب دوں.....؟“ ماما اللہ رکھیو اس بار تند لہجے میں بولا۔ ”تیرا کیا حق ہے جو تو مجھ سے میرے گھر والوں کے بارے میں پوچھ رہا ہے، کیوں میں تجھے بتاؤں کہ میرے گھر میں کون کون رہتا ہے.....؟“

”اچھا..... اچھا!..... ختم کرو اس بحث کو.....“ خالقو جھلا کر بولا۔ پھر وہ ملوکاں کو گھور کر بولا۔ ”چل رڑی آ..... میرے ساتھ گھر چل.....“

اس کی بات سن کر پھر ملوکاں نے ماما اللہ رکھیو کی طرف مدد طلب نگاہوں سے دیکھا تو ماما نے خالقو سے کہا۔ ”چلو میں بھی ساتھ چلتا ہوں، بہت دن ہوئے بھاسکھیو سے ملے ہوئے۔“

ماما اللہ رکھیو کو ملوکاں کے حالات کا پتہ تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ملوکاں اب اپنے چاچا سکھیو کے ہاں رہنے لگی تھی، اسی لیے ماما اللہ رکھیو نے ملوکاں کو اس کے بھائی کے دوائے کرنے کی بجائے چالاکی سے خود بھی ساتھ چلنے کا خیال ظاہر کیا۔

ملوکاں نے دیکھا کہ خالقو کے چہرے پر ایک لمحے کو تذبذب کے آثار پیدا ہوئے مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ جیسے اپنی کینچلی بدلتے ہوئے یکدم بولا۔ ”ماما سائیں!..... تو کیوں بڑا بد تکلیف کرتا ہے، میں ہوں ناں.....“

”اڑے بابا چھوڑا!.....! تکلیف کیسی، بھاسکھیو سے ملے بہت دن ہو گئے ہیں۔ آج اسی بہانے اس سے بھی مل لوں گا۔“ ماما اللہ رکھیو کی بات پر خالقو اور آچر خان دونوں لاجواب سے ہو گئے..... ماما، ملوکاں کو لے کر آگے چل دیا، خالقو اور آچر خان راستے میں سے کھٹک گئے تھے۔

ماما اللہ رکھیو نے دائیں بائیں نظر ڈالی اور ملوکاں کو بنجیدگی کے ساتھ سمجھایا کہ اب وہ ادھر کا رخ نہ کرے، یہ نہ صرف اس کے لیے بلکہ سانول کے لیے بھی بہتر ہوگا باقی رہی بات سکھیو چاچا سے ملنے کی، اس سے وہ پھر کسی دن آکر مل لے گا مگر اس سے پہلے وہ اپنے بھانجے سانول کا عندیہ لینا چاہتا تھا لہذا ماما اللہ رکھیو نے ملوکاں کو نہر کے کنارے چھوڑ دیا جہاں میراں پانی کے گھڑے لئے اس کی منتظر تھی پھر ماما واپس لو گیا۔

وہ جیسے ہی اپنے گھر پہنچا تو سانول بھی آگیا پھر رات کا کھانا دونوں نے حسب معمول اٹکھ کھایا، اس کے بعد ماما اللہ رکھیو نے سانول کو ساری بات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ”سانول!..... ملوکاں ایک معصوم اور اچھی لڑکی ہے پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ تجھے باہتی بھی ہے، میں چاہتا ہوں تیرا گھر بھی بس جائے اور اس بے چاری کی بھی مصیبت سر سے مل جائے، آج کل وہ اپنے چاچا سکھیو کی سرپرستی میں اسی کے پاس رہ رہی ہے..... تو سنو تو میں اس سے ملوکاں کے سنگ کے بارے میں بات کروں.....؟“

ماما اللہ رکھیو کی بات سن کر سانول خاموش رہا، اس کی پُرسوچ اور خاموش نظروں کے نائنے اچانک سدھوراں کا چہرہ رقصاں ہو گیا پھر اس کے چہرے پر نخی سی پھیل گئی۔

”دیکھ رے چھوڑا!..... میں تیرے دل کے حال سے اچھی طرح واقف ہوں۔“ ماما اللہ رکھیو نے جیسے اس کے چہرے کے تاثرات بھانپتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتا ہوں تو ایک

لڑکی کی وجہ سے اپڑاں دل میلا کئے ہوئے ہے، پر تُو یہ بھی تو سوچ کہ ساری لڑکیاں ایسی جیسی نہیں ہوتیں، او چر یا.....! ملو کاں تجھے بہت چاہتی ہے، مجھے یقین ہے تُو اس کی مجرت میں اپنا دکھ بھی بھول جائے گا۔“

”ماما.....! محبت تو سدھوراں بھی مجھ سے کرتی تھی۔ پر پھر اس نے کیوں مجھے جبر دیا..... اور دوسرے کے ہاتھوں کھلونا بن گئی۔“ اس بار سانول نے ناگوار سے لہجے میں کہا۔
”اڑے بابا.....! تُو نے تو ایک ہی بات اپڑیں دل میں لے لی ہے..... ہو گی ہر بے چاری کی کوئی مجبوری.....!“

”لیکن ماما.....! اسے مجھ پر تو بھروسہ کرنا چاہئے تھا۔“
”ایک لڑکی ذات کی بہت سی مجبوریاں ہوتی ہیں..... یہ ٹھیک ہے اس کی غلطی تھی کہ وہ ایک جبر اور ظالم شخص کے ہاتھوں کھلونا بن گئی پر آخر کو تُو نے تو اپڑاں گھر ایک دن بسا ہے ناں.....؟“ ماما نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ پھر بڑے رسان سے بولا۔ ”دیکھ اڑے سانول.....! میں بھی تیرے باپ کی جگہ ہوں..... کیا تُو میری خوشی کی خاطر اتنا بھی نہیں کر سکتا.....؟“

ماما کی بات سن کر سانول نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی..... یہ حقیقت تھی کہ سانول کو اپنے ماما سے بہت محبت تھی، وہ اس کے روپ میں اپنے مرحوم ماں، باپ کا چہرہ ہی دیکھتا تھا لہذا اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے ماما.....! تیری اگر اسی میں خوشی ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

ماما اللہ رکھو اپنے بھانجے کی سعادت مندی پر ایک دم خوش ہو گیا اور بے اختیار اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔

اگلے دن وہ سیدھا سکھو کے گھر پہنچا، روٹی اس نے وہیں کھائی پھر اس نے اپنے آنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھ بھاسکھو.....! میرا ایک ہی بھانجا ہے سانول..... بڑا نیک اور شریف..... تیری ملو کاں اس کے پاس سدھاسکھی رہے گی.....“ زمیندار حاجی مولابخش کی زمینوں پر کام کرتا ہے تُو بھی اگر اپڑیں تسلی کرنا چاہتا ہے تو اس سے کبھی جا کر مل لینا۔“

اس کی بات سن کر سکھو ایک دم خوش ہو کر دوستانہ بے تکلفی سے بولا۔ ”اڑے بابا..... مجھے چھو کرے سے ملنے کی کیا ضرورت ہے..... ہمارے لئے تو یہی کافی ہے کہ وہ بھانجا ہے تیرا..... پر تُو کہتا ہے تو میں کسی وقت مل لوں گا۔“

”تو کیا میں ”ہاں“ سمجھوں بھاسکھو.....؟“ ماما اللہ رکھو نے امید بھرے لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

سکھو چند ثانیے توقف کر کے اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے بابا..... مجھے منظور ہے..... پر دیکھ میں بہت گریب انسان ہوں..... میری اپڑیں دھی بھی جوان ہے اور شادی کی عمر پر ہے، تیاری میں کچھ وقت تو لگے گا ہی.....!“

”مجھے بھی کوئی جلدی نہیں بھاسکھو.....!“ ماما اللہ رکھو خوش ہوتے ہوئے جلدی سے بولا۔ ”دیکھ مجھے کچھ نہیں چاہئے، بس دو کپڑوں میں اللہ سانیں کا نام لے کر اپڑیں دھی ملو کاں کو بیاہ دے، یہی ہمارے لئے بہت ہے اور رہی بات تیری اپڑیں دھی میراں کی تو کیوں فکر کرتا ہے، میراں تو میری بھی دھیوں (بٹیوں) جیسی ہے، اس کا ہم دونوں مل کر کوئی اچھا سنگ ڈھونڈ لیں گے۔“

”اچھا بھابی اللہ رکھو.....! پھر میری طرف سے ہاں ہی سمجھو اور عیوضہ (لڑکی کا رشتہ دینے کی رقم) بھی میں تم سے نہیں لوں گا۔“ سکھو نے کہا۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کے گلے ملے جگے اور بعد میں تاریخ طے کرنے لگے۔

☆=====☆=====☆

”فریدو..... فریدو.....! ات..... تُو..... یہاں کیسے..... بھابی اللہ وسائی کہاں ہے بتا مجھے جلدی.....؟“ سارنگ نے فریدو کو خود سے علیحدہ کرتے ہوئے پوچھا۔ فریدو کا فانی کمزور لگ رہا تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بے چارے ننھی سی جان سے بڑی مشقت لی جاتی رہی ہو۔ فریدو رونے لگا، سارنگ کا دل گھبرا گیا، اس نے دوبارہ پریشان کن تفکر سے پوچھا۔ ”فریدو.....! رومت..... اب میں آ گیا ہوں ناں..... مجھے بتا بھابی اللہ وسائی کہاں ہے..... کدھر ہے وہ.....؟“

فریدو ہچکیاں لیتے ہوئے بولا۔ ”وہ..... وہ..... ایک ہندو سا ہو کار کے ہاں ہے، وہ گارتیا تھا ناں اس نے ہمیں یہاں لا کر بیچ دیا تھا۔“

سارنگ اس کی بات سن کر دہل گیا اور غصے سے دانت پیسنے لگا پھر پوچھا۔ ”کیا وہ تیرے ساتھ ہی رہتی ہے.....؟“

”نہیں.....! وہ ایک دوسرے ہندو کے ہاں نوکرانی بن کر رہ رہی ہے سر..... فریدو اتنا بتا کر ذرا تھا تو سارنگ نے بے چینی سے کہا۔“

”مگر کیا؟“

”وہ جس ہندو کے ہاں نوکرائی ہے، وہ بھی سی بستی میں رہتا ہے اور وہ بھی ادھر پانی بھرنے آتی ہے مگر.....!“ اس نے پھر اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو سارنگ نے دوبارہ پریشان ہو کر پوچھا۔

”مگر کیا.....؟ تو آگے کیوں نہیں بتاتا۔“

”وہ ہندو سا کارآ..... آج رات اسے دوبارہ گاتریا کو فروخت کرنے والا ہے۔“ سارنگ اس کی بات سن کر پریشان سا ہو گیا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”کیا آج بھابی پانی بھرنے نہیں آئی یہاں.....؟“

”نہیں.....! شاید اب وہ ادھر نہیں آئے گی۔“ فریدو نے بتایا۔ پھر وہ سارنگ سے دوبارہ لپٹ کر روتے ہوئے بولا۔ ”ادا.....! مجھے یہاں سے لے چلو، وہ ہندو سا ہو کار بہت ظالم ہے، وہ مجھے بہت مارتا ہے ہنٹروں سے..... یہ دیکھ.....!“ یہ کہہ کر اس نے اپنی قمیض اوپر اٹھائی تو سارنگ نے دیکھا کہ اس کی پیٹھ پر سرخ لکیریں بنی ہوئی ہیں، اس معصوم کی زخمی پیٹھ دیکھ کر سارنگ کا دل کٹ گیا، وہ اسے تسلی دیتے ہوئے پیار سے بولا۔

”فریدو.....! تو بڑا بہادر بچہ ہے ناں.....! اب تو بالکل پریشان نہ ہو، میں آگیا ہوں..... چل مجھے پہلے اس کینہ ہندو کا گھر دکھا جس نے بھابی اللہ وسائی کو نوکرائی بنا کر رکھا ہے۔“

اس کی بات سن کر فریدو کی معصوم آنکھوں میں یکدم خوف سا سمٹ آیا..... وہ بولا۔ ”مگر مجھے اگر ذرا بھی دیر ہوگئی تو وہ ظالم سا ہو کار مجھے بہت مارے گا۔“

”اس کینہ سا ہو کار کا کیا نام ہے جس نے تجھے غلام بنا کر رکھا ہے.....؟“ سارنگ نے پوچھا۔

”دیال داس نام ہے اس کا.....!“

”اور بھابی اللہ وسائی کس سا ہو کار کے ہاں ہے؟“

”اس کا نام رام دیال ہے.....“ فریدو نے بتایا۔

سارنگ ذرا دیر کچھ سوچنے کے بعد بولا۔ ”فریدو.....! میری بات اب غور سے سن، تو ایسا کر پہلے مجھے اپنے ساتھ لے چل اور دیال داس کا گھر دکھا، اس کے بعد مجھے رام دیال کے گھر کا پتہ سمجھانا، میں پہلے بھابی اللہ وسائی کو لے کر تیرے پاس آؤں گا تو گھر کے باہر مجھے تیار کھڑا ملنا..... پھر ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔“

”مگر ادا سارنگ.....! دیال داس بڑا ظالم انسان ہے، وہ تو مجھے شام کو زنجیروں سے

بند کر کے میں قید کر دیتا ہے، میں کیسے باہر نکلوں گا.....؟“ اس کے معصوم لہجے سے خوف

بڑھ گیا تھا۔ سارنگ چند ٹائپ خاموشی سے اپنے دانت پیتار با پھر اس کے بعد اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولا۔ ”تو اس کی فکر نہ کر..... میں تجھے کسی طرح سے نکال لاؤں گا..... پر پہلے مجھے اپنے ساتھ لے چل.....“

اس کی بات سن کر فریدو زور زور سے اپنا سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں.....! اب میں وہاں نہیں جاؤں گا، وہ بڑا ظالم ہے، پر میں تجھے ایک بات بتاتا ہوں۔“

”ہاں.....! بول کیا بات ہے؟“

”میں اور بھابی اللہ وسائی یہاں روزانہ پانی بھرنے آتے ہیں، کل بھابی نے مجھے یہ بات بتائی تھی کہ اسے آدھی قیمت میں دوبارہ گاتریا کے ہاتھ فروخت کیا جانے والا ہے اور بھابی نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ آج کسی طرح اس ہندو سیٹھ رام دیال کے ہاں سے بھاگ کر برے پاس یہاں آئے گی پھر ہم دونوں بھاگ چلیں گے لیکن ادا.....! میں جانتا ہوں ایسا کتنا مشکل ہے کیونکہ ہم دونوں ایک بار پہلے بھی یہاں سے بھاگنے کی کوشش کر چکے ہیں لیکن اس کے بد معاشوں نے ہمیں فرا پکڑ لیا تھا اور ہمیں بہت مارا تھا، ان کے پاس ہڈیاں اور سانڈنیاں ہیں۔“ فریدو نے اسے نصیل بتائی۔

سارنگ ذرا دیر پریشان کن خاموشی میں مستغرق رہا پھر اس کے بعد بولا۔ ”اچھا شک ہے..... پہلے ہم یہاں انتظار کر لیتے ہیں، کیا خبر بھابی اللہ وسائی یہاں آجائے۔“

”نہیں ادا.....! میں اچھی طرح جانتا ہوں وہ ادھر اب نہیں آ سکتی..... اسے رام دیال نے قید کر رکھا ہے کیونکہ آج رات وعدے کے مطابق گاتریا اسے اپنے ساتھ لے بنے آئے گا۔“

”چل پھر میرے ساتھ..... میں خود ہی رام دیال کا گھر تلاش کر لوں گا..... آ.....!“

”مگ نے اتنا کہا اور اس کا ہاتھ پکڑا مگر اس سے پہلے وہ جیوش بابا کا مٹکا بھرا نہیں بھولا تھا.....“

”مگ نے پانی سے بھرا گھڑاسر پر رکھا اور فریدو کو لے کر جیوش بابا کی جھونپڑی کی طرف چل دیا۔ جھونپڑی کے قریب پہنچ کر سارنگ نے پہلے فریدو کو ایک کھجور کے درخت کے جھنڈ

”خزاں کیا اور پھر خود مٹکا اٹھائے جھونپڑی کے اندر داخل ہو گیا تو سامنے کا منظر دیکھ کر دنگ

”وہ بڑا شیطانی جیوش بابا اس مجبور لڑکی رکنی کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف تھا۔“

جیوش بابا، سارنگ کی اس بے وقت کے دخل در معقولات پر یکدم برا فروختہ ہو کر باہر نکل آیا۔
 آواز میں بولا۔ ”دفع ہو جا یہاں سے..... جا.....!“
 وہ لڑکی بھی بے چاری یکدم سمٹ کر ایک طرف ہو گئی، اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو رہا تھا۔
 ”تُو نے سنا نہیں.....! دفع ہو جا یہاں سے.....“ جیوش بابا نے چلا کر دوبارہ کہا۔
 سارنگ نے خاموشی سے پانی کا بھرا مٹکا ایک کونے میں رکھا، ایک نظر سڑکی کی کئی پر ڈالی اور جھوپڑی سے باہر آ گیا۔

جھوپڑی سے باہر آ کر سارنگ ایک طرف خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔
 اسے اس بوڑھے ہوس پرست پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا جو ایک معصوم لڑکی کی مجبور سے کھیلنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کے ساتھ ہی سارنگ کو اس لڑکی رکنی پر بھی غصہ آنے لگا۔
 اپنی کم عقلی کی بنا پر اس بوڑھے کے ہاتھوں کھلونا بننے پر تیار تھی تاہم سارنگ کو اتنا یقین تھا کہ جب تک وہ خود یہاں موجود ہے، وہ بوڑھا، رکنی کی عزت تار تار کرنے کی جرأت نہ کرے گا..... سارنگ کو ابھی وہاں کھڑے ذرا ہی دیر گزری تھی کہ اس نے دیکھا جیوش جھوپڑی سے باہر نکلا اور اس کی طرف زہر خند نظروں سے گھورتا ہوا قریب آیا۔
 ”تُو اگر میرا چیلہ بن کر یہاں رہنا چاہتا ہے تو یہاں کی کوئی بات تجھے باہر نہیں بتانا گئی سمجھا تُو.....؟“ جیوش بابا کمرہ لہجے میں بولا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس نے گھناؤنا انداز میں مسکراتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔ ”اور ویسے بھی اگر تُو نے کسی کو کچھ بتانے کی کوشش کی تو تیرا ہی نقصان ہوگا، کوئی تیری بات کا یقین ہی نہیں کرے گا بلکہ انا لوگ مار کر تیرا بھر کس نکال دیں گے۔“ وہ چند لمحے توقف کے بعد پھر بولا۔ ”تُو نے میرا روپ تو دیکھ ہی لیا ہے، اگر تُو اب بھی میری چالیس دنوں تک سیوا کرنے کی ضد پر قائم تیری مرضی..... ویسے تُو واپس لوٹ بھی سکتا ہے۔“

سارنگ ابھی یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا اور وہ کون سا واقعی اس بوڑھے شیطان سیوا کرنے آیا تھا، یہ تو اس کی ایک مجبوری تھی کہ وہ ابھی اس جھوپڑی میں قیام کرنا چاہتا تھا کہ جس مقصد کے لیے میلوں دور سے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر یہاں آیا ہے، وہ ہو جائے۔ سارنگ کو املی کی زبانی پہلے ہی اس بڑھے کی اصلیت کا علم تھا کہ وہ گارتھ ساتھ معصوم اور مجبور انسانوں کی اسمگلنگ جیسے گھناؤنے کاروبار میں ملوث تھا اور سارنگ بھی جانتا تھا کہ وہ دغا باز گارتھ ایک روز یہاں ضرور آئے گا جبکہ اب سارنگ کو تو فریاد اپنی بھالی اللہ دسائی کے بارے میں بھی پتہ چل چکا تھا، اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ

سارنگ نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی بات سن کر سارنگ کا دل سانسیں نہ کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ وہ اس بوڑھے شیطان کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا تھا، آج رات کسی ”مہمان“ کے آنے والی بات پر سارنگ چونکا تھا۔ ”کیا وہ مہمان ”مہمان“؟“ اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرا تھا..... بہر طور سارنگ نے جیوش بابا کو اپنی ”گارتھ“ کا پورا یقین دلایا تو جیوش بابا اسے اپنے ساتھ اندر جھوپڑی میں لے آیا۔

باوردی گیٹ مین چند لمحے کچھ سوچنے کے بعد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔
 ”ٹھیک ہے، میں اندر جا کر وڈے سائیں کو خبر کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔

وہ ذرا دیر بعد واپس آیا اور ان دونوں کو اپنے ساتھ اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ
 دونوں خاموشی سے اس کے عقب میں چلتے ہوئے اندر آ گئے۔ گیٹ مین انہیں ایک
 ڈرائنگ روم کے طرز کے کمرے میں بٹھا کر واپس لوٹ گیا۔

وہاں ایک ملازم نے پرویز سے کہا۔ ”سائیں وڈا اندر چند پولیس افسروں کے ساتھ
 باتوں میں مصروف ہے، تھوڑا انتظار کرو جیسے ہی وہ فارغ ہوئے، میں آ کر تمہیں اندر وڈے
 سائیں کے پاس لے جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

دونوں میاں، بیوی مضطربانہ انداز میں خاموشی سے بیٹھے رہے، اس اثناء میں ایک
 دوسرا ملازم کولڈ ڈرنک ان کے سامنے رکھی تپائی پر رکھ کر خاموشی سے چلا گیا، دونوں نے کولڈ
 ڈرنک پی، اس کے ذرا ہی دیر بعد باہر ایک گاڑی اشارت ہونے کی آواز ابھری۔

”شاید پولیس افسران واپس چلے گئے ہیں۔“ سدھوراں نے ہولے سے کہا۔ ابھی
 اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہی ملازم دوبارہ اندر داخل ہوا اور پھر ان دونوں کو اپنے ساتھ آنے
 کا اشارہ کیا، پرویز اور سدھوراں خاموشی سے اس کے ساتھ ہو گئے۔

وہ انہیں ایک نسبتاً بڑے کمرے میں لے آیا تھا، کمرے کا ماحول خنک تھا اور بڑے
 شانہ طرز کی اشیاء سے مزین، سامنے ایک بڑے صوفے پر ایک بارعب شخص بکٹی شلوار،
 نمیش میں ملبوس ٹانگ پر ٹانگ رکھے براجمان تھا، اس کے چہرے پر کھنی مونچھیں تھیں،
 جہرے پر رعونت کے تاثرات نمایاں تھے، اس کے عقب میں دو مسلح گارڈز مستعد کھڑے
 تھے، پرویز اور سدھوراں نے اندازہ لگایا کہ یہی شخص جہاں داد کا باپ میر منصب خان ہے،
 دونوں نے باادب ہو کر اسے سلام کیا۔

”بیٹھو بابا!.....“ وڈیرے منصب خان نے سپاٹ لہجے میں انہیں بیٹھنے کو کہا۔ دونوں
 خاموشی سے اس کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

”ہاں بابا!.....! بولو کیا بات ہے؟“

”بھوتار سائیں!.....! سمجھ میں نہیں آ رہا میں کیسے بات کروں، مجھ میں ہمت نہیں ہو
 رہی کیونکہ سائیں میری فریاد کا تعلق چھوٹے سائیں سے ہے۔“ سدھوراں نے ہچکچاتے
 ہوئے کہا۔

منصب خان قدرے چونک کر سدھوراں کا چہرہ تنکے لگا پھر کھراتے لہجے میں

پرویز اور سدھوراں ایک نئے عزم کے ساتھ میر منصب خان سے ملاقات کے لیے
 تیار ہو کر گھر سے نکلے، اس بار انہوں نے منی بس کی بجائے ٹیکسی کر لی تھی پھر ٹیکسی کے ذریعے
 دیر بعد ڈیفنس میں داخل ہو گئی تھی جو قیوم آباد سے زیادہ دور نہ تھا۔ دونوں میاں، بیوی بچہ
 کی عقبی سیٹ پر براجمان تھے، جیسے جیسے منزل کے وہ دونوں قریب پہنچ رہے تھے، ان
 اندر کی بے چینی بھی فزوں تر ہونے لگی تھی مگر ان دونوں نے ہمت اور حوصلے کے ساتھ فزوں
 ہر قسم کے حالات کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔..... پرویز، ٹیکسی ڈرائیور کو میر منصب خان
 کی کوٹھی کا ایڈریس بھی سمجھاتا جا رہا تھا۔

پھر اس کے ذرا ہی دیر بعد ٹیکسی نے انہیں مطلوبہ کوٹھی کے سامنے اتار دیا، کوٹھی
 قریب پہنچ کر دونوں میاں، بیوی بری طرح ٹھٹھکے تھے، کوٹھی کے گیٹ کے قریب ایک بڑی
 نیلے رنگ کی سنگل پجاریو جپ کھڑی تھی جس کی چھت پر نیلے رنگ کی جتی بھی نصب تھی
 ڈرائیور کے علاوہ ایک مسلح باوردی گارڈ باہر مستعد کھڑا تھا، جپ کو دیکھ کر پرویز اور
 سدھوراں نے اندازہ لگایا کہ اندر اس وقت کوئی اعلیٰ پولیس افسر موجود ہے۔

پرویز نے جلدی سے ٹیکسی ڈرائیور کو کراہ دے کر اسے رخصت کیا اور ایک الجھی
 سی نظر سدھوراں پر ڈالی، جو قدرے پُرسوج انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے سدھوراں اندر کوئی بڑا پولیس افسر خان صاحب کے ساتھ گفتگو
 مصروف ہے، تمہارا کیا خیال ہے، کیا کرنا چاہئے اب؟.....؟“
 سدھوراں نے شوہر کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے فوراً کہا۔ ”یہی تو موقع ہے
 سے ملنے کا، چلو اندر چلتے ہیں۔“

”چلو..... پھر میں تیار ہوں۔“ پرویز نے ہامی بھرتے ہوئے کہا۔ دونوں گیٹ
 طرف بڑھ گئے، گیٹ پر ایک بڑی بڑی مونچھوں والا باوردی گارڈ موجود تھا۔

”بھائی!.....! ہمیں اندر خان صاحب سے ملنا ہے۔“ پرویز نے کہا تو کرخت چہرے
 والے گیٹ مین نے سر سے پاؤں تک ان دونوں کو گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھا
 دار لہجے میں پوچھا۔

”تم دونوں کون ہو اور وڈے سائیں سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“
 پرویز نے سدھوراں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری بیوی ہے اور
 تعلق وڈے سائیں کے گوتھ سے ہے، یہ وڈے سائیں کے پاس اپنی ایک فریاد لے
 رہی ہے۔“

بولا۔ ”تمہارا مطلب جہاں داد سے ہے؟“

”ہا۔۔۔۔۔ ہاؤ سا۔۔۔۔۔ سائیں۔۔۔۔۔“ سدھوراں نے سر جھکا کر کہا۔

”ہوں۔۔۔۔۔!“ وڈیرے منصب خان نے حلق سے ایک پُر خیال ہنکاری بھری اور پھر جب بولا تو اس کی بارعب آواز میں قدرے بوجھل پن ساعد کر آیا۔ ”دیکھو چھو کری۔! جہاں داد میرا پٹ ضرور ہے لیکن اگر اس نے تیرے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے تو مجھ سے صاف صاف بات کر۔۔۔۔۔ میں سن رہا ہوں۔“

وڈیرے کی بات سن کر سدھوراں کو حوصلہ ہوا اور اس نے ایک نگاہ اپنے قریب بیٹھے شوہر پرویز کو دیکھا پھر دھیرے دھیرے اس نے شروع سے آخر تک جہاں داد کی زیادتیوں کی ساری کتھا بلا کم و کاست سنا دی۔۔۔۔۔ یہ سب سنا کر وہ بے اختیار ہو کر سسکیاں بھرنے لگی۔ وڈیرے منصب خان نے بغور سدھوراں کی فریاد سنی پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر سدھوراں کے قریب آیا اور اپنا دایاں ہاتھ بڑے شفقت سے بھرے انداز میں اس کے سر پر دھر کر مرتعش لہجے میں بولا۔ ”ٹو ہماری لُج ہے، ہمیں تیری یہ بات پسند آئی کہ ٹو نے کسی اور جگہ (پولیس وغیرہ) فریاد ڈالنے کی بجائے ہم سے اس کا ذکر کیا، اب ٹو بالکل بے فکر ہو جا۔۔۔۔۔ جہاں داد تیرا اب کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

بے اختیار سدھوراں نے وڈیرے کا ہاتھ تھام کر بڑی عقیدت کے ساتھ چوما پھر بولی۔ ”سائیں بھوتار۔۔۔۔۔! مجھے آپ سے یہی امید تھی اس لیے انصاف مانگنے آپ ہی کے ذر پر آئی تھی۔“

وڈیرا منصب خان اپنے صوفے کی طرف آیا اور بیک جنبش اپنے ایک آدمی سے تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ”جہاں داد کو فوراً ادھر حاضر کیا جائے۔“

”حاضر سائیر وڈا۔۔۔۔۔!“ ملازم نے سینے پر ہاتھ رکھ کر احتراماً کہا اور پھر وہاں سے چلا گیا۔

”سائیں بھوتار۔۔۔۔۔! میں نے ایک اور عرضی دینی تھی۔“ معاً چند ٹائیے کی خاموشی کے بعد سدھوراں نے وڈیرے سے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں بلو۔! ہم سن رہے ہیں۔“ جواباً وڈیرے منصب خان نے کھلے دل کے ساتھ کہا اور صوفے پر براجمان ہو گیا۔

”سائیں۔۔۔۔۔! چھوٹے سائیں نے اب تک میرے ساتھ جو بھی زیادتیاں کی ہیں، میں انہیں معاف کرتی ہوں۔۔۔۔۔ میری آپ سے بس اتنی عرضی ہے کہ آ۔۔۔۔۔ آپ بھی اسے

بچت کہنا۔“

”ہرگز نہیں۔۔۔۔۔! ہم اسے معاف نہیں کر سکتے۔“ وڈیرا درشت لہجے میں بولا۔

”جہاں داد ہمارا بیٹا ضرور ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ اپنے ربا کوں (کھیت مزدوروں) کی عزتوں کے ساتھ کھیلے۔۔۔۔۔ اسے ہم پوری پوری سزا دیں گے۔“

سدھوراں کو دوبارہ کچھ کہنے کی ہمت نہ ہو سکی۔۔۔۔۔ وڈیرا منصب خان بری طرح غصے سے کھول رہا تھا۔

پرویز، وڈیرے کی انصاف پسندی سے بڑا متاثر نظر آ رہا تھا، ذرا دیر گزری تھی کہ وہی پاکر دوبارہ نمودار ہوا اور مودہانہ انداز میں وڈیرے سے بولا۔ ”سائیں وڈا۔۔۔۔۔! چھوٹے سائیں کو ان کے مو بائل پر پیغام دے دیا ہے، وہ ادھر ہی آرہے ہیں۔“

جواباً وڈیرے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔۔۔۔۔ اس کے چہرے پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

ماحول میں چند ٹائیے عجیب سے کھچاؤ کی کیفیت طاری رہی پھر اس کے بعد پرویز نے سدھوراں کے کان میں کچھ کہا تو وہ وڈیرے سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”سس۔۔۔۔۔ سائیں۔۔۔۔۔! ہمیں اجازت ہے۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔! جہاں داد کو آ لینے دو۔۔۔۔۔“ وڈیرے نے گمبھیر لہجے میں کہا اور سدھوراں نے چپ سادھ لی۔

خاصی دیر بعد جہاں داد آیا، اس کی نظر پرویز اور سدھوراں پر پڑی تو وہ بری طرح دکھایا گیا پھر جیسے آن واحد میں وہ بات کی تہہ تک پہنچ گیا، اب اس کی آنکھوں میں طیش اور چہرے پر کڑخی عود کر آئی تھی اور وہ بڑے تملائے ہوئے انداز میں پرویز اور سدھوراں کو غور سے لگا اسی اثناء میں وڈیرے منصب خان کی پاٹ دار آواز گونجی۔ ”جہاں داد۔۔۔۔۔! کیا ٹو اب اپنے باپ کو سلام کرنا بھی بھول گیا ہے۔۔۔۔۔؟“

باپ کی بات سن کر جہاں داد نے دوسرے ہی لمحے قدرے شرمندہ ہو کر اسے سلام کیا۔

”بیٹھو۔۔۔۔۔ ادھر سامنے۔۔۔۔۔!“ وڈیرے نے اپنے بیٹے کو دانستہ اپنے ساتھ بیٹھنے کی بجائے سامنے کے صوفے پر بیٹھنے کا حکم دیا جدھر پرویز اور سدھوراں بیٹھے تھے۔ جہاں داد غرضی اندر تملاتا ہوا چارو ناچار ذرا رہٹ کر صوفے کے کونے میں ہنس گیا، وڈیرا چند ٹائیے اپنے بیٹے کو تیز نظروں سے گھورتا رہا۔

اچانک جہاں داد نے اپنی جگہ پر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے باپ سے پوچھا۔

”بابا سائیں.....! یہ دونوں ادھر کیوں آئے ہیں؟“ اس کا اشارہ پرویز اور سدھوراں کی طرف تھا۔

”پہلے تم میری ایک بات کا جواب دو۔“ اچانک وڈیرے میر منصب خان نے گونجدار آواز میں بیٹے سے کہا۔ اس کے مرتعش سے چہرے کے تاثرات سے صاف عیاں تھا کہ اپنی اندرونی کھولتی ہوئی کیفیت پر بمشکل قابو پائے ہوئے ہے۔

”ڈاکٹر فوزیہ کو تم نے انگو کیا تھا؟“ وڈیرے منصب خان نے سرسراتے لہجے میں دھماکا کیا۔ اس کی بات سن کر نہ صرف سدھوراں اور پرویز بھی بری طرح چونک پڑے تھے بلکہ جہاں داد بھی ایک لمحے کو گم سم سا ہو گیا تھا، وہ باپ کی استفسار طلب نظروں کی تیش محسوس کر کے پھنسی پھنسی سی آواز میں بولا۔

”بابا سائیں.....! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں.....؟“
”میں نے جو کہا ہے، وہ تم نے اچھی طرح سن بھی لیا ہے اور سمجھ بھی.....!“ وڈیرے منصب خان نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے پولیس انسپٹر مشتاق احمد آئے تھے اور تمہاری اطلاع کے لیے یہ بھی بتاتا چلوں کہ سرجن وحی حیدر شاہ کی بیٹی ڈاکٹر فوزیہ تمہاری قید سے فرار ہو کر اپنے گھر پہنچ چکی ہے..... تم نے کیا اسے اپنے گوتھ کی کوئی معمولی چھوڑ کر سمجھ لیا تھا.....؟“

”بابا سائیں.....! پہلے آپ ان دونوں کو یہاں سے رخصت کریں پھر میں آپ.....!“

”ہرگز نہیں.....!“ وڈیرا منصب خان اس کی بات سمجھ کر یکدم غصے سے اٹھ کھڑا ہوا تو جہاں داد بھی فوراً باپ کے احترام میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، ساتھ ہی پرویز اور سدھوراں بھی احتراماً اپنی جگہ سے اٹھنے لگے تو وڈیرے نے انہیں اپنے ایک ہاتھ کے اشارے سے بیٹھے رہنے کو کہا۔

”پہلے تم میری بات کا جواب دو جہاں داد.....! تم نے ڈاکٹر فوزیہ کو انگو کیا تھا اور کیوں.....؟ مگر یاد رکھنا میں تمہارا باپ ہوں اور اگر مجھ سے تم نے کسی بھی قسم کی چٹائی چھپانے کی کوشش کی تو تمہیں یہ سچ تھانے جا کر اگلنا پڑے گا۔“ وڈیرے منصب خان کے لہجے میں بلا کا غیظ تھا اور لگتا تھا کہ انہوں نے آج اپنے لاڈلے بیٹے سے بڑی کڑی بازت کا تہیہ کر رکھا ہے۔ ادھر جہاں داد کا چہرہ پریشانی اور بدحواسی کے مارے تہمتانے لگا تھا، اس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا، اس کی طول پکڑتی خاموشی پر وڈیرے منصب خان نے

”تم نے..... تم نے..... اپنے بابا سائیں کی عزت کو دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا..... کل بت جو پولیس والے مجھ سے آنکھ اٹھا کر بات نہیں کر سکتے تھے، آج وہ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ اور وہ بھی باوردی میرے پاس آ کر اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تمہارے برتوڑی کی داستان سنارے تھے اور میں شرم سے زمین میں گڑا جا رہا تھا، کیا اسی دن کے لیے میں نے تمہیں جو ان کیا تھا کہ تم اپریں بابا سائیں کی عزت کو مٹی میں ملا دو.....؟“
وڈیرا غیظ کے عالم میں کانپنے لگا۔ جہاں داد نے کچھ بولنے کی کوشش کی تو وڈیرا اسے سچ بولنے سے روکتے ہوئے پرویز اور سدھوراں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اس چوڑی سدھوراں کو آج سے تم میری بناہ میں سمجھو اور تم نے اس معصوم چھوڑی کے ساتھ جو ظلم کیا ہے اور اب تک کرتے آرہے ہو، تمہیں بعد میں اس کا حساب بھی دینا ہوگا..... میری ایک بات کان کھول کر سن لو جہاں داد.....! تم نے آج کے بعد ان دونوں کو پریشان کرنے کی قسم کا نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا کیونکہ مجھے ایسی اولاد کی ضرورت نہیں جو اپنے باپ اور خاندان کی عزت کی دشمن ہو، میری بات سمجھ رہے ہو ان.....؟“ وڈیرے نے خاصی صراحت کے ساتھ کہا۔

”مگر بابا سائیں.....!“

”بس.....! تمہیں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے اب.....“ وڈیرے نے اس کی بات کاٹ کر اپنا ایک ہاتھ اسے خاموش رہنے کے انداز میں بلند کرتے ہوئے کہا۔ ”اب یہ میرا علم ہے کہ تم اسی وقت شہر چھوڑ کر گوتھ کی طرف لوٹ جاؤ اور جب تک میں تمہیں یہاں آنے کی اجازت نہ دوں، تم نے ادھر کا رخ بھی نہیں کرنا ہے۔“

جہاں داد اپنے باپ کے غضب ناک لہجے پر خاموش ہو گیا مگر اس کے اندر کینہ و بغض کا طوفان کروٹیں بدلنے لگا تھا البتہ پرویز اور سدھوراں کے چہروں پر اب گہری طمانیت پھیل چکی تھی۔

☆=====☆=====☆

سرجن وحی شاہ بری طرح تلملائے ہوئے تھے، اپنی بیٹی فوزیہ کے انگوادالے معاملے سے بعد سے وہ اپنے گہرے دوست انسپٹر مشتاق احمد سے بھی ناراض ہو گئے تھے، انہوں نے بہر حال میں جہاں داد کو سلاخوں کے پیچھے دھکیلنے اور کڑی سے کڑی سزا دلوانے کا تہیہ کر

ملوکان کے تو خوشی کے مارے زمین پر پاؤں ہی نہیں ٹک رہے تھے، اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ تقدیر کبھی اس طرح بھی اچانک مہربان ہونے لگتی ہے..... دل ناصبور کی حسرتیں اس طرح اچانک بھی پوری ہونے لگتی ہیں.....؟

ماما اندر رکھو اور چاچا سکھو کی ملاقات کے دوران سانول اور ملوکان کی شادی سے متعلق باتیں سکھو کی بیٹی میراں نے سب سے پہلے سنی تھیں اور بعد میں خوشی سے نہال ہو کر میراں اندر کوٹھری کی طرف یہ خوشخبری ملوکان کو دینے کے لیے دوڑ پڑی تھی کیونکہ اس وقت محن میں چاچی بھی موجود تھی، اسی لئے ملوکان لچ کے مارے اندر کوٹھری میں ہی دبی رہی تھی مگر اس کا دل مسرت سے بے طرح دھڑکے جا رہا تھا اور پھر جب اس کی چچا زاد میراں نے اسے یہ آ کر بتایا کہ اس کی سانول کے ساتھ نسبت طے کر دی گئی ہے تو ملوکان کا چہرہ شرم اور مسرت سے گلزار ہو گیا۔

ادھر ساتھ والی جھلی میں دونوں لالچی ماں، بیٹے، عجیباں اور خالقو اس رشتے پر اندر ہی اندر کڑھ رہے تھے کیونکہ وہ دونوں یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ ملوکان کے سنگ کا عیوضہ (رقم) اب ایک دھیلہ بھی نہیں ملے گا جبکہ آچر خان نے ان دونوں لالچی ماں، بیٹے سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ ملوکان کی شادی اس سے کر دیں تو وہ اس رشتے کا عیوضہ پورے دو لاکھ روپے دے گا چنانچہ اب ان دونوں ماں، بیٹوں کے لیے یہ معاملہ کھٹائی میں پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔

”یہ سب تیری جلدی بازی کی وجہ سے ہوا ہے خالقو.....!“ مائی عجیباں نے بیٹے کے لئے لیتے ہوئے کہا۔ ”تیرے کو میں نے سمجھایا بھی تھا کہ ملوکان ڈرا اور ہی دماغ کی چھوٹ کر رہے، زور زبردستی کرے گا تو کما دکی طرح سیدھی اکڑ جائے گی۔“

”تو پھر میں کیا کرتا امڑ.....! تو نے بھی تو ملوکان کو آرام اور پیار سے سمجھانے کی کوشش کی تھی پھر کیا ہوا.....؟“ خالقو نے برا سامنے بنا کر ماں سے کہاں تو عجیباں جڑ بڑھ کر رہ گئی۔

اچانک باہر سے ایک آواز ابھری۔ ”اڑے خالقو.....!“ خالقو اس آواز پر چونکا اور بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ ”یہ تو آچر خان کے ہوٹل کا پیشکار رسیدو ہے۔“

”ہاؤڑے! میں اندر ہی بیٹھا ہوں آجا.....“ خالقو نے اندر ہی سے کھری چار پائی بیٹھے بیٹھے ہانک لگائی۔

”میرے پاس ٹیم نہیں ہے..... آچر سائیں نے تیرے کو اسی وقت بلایا ہے ہوٹل میں.....! اچھا میں چلا.....“ سیدو نامی، آچر خان کے ہوٹل کا پیشکار یہ کہہ کر فوراً چلا گیا۔

رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انسپکٹر مشتاق احمد نے یہ مسئلہ حل کرنے کا وعدہ کیا تھا..... اگرچہ بعد میں ان کی بیگم اور بیٹی فوزیہ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اب اس معاملے کو ادھر تک دفن کر دیں کیونکہ وہ وڈیرا زادہ دوبارہ ایسی اچھی حرکت کرنے کی جرأت نہ کرے گا لیکن اس کے باوجود وصی شاہ کا غصہ کم نہ ہوا تھا۔

پھر ایک روز انسپکٹر مشتاق احمد نے ٹیلیفون پر سرجن وصی شاہ سے رابطہ کیا۔ ”جناب.....! میں نے جہاں داد کے باپ منصب خان سے ملاقات کی تھی، وہ اپنے بیٹے کی اس حرکت پر سخت شرمسار تھے۔“

”ان کی شرمساری سے بات نہیں بنے گی انسپکٹر صاحب.....!“ سرجن وصی شاہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”ارے بھئی.....! وہ تم سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔“

”کون، وہ مردو جہاں داد.....! ٹھیک ہے، اسے لے آؤ میرے پاس، تمہارے اندر ہمت نہیں ہے تو میں خود اس کمینے کی گردن دبا دوں گا۔“

”مجھے تمہاری ذہنی اذیت کا بخوبی اندازہ ہے وصی شاہ.....! جہاں داد کا باپ منصب خان خود تم سے معافی مانگتا چاہتا ہے اور میں اسی وقت اسے اپنے ہمراہ لے کر آ رہا ہوں۔“

انسپکٹر مشتاق احمد نے کہا مگر سرجن وصی شاہ کا غصہ پھر بھی نہ اترا۔

”اس کا باپ مجھ سے گالیاں سننے آ رہا ہے، دیکھو انسپکٹر مشتاق.....! تم میرے بچے اور اچھے دوست ہو تو اسی وقت جہاں داد کو سلاخوں کے پیچھے دھکیل دو بس.....!“

”میں تمہارا اچھا اور سچا دوست ہوں، اسی لئے تمہیں صحیح مشورہ دینے کی کوشش کر رہا ہوں ناں یار.....!“ انسپکٹر مشتاق احمد نے رسائیت سے کہا۔ ”دیکھو ہم پولیس والوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوتا ہے..... تم ایک معزز شخص ہو..... تمہاری معاشرے میں اپنی ایک ساکھ ہے، میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا کہ یہ ایسا نازک اور حساس معاملہ ہے کہ اس کو جتنا بھی اچھا لیس گے، اس سے تمہیں ہی نقصان پہنچے گا..... بہتر یہی ہے کہ معاملہ معافی تلانی کے بعد یہیں ختم کر دیا جائے۔“ پھر انسپکٹر مشتاق نے مسز وصی شاہ سے بات کی۔

”بھابی.....! آپ ہی سمجھا میں ناں وصی کو.....“ انسپکٹر مشتاق کی بات سن کر وہ سرجن وصی شاہ کو سمجھانے لگیں

”پتہ نہیں کیوں آچر خان نے مجھے بلایا ہے، ابھی تو مل کے آیا تھا۔“ خالقو بیڑا سے ہوئے اٹھا۔

مائی عجیباں نے قدرے تفکر سے پوچھا۔ ”اب کیا کرے گا آچر خان سے مل کر رہنے دے۔“

”رہنے کیسے دوں امڑ.....!“ خالقو دانت پیٹتے ہوئے غصے سے بولا۔ ”میں چاہو سکھو کو ملوکاں کے عیوضہ کے پیسے اکیلے نہیں کھانے دوں گا، اسے مجھے بتانا پڑے گا کہ اس نے کتنے پیسے کے بدلے ہماری ملوکاں کا رشتہ طے کیا ہے..... میں پہلے چاچا سکھو سے متا ہوں پھر آچر خان کے ہوٹل جا کر اس سے بات کروں گا..... جھگڑا ہے تو جھگڑا سہی.....!“ خالقو یہ کہہ کر جھگی سے باہر نکلا اور ذرا ہی دیر بعد چاچا سکھو کی جھگی کے صحن میں موجود تھا۔ شکستہ صحن میں ایک کھری چارپائی پر چاچا سکھو ایک میلے چیکٹ تنیکے سے کہنی نکائے نیم دراز بیڑی پی رہا تھا۔

”چاچا.....! تو نے ملوکاں کے سنگ کا کتنا عیوضہ (روپیہ) طے کیا ہے؟“ خالقو نے سپاٹ لہجے میں اس سے پوچھا۔ چاچا سکھو نے بیڑی کا کش لے کر دھواں اگلا پھر سیدھا ہو کر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”نہ سلام..... نہ دعا..... کیا روپے نے تیرے کو اتنا اندھا کر ڈالا ہے ڈے چھو کر.....! تجھے تمیز نہیں گھر میں داخل ہونے کی.....؟“

”چاچا.....! میں تیرے سے فالتو باتیں نہیں کرنے آیا ہوں، مجھے بس تو یہ بتا کہ تو میری بہن ملوکاں کے سنگ.....!“

”اڑے جا ادھر سے..... تو ہوتا کون ہے مجھ سے یہ پوچھنے والا.....؟“ چاچا سکھو بھی بھیجے کی بدکلامی پر طیش آ گیا، وہ چارپائی سے اٹھتے ہوئے بھنا کر بولا۔

”میں ملوکاں کا بھائی ہوں۔“ خالقو آنکھیں نکالتے ہوئے درشتی سے بولا۔

”پر ملوکاں تجھ جیسے لالچی بھائی کو اپنا بھائی نہیں سمجھتی..... وہ اپڑیں مرضی سے یہاں میرے پاس آئی ہے بلکہ اب تو وہ میری پناہ میں ہے۔“

”میں خوب سمجھتا ہوں اس پناہ کو چاچا.....!“ خالقو زہر خند لہجے میں طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”ملوکاں اپڑیں عاشق سے شادی کرنا چاہتی ہے اور تو اس شہری موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کے نکلے کھرے کرنا چاہتا ہے۔“

”خالقو.....!“ اچانک چاچا سکھو اس کی زہر آلود گفتگو پر غضب ناک ہو کر چلا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے آگے بڑھ کر خالقو کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ بھی جڑ دیا۔

”نکل جا فوراً یہاں سے ورنہ.....؟“ چاچا سکھو غصے کی شدت سے کانپنے لگا۔

اس اثناء میں میراں، ملوکاں اور چچی بھی پریشان پریشان سے وہاں آگئے..... خالقو چند لمحوں کے لیے چاچا سکھو کو زہر خند نظروں سے گھورتا رہا پھر کینہ تو زانداز میں اپنے سر کو جنبش دیتا ہوا پاؤں جچ کر باہر آ گیا۔ وہاں سے وہ سیدھا آچر خان کے ہوٹل پہنچا تو اس کے غصے سے لال، پیلے چہرے کو دیکھ کر آچر خان چونکا اور اسے ہوٹل کے اندر ایک چھوٹے سے الگ تھلک کچے کمرے میں لے آیا۔

”اڑے خالقو.....! خیریت تو ہے.....؟“ آچر خان بغور اس کے غصے سے سرخ چہرے کو گھورتے ہوئے بولا۔

”آچر خان.....! مجھے پستول چاہئے۔“ خالقو پُرطیش لہجے میں دانت بھیج کر بولا۔

”اڑے کیا اپڑیں، بہن ملوکاں کو کاری کرے گا.....؟“

”نہیں.....! میں ابھی اور اسی وقت چاچا سکھو کا کام تمام کروں گا۔“ خالقو نے فوٹو فٹاں لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں سے انتقام کی چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔

”تجھے تو یہ کام پہلے ہی کر لینا چاہئے تھا جب اس بڑھے نے ملوکاں کا سنگ ماما اللہ رکھو کے بھانجے سانول سے طے کر دیا تھا۔“ آچر خان نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ اس کی چند ہی چندی آنکھوں میں سفاکی ہلکورے لے رہی تھی۔ خالقو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اپنا غصہ بھلا کر بولا۔

”کیا تجھے پتہ ہے کہ.....؟“

”ہاؤ.....! تو مجھے کیا سمجھتا ہے، کیا میں آنکھیں بند کر کے بیٹھا ہوں، اسی لیے تو میں نے سید کو تیری طرف پیغام دے کر بھیجا تھا۔“ آچر خان نے اسرار بھری مکاری سے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے پھر..... اب کیا کہتا ہے تو.....؟“ خالقو نے غلٹ آمیز جارحانہ جوش سے پوچھا۔

”بس اس کا آسان حل یہی ہے کہ اس بڑھے سکھو کا کام تمام کر دے۔“

”مگر.....! پولیس.....؟“ پہلی بار خالقو منمنائی آواز میں بمشکل بولا۔

”اڑے یار.....! اس کو میں سنبھال لوں گا، دل بڑا کر میں ہوں ناں.....! بڑھے کے مرنے کے بعد ملوکاں خود ہی تیری سرپرستی میں آجائے گی بلکہ میں تو سمجھتا ہوں اس کی جوان بیٹی میراں بھی تیرے رحم و کرم پر ہوگی پھر تو بعد میں اس کے بھی نکلے کھرے کر سکتا ہے، ڈے چھو.....!“ آچر خان نے سرسراہٹ ہوئی مکاری سے سرگوشی سے کہا اور خالقو کی

آنکھوں میں لالچ کی چمک عود کر آئی۔

☆=====☆

رات کا سسے جیسے جیسے قریب آتا جا رہا تھا، سارنگ کے دل کو عجیب سی بے چینی پریشان کرنے لگی تھی مگر اس بے چینی میں خوف شامل نہ تھا۔ بجز اس کے کہ اس کے اندر مقننہ جوش کا ابال سا اٹھ رہا تھا۔ اس نے آج کی رات دو اہم کام نمٹانے تھے، پہلا یہ کہ اس غلام ہندو سا ہو کر رام دیال کے چنگل سے اپنی معصوم اور دکھوں کی ماری بھابی اللہ وسائی کو چھڑانا، دوسرے وہ غنا باز گاتریا دھر جیوش بابا کی جھونپڑی میں آنے والا تھا۔ سارنگ گاتریا کا خون پینے کے لیے بے چین تھا، وہ اپنے اس ازلی دشمن کو کیسے بھول سکتا تھا، یہی تو وہ دھوکے باز شخص تھا جس کی وجہ سے وہ آج صحرا بے صحرا کی خاک چھانتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا بلکہ گاتریا تو بھابی اللہ وسائی اور فرید وکا بھی مجرم تھا۔

سارنگ نے فرید وکو جھونپڑی سے ذرا پرے جھاڑیوں کے جھنڈ میں چھپا رکھا تھا۔ سارنگ بظاہر جیوش بابا کی جھونپڑی کے باہر ایک سیوک کی حیثیت سے بیٹھا ہوا تھا مگر درحقیقت اس کا دھیان جھونپڑی کے اندر تھا جہاں جیوش بابا معصوم لڑکی رکنی کے ساتھ تھا موجود تھا۔ سارنگ نے اگرچہ اپنی طرف سے رکنی کو جیوش بابا کے خلاف خوب ورغلا یا تھا اور اسے طعن و تشنیع بھی کی تھی کہ وہ محض اپنے محبوب کو حاصل کرنے کے لیے جیوش بابا جیسے شیطان نما انسان کا کھلونا نہ بنے۔ سارنگ نے یہ طے کر رکھا تھا کہ اگر جیوش بابا نے اس معصوم اور مجبور لڑکی رکنی کے ساتھ کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یوں تو سارنگ ایک سیوک کی حیثیت سے جیوش بابا کے قریب اندر ہی اس کی جھونپڑی میں رہنا چاہتا تھا مگر جیوش بابا ایک کا نیاں شخص تھا، اس نے سارنگ کو سختی سے باہر ہی بیٹھے رہنے کی ہدایت دے رکھی تھی..... سارنگ کو جیوش بابا کی جھونپڑی میں دوسرا دن تھا، یہاں آ کر اس نے اپنا حلیہ بھی خاصا بدل لیا تھا، اسے خطرہ تھا کہ کہیں بارڈر سیکوری فورسز کے اہلکار جو یقیناً صحرائی بھیڑیوں کی طرح اس کے خون کی بوسو گتھے پھر رہے ہوں گے، کہیں ادھر نہ آنکلیں۔

شام کے سائے دراز ہونے لگے تو سارنگ نے سوچا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ یوں تو اسے سب سے پہلے ہندو سا ہو کر رام دیال کے ہاں جانا تھا، جدھر اس کی بھابی اللہ وسائی قید تھی اور سارنگ نے ہر حال میں اسے چھڑانا تھا کیونکہ ننھے فرید و کے کہنے کے

مطابق رام دیال اب بھابی اللہ وسائی کو آدھی قیمت میں گاتریا کو واپس لوٹانا چاہتا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ وسائی کا چھوٹا گودکا بچہ تھا اور دوسرے وہ بیمار بھی کافی رہنے لگی تھی۔

سارنگ ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اچانک اسے پاس ہی کہیں چند لوگوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں سنائی دیں..... وہ چونک کر آواز کی سمت دیکھنے لگا، اپنی دہنی باب ایک سپاٹ سے ریتیلے ٹیلے کے عقب سے تین چار ہٹے کٹے اور کالے بھنگ سے بد معاش نما افراد آتے نظر آئے، ان کے تیور بڑے خطرناک معلوم ہو رہے تھے، سارنگ سنبھل کر بیٹھ گیا..... ان سب کے سر گنجے تھے، ہر ایک کے کان میں بڑا سا بالا جھول رہا تھا، چروں پر کرختی نے جیسے مستقل ڈیرے ڈال رکھے تھے، ان چاروں نے کھلے ہنسون والی اسٹیکیں اور گھیر دار نیٹے والی گیر وے رنگت کی شلواریں پہن رکھی تھیں۔

”اوئے..... کون ہے رے تو.....؟“ وہ چاروں سارنگ کو دیکھ کر اسے گھورتے ہوئے اس کے قریب آئے تو ایک کھیم کھیم بد معاش نے کرخت لہجے میں اس سے پوچھا۔

”میں..... مہاراج کا سیوک ہوں۔“ سارنگ خوف زدہ انداز میں بولا۔

”اچھا..... اچھا.....! سمجھا، شک تو مجھے ہو گیا تھا کہ تو مہاراج بابا کا سیوک ہے..... ایک بات بتا تو نے ادھر آس پاس کسی نو، دس سالہ چھوکرے کو تو نہیں دیکھا؟“ اس نے اپنا تر بوز جیسا سر ہلاتے ہوئے پوچھا تو سارنگ ایک لمحے کو ڈر سا گیا مگر پھر فوراً بولا۔

”ہاں..... ہاں.....! ایک چھوٹے بالکے کو میں نے کسی بوڑھے کے ساتھ سائنڈی پر جاتے دیکھا تھا، وہ بہت ڈرا سہما ہوا نظر آ رہا تھا، پہلے تو اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اسے اندر مہاراج کی جھونپڑی میں پناہ دے دوں پر میں نے اسے بری طرح دھتکارا تو وہ یہاں سے گزرتے ہوئے ایک بوڑھے سائنڈی سوار کے ساتھ چلا گیا۔“

”کدھر..... کدھر گیا ہے وہ.....؟“

”ادھر..... پورب کی طرف.....“ سارنگ نے راجستھانی لہجے میں ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سنتے ہی وہ چاروں آگے نکل گئے، بد معاشوں کے جاتے ہی سارنگ نے کھکھ کا ساں لیا، وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ غنڈے سا بوکا رام دیال داس کے تھے جو فرید و کو بھوکے بھیڑیوں کی طرح ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ سارنگ نے جب دیکھا کہ دیال داس کے غنڈے نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں تو وہاں سے اٹھا اور جلدی سے لپک کر کھجور دے کے جھنڈ کی طرف آیا جدھر فرید و چھپا بیٹھا تھا۔ سارنگ نے اسے جب دیال داس کے

کے بارے میں بتایا تو اس کے معصوم چہرے پر خوف کی پرچھائیں نمودار ہو گئیں مگر سارنگ نے اسے تسلی دیتے ہوئے سختی سے اس بات کی ہدایت کی کہ وہ خاموشی سے اپنی جگہ پر چپ بیٹھا رہے۔

سارنگ اب دو طرفہ سوچوں میں الجھ کر رہ گیا تھا، کبھی وہ ارادہ باندھتا کہ پہلے رام دیال کے ہاں جا کر اپنی بھابی اللہ وسائی کو اس کی قید سے چھڑا لائے تو کبھی وہ سوچتا کہ اسے ادھر ہی رہ کر دغا باز گاتریا کا انتظار کرنا چاہئے، اسے اپنا آخری خیال زیادہ مناسب لگا کیونکہ فرید و نے اسے بتایا تھا کہ بھابی اللہ وسائی کو چونکہ رام دیال آج رات گاتریا کو واپس کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ سارنگ کے محتاط انداز کے مطابق گاتریا یہاں آنے سے پہلے یقیناً رام دیال کے پاس جائے گا اور پھر بھابی اللہ وسائی کو اپنے قبضے میں لے کر ادھر اپنے اصل گرو گھنٹال جیوش بابا کے پاس آئے گا۔ یہ سوچ کر سارنگ مطمئن ہو گیا۔

اب وہ دوبارہ جھوپڑی کے باہر بیٹھ گیا تھا، آس پاس کا ماحول گہری خاموشی میں غرق تھا، رات کی تاریکی پھیلنے لگی تھی، روشن طباق چاند ناری کے تنک کی طرح گویا صحرا کی پیشانی پر دمک رہا تھا۔ صحرا کے چاند کی اپنی ایک مسحور کن دلکشی ہوتی ہے، نرم اور خشک..... لیکن سارنگ کو اس طلسماتی رات کے دلغریب منظر سے لطف اندوز ہونے کا ذرا برابر بھی ہوش نہ تھا، وہ جس مقصد کے لیے اتنا طویل سفر کر کے یہاں پہنچا تھا، اسے اپنی جان بھیسلی پر رکھ کر پورا کرنا تھا..... سارنگ جلد از جلد بھابی اللہ وسائی اور فرید و کو لے کر یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا کیونکہ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اس کے گرد ویدہ و نادیہ دشمنوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

اچانک سارنگ کی نظر سامنے ایک انسانی ہیولے پر پڑی اور وہ بری طرح ٹھک گیا، وہ کوئی سانڈنی سوار تھا، جو سانڈنی کو درمیانی رفتار سے دوڑاتا ہوا جھوپڑی کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا، اسے دیکھ کر سارنگ کو اپنے دل کی دھڑکنیں کنپٹیوں پر سنائی دینے لگیں، وہ سنبھل کر بیٹھ گیا اور سانڈنی سوار پر نظریں گاڑ دیں، اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہی مرد گاتریا ہے۔

چند لمحوں بعد سانڈنی سوار جھوپڑی کے قریب پہنچ کر رک گیا تو اسے پہچان کر سارنگ کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں، وہ گاتریا ہی تھا، اسے دیکھ کر سارنگ کو اپنے طیش پر قابو پانا دشوار ہو رہا تھا تاہم سارنگ کو اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ کہیں گاتریا اسے پہچان نہ لے، اگرچہ اس کا امکان کم تھا کیونکہ کچھ نامساعد حالات اور بچہ مارنگ کی اپنی دست مشقی نے کافی حد تک حلیہ بدل ڈالا تھا۔ سارنگ کے چہرے پر بہت گھنی داڑھی ابھر آئی تھی..... بال بھی جو گیلے

ہنسیوں کی طرح لمبے اور جٹا دار ہو گئے تھے..... مونچھیں، ہنر اور داڑھی کے بال مشترکہ انداز میں ہی چہرے پر پھیلے ہوئے تھے..... سارنگ کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ گاتریا کے ہمراہ بھابی اللہ وسائی نہ تھی، وہ سوچنے لگا کیا گاتریا ابھی رام دیال کے ہاں نہیں گیا بلکہ سیدھا وہ یہاں چلا آیا تھا؟

وہ اٹھ کر کھڑا ہوا..... گاتریا آیا سانڈنی کو اس کے قریب لا کر نیچے اتر آیا، دونوں کی سرد اور ساٹ نظریں ایک دوسرے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں پھر گاتریا نے ہی ابتداء کی اور بغور سارنگ کو گھورتے وئے سختی سے پوچھا۔ ”تو کون ہے؟“ اور یہاں کیا کر رہا ہے۔“ سارنگ نے آن کی آن میں اپنے اندر کے جوا لاکھی پر قابو پایا اور یکدم مکارانہ عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”میں..... میں..... مہاراج جیوش بابا کا سیوک ہوں..... چالیس دن ان کے چرنوں میں چلے کشی کرنے کے لیے ادھر آیا ہوں۔“

”اچھا.....! میری سانڈنی کا خیال رکھنا۔“ گاتریا، سارنگ کے انداز تحاطب پر مطمئن ہو کر بولا اور پھر جھوپڑی کے اندر داخل ہو گیا..... سارنگ چند ثانیے اپنی جگہ دم بخود کھڑا رہا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ دبے پاؤں جھوپڑی کی طرف بڑھا اور اندر کی سن گن لینے لگا۔

”رام دیال کا مغز خراب ہو گیا ہے جو آدھی قیمت میں اس عورت کو واپس کر رہا ہے، تو نے اچھا کیا گاتریا.....! اجوا کر، کے..... جانے کی بجائے سیدھا ادھر آ گیا۔“ یہ جیوش بابا کی آواز تھی۔

”سو تو ٹھیک ہے پر مہاراج.....! یہ سندر ناری کون ہے.....؟“ یہ گاتریا تھا..... سارنگ بغور ان کی باتیں سن رہا تھا..... وہ گاتریا کا اشارہ سمجھ گیا تھا، یقیناً اس نے جیوش بابا کے ساتھ موجود رکنی کو دیکھ لیا تھا۔

”ہاں رے یہ ہے تو بڑی زبردست چیز..... پر ہے ذرا تنکھی.....“ جیوش بابا نے کہا۔ ”تو کیا ہوا..... میں جو آ گیا ہوں..... بول کتنے چاہئیں؟“ یہ گاتریا تھا۔

سارنگ کو اچانک احساس ہوا کہ رکنی اندر موجود نہ تھی یا پھر سو رہی تھی ورنہ وہ ان دونوں شیطانوں کے عزائم جان کر ضرور چیختی چلاتی۔ یہ دیکھنے کے لیے سارنگ نے تپلی سی جھری بنا کر اس سے اپنی آنکھ چپکادی..... (اندر واقعی اسے رکنی فرش پر بے سدھ پڑی نظر آرہی تھی، سارنگ کو فوراً شبہ ہوا کہ وہ سو نہیں رہی تھی بلکہ بے ہوش تھی یا بے ہوش کر دی گئی تھی۔

”مجھے امید تھی مہاراج کہ تم نے میرے لیے ضرور کوئی تازہ شکار پھانس رکھا ہوگا،

بننے میں اڑے جھگی کے اندر داخل ہو گیا۔ سامنے اس کی ماں عجیباں سینے پر ہاتھ دھرے
ذہن زدہ سے اندازہ میں کھڑی تھی۔ اس نے پھیلی ہوئی نظروں سے بیٹے کا چہرہ دیکھا تو
وہاں اسے وحشت کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ دونوں ماں بیٹے کی نظریں چار ہوئیں اور مائی
عجیباں نے بیٹے کی سرد آنکھوں میں سفاکی کی جھلک محسوس کرتے ہوئے انک انک کر
پوچھا۔ ”خ..... خالقو..... فائرنگ کی آواز۔“

”میں نے چاچا سکھیو کو قتل کر ڈالا ہے۔“ خالقو نے سفاک لہجے میں کہا تو مائی عجیباں
کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ادھر جھگی کے عین سامنے گولیوں کی سمع خراش آوازوں کے
ساتھ چاچا سکھیو کی چیخ نے اندر موجود میراں، ملوکاں اور چاچا سکھیو کی بیوی کو ہراساں کر
دیا۔ جھگی کے باہر آئے تو تینوں کے حلق سے دہشت کے مارے چہچیس نکل گئیں۔ تینوں خون
میں ات پت چاچا سکھیو سے لپٹ گئیں اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ اچانک ملوکاں کو
احساس ہوا کہ چاچا سکھیو ابھی زندہ ہے۔ اس کے بوڑھے لب کپکپارے تھے۔ اس نے فوراً
اپنا کان اس کے لبوں کے قریب کیا تو اسے چاچا سکھیو کی ڈوبتی ہوئی آواز سنائی دی۔
”خ..... خ..... نن..... نے.....“ اس سے آگے چاچا سکھیو کچھ نہ کہہ سکا اور دوسرے ہی
لمحے اس کی روح نفسِ عنصری سے پرواز کر گئی، مگر ملوکاں چاچا سکھیو کے ادھورے لفظوں کا
مطلب سمجھ چکی تھی اور اس کی نگاہوں کے سامنے اپنے لاپٹی اور خود غرض بھائی خالقو کا چہرہ
رہس کرنے لگا۔ ٹھیک اسی وقت پاس کی جھگی سے مائی عجیباں اور خالقو بھی اپنے چہروں پر غم و
اندوہ کے تاثرات لئے نمودار ہوئے اور پھر وہیں چاچا سکھیو کی لاش کے پاس ہی بیٹھ کر
دونوں ماں بیٹا مین کرنے لگے۔ ملوکاں نے آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ ایک لمحہ کو
دونوں مکار ماں بیٹے کی طرف دیکھا پھر جیسے اگلے ہی لمحے اس پر ہسٹریائی دورہ پڑ گیا۔ جنگلی
ٹائی طرح اپنے بھائی خالقو پر جھپٹی اور اس کا گریبان پکڑ لیا۔ ”ذلیل..... قاتل..... ٹوٹنے
میرے چاچا کا خون کر دیا، میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ اس کی آنکھوں سے شعلے
نکل رہے تھے اور لہجہ آتش فشاں ہو رہا تھا۔ مگر پھر اگلے ہی لمحے وہ بے چاری صدمے سے
نرمال ہو کر بے ہوش ہو گئی۔

☆=====☆=====☆

وڈیرے میر منصب خان سے ملاقات کے بعد پرویز اور سدھوراں مطمئن ہو گئے۔
سب سے زیادہ خوش اور مطمئن سدھوراں تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اب بد نظرت جہاں داد

اسی لئے میں نے روپے بچا رکھے تھے اور رام دیال کی طرف نہیں گیا تھا ورنہ وہ باسی مال
آدھی قیمت میں مجھے واپس کر دیتا۔“ گاتریا نے خوش ہوتے ہوئے کہا اور اپنی قمیض کے
اندر سے ایک بندھا ہوا مال نکال کر جیوش بابا کی طرف بڑھایا۔

”گن لو، اتنے ہی ہیں جتنے میں دیتا آ رہا ہوں..... بے فکر رہو۔“

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے تو اب اسے فوراً لے جا، میں نے اسے جڑ سگھی سنگھادی
ہے، یہ اب چار پانچ گھنٹوں سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گی۔“ جیوش بابا نے نوٹوں کا
رو مال جھپٹتے ہوئے کہا اور گاتریا نے فوراً بے سدھ رکنی کو اٹھا کر کاندھوں پر ڈال لیا۔

سارنگ کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی..... گاتریا کے لیے اس کے دل و دماغ
میں جو نفرت کا طوفان چھپا ہوا تھا، وہ اب آتش فشاں کی مانند ابل پڑنے کو تھا..... سارنگ،
معصوم رکنی کو بہر صورت گاتریا کے خونی شکنجے سے بچانا چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ رزیل
انسان معصوم رکنی کو بھی بھابی اللہ و سائی کی طرح کہیں اونچے دام بیچ دے گا۔

سارنگ اب گاتریا کے جھونپڑی سے باہر نکلنے کا منتظر تھا۔

☆=====☆=====☆

آچر خان کی سفاکانہ ترغیب پر خالقو نے عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے چاچا سکھیو کو قتل
کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس ”کام“ کے لیے آچر خان نے اسے ایک پستول بھی مہیا کر دیا تھا،
اس کے اندر تین گولیاں تھیں..... خالقو نے پستول اپنی قمیض کے اندر نیپے میں اڑس لیا تھا۔

”زن، زرارہ زمین“ کی ہوس جب انسان کے سر پر سوار ہونے لگتی ہے تو وہ اپنے
پرائے اور سنگے رشتوں کو بے معنی محسوس کرنے لگتا ہے، یہی حال خالقو کا تھا، وہ لالچ میں اس
قدر اندھا ہوا چکا تھا کہ بلا جھجک اپنے سنگے چاچا سکھیو کو قتل کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

جب شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو خالقو نے اجرک کا ڈھانا اپنے چہرے پر
سر کا لیا اور سکھیو چاچا کی گھات میں بیٹھ گیا..... اچانک اسے سکھیو چاچا آتا ہوا دکھائی دیا،
خالقو اسی موقع کا منتظر تھا..... آس پاس ویرانی تھی، چاچا سکھیو اپنی جھگی سے ابھی تھوڑے ہی
فاصلے پر تھا کہ خالقو نے اچانک اس کے قریب آ کر یکے بعد دیگرے اس پر تین فائر جو تک
مارے..... تینوں گولیاں بوڑھے چاچا سکھیو کے سینے میں پیوست ہو گئیں اور بے چارہ آواز

نکالنے، نیر زمین بوس ہوتا چلا گیا۔
چاچا سکھیو کے سینے پر تین گولیاں اتارنے کے بعد خالقو پستول اپنی قمیض کے اندر

ہوئیں اور رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے اپنے عقب میں دروازہ بند کیا اور تیر کی طرح اندر کمرے کی طرف دوڑا۔ سدھوراں اپنی جگہ ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔ پرویز نے اپنے کمرے میں آ کر ایک الماری کھولی اور جلدی جلدی اندر سے پیسے اور کچھ ضروری کاغذات سمیٹنے لگا۔ سدھوراں نے پریشان کن لہجے میں پوچھا۔

”سدھوراں میں جابجا رہا ہوں۔ پولیس میرے پیچھے ہے۔“ پرویز نے پھولی ہوئی ہانسیوں کے درمیان کہا تو سدھوراں دھک سے رہ گئی اور اس کے حلق سے پھنسی پھنسی کی آواز نکلی۔

”پپ۔۔۔ پولیس۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ اس کیلئے ولد ار حسین کی کارستانی ہے یہ۔۔۔ خیر میں دیکھ لوں گا اسے بھی تم بالکل حوصلہ مت ہارنا۔۔۔ میں اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کروانے کی کوشش کروں گا۔ تم اگر ڈاکٹر فوزیہ کے بارے میں چند دن رہنا چاہو تو چلی جانا۔“ پرویز نے جلدی جلدی کہا اور باہر کمر لپکا۔ سدھوراں متحوش سی اس کے پیچھے دوڑی آئی۔

”مم۔۔۔ مگر۔۔۔ پرویز۔۔۔“

”سدھوراں۔۔۔! میرے پاس وقت کم ہے۔۔۔ تو میری فکر نہ کر میں جلدی لوٹ آؤں گا۔“ پرویز اسے تسلی دے کر فوراً گھر سے نکل گیا۔

پرویز کے گھر سے نکلتے ہی سدھوراں بری طرح سسک پڑی۔ اس چانک افتاد پر وہ پریشان ہی نہیں بلکہ انجانے خوف کا بھی شکار ہو گئی تھی۔ وہ اب پرویز کے بغیر خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔

پرویز کو گئے نصف گھنٹہ ہی ہوا ہوگا کہ اچانک باہر پولیس کی گاڑیاں آ کر رکیں۔ ایک موٹا سا پولیس انسپکٹر موہا بل سے اتر ا اور سدھوراں کے گھر کا دروازہ ڈنڈے سے بجایا اور اس وقت تک بجاتا چلا گیا جب تک سدھوراں نے دروازہ نہیں کھول دیا۔ سدھوراں پولیس کو دیکھ کر دہشت زدہ رہ گئی۔ پولیس انسپکٹر بڑی معنی خیر نظروں سے ڈری سہی سدھوراں کو گھومے جارہا تھا۔ یہ وہی انسپکٹر یاور حیات تھا جسے دلدار حسین نے پرویز کو رشوت کے طور پر اپنی بیوی سدھوراں کو اس کے حوالے کرنے کے لیے اکسایا تھا۔ مگر پرویز نے دلدار حسین کو کھری کھری سنا کر چلتا کر دیا تھا تب دلدار حسین نے بدلہ لینے کے لیے پرویز کے ہونٹ سَنَخیہ اڈے میں چھاپہ لگوا دیا تھا۔ اب انسپکٹر یاور حیات سامنے کھڑی ڈری سہی سدھوراں کو دھمکے جارہا تھا لیکن بھلا ہو محلے والوں کا۔۔۔ وہ سب وہاں جمع ہو گئے تھے۔ انسپکٹر

انہیں دوبارہ تنگ کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ یہ دونوں اپنے گھر پہنچے تو پرویز اپنے ہونٹ کی طرف روانہ ہو گیا اور سدھوراں گھریلو امور میں مصروف ہو گئی۔

اس وقت دوپہر کے ڈھائی تین بجے کا وقت تھا۔ سدھوراں گھر کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد نہادھو کر کھانا کھانے بیٹھ گئی۔ پرویز سے اس نے آج جلد گھر آنے کا وعدہ لیا تھا۔ جہاں داد والے مسئلے سے نجات ملنے کی خوشی میں سدھوراں کا آج پہلی بار جی باہر گھومنے کو چاہا تھا۔ اب سدھوراں دوپہر کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد تھوڑا آرام کرنے کے لیے اپنے گھر میں آ کر مسہری پر دراز ہو گئی۔

اچانک اس کے پیٹ میں درد اٹھنے لگا۔ اس درد نے اسے بے حال کر کے رکھ دیا تھا۔ پرویز نے اس کی ضرورت کے پیش نظر گھر میں ایک کارڈیس فون سیٹ لگوا رکھا تھا۔ سدھوراں پہلا فونٹ بھیجے تکایف برداشت کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر پھر جب اس کے لیے ناقابل برداشت ہونے لگا تو مجبوراً وہ گرتی پڑتی فون سیٹ کی طرف گئی اور اس کا اسپیئر آن کر کے پرویز سے رابطہ کیا۔ پرویز اس کے اذیت میں ڈوبے ہوئے ٹوٹے پھوٹے لفظوں کو فوراً سمجھ گیا اور اسی وقت ٹیکسی لے کر گھر پہنچا پھر اسی ٹیکسی میں سدھوراں کو ہسپتال لے گیا۔

گھنٹے بھر کے معائنے کے بعد سدھوراں کو لیڈی ڈاکٹر نے دواؤں کے نسخے اور چند ضروری ہدایات دے کر گھر روانہ کر دیا۔ پرویز نے اسی وقت دوائیں خریدیں اور سدھوراں کو واپس گھر لے آیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے سدھوراں کو آرام کرنے کا بھی مشورہ دیا تھا مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ وہ بالکل چار پائی بی پکڑ لے۔ دراصل اسے بھاری چیزوں کو اٹھانے کی سختی سے ممانعت کی گئی تھی۔

یہ اس سے اگلے روز کا ذکر تھا۔ آج سدھوراں کی طبیعت خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ حسب معمول سدھوراں کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر کچھ دیر کو آرام کرنے کے لیے لیٹ گئی۔ لیکن تو اس کی آنکھ لگ گئی۔ جانے وہ کتنی دیر سوئی تھی کہ اچانک وہ جاگی تو کوئی زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت جلدی میں ہو۔۔۔ دروازے کی پرستار دھڑ دھڑاہٹ سے جانے کیوں اس کا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگا۔ تاہم وہ ابھی ”کمرے سے نکل کر صحن میں آگئی۔ پھر دروازے کے قریب آ کر اس نے آواز دی۔

”کون ہے؟“

”سدھوراں۔۔۔! دروازہ کھولا!“ یہ پرویز کی بوکھلائی ہوئی آواز تھی۔ جسے پہچان کر سدھوراں نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ پرویز حواس باختہ ہو کر اندر آیا۔ اس کے چہرے

یاور حیات کو زیادہ گل کھلانے کا موقع نہ مل سکا تھا اور وہ سدھوراں سے روایتی قسم کے سوالات پوچھنے کے بعد واپس چلا گیا۔

☆=====☆=====☆

ڈاکٹر فوزیہ کا آج ارادہ سدھوراں کے ہاں جانے کا تھا، اس کے لیے اس نے موسیٰ کو تیار کر لیا تھا۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ وہ پہلوان دودھ والے کی بیوی کو بھی ہمراہ لے چلے مگر پھر بعد میں اس نے اسے ساتھ لے جانے کا ارادہ تک کر دیا۔ ابھی وہ موسیٰ کے ساتھ نکلنے لگی تھی کہ اچانک ڈاکٹر جواد احمد کافون آگیا اور اس نے پُرشوخ لہجے میں ”ہیلو“ کہتے ہوئے ڈاکٹر فوزیہ کے کانوں میں کوئی پیغام دیا تو اس کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا پھر اس کے حنائی لبوں پر بڑی دلشیں سی مسکراہٹ ابھری۔ ”اچھا جناب.....! بے صبری ہو رہی ہے..... ابھی تو ایف آر سی ایس کرنا ہے۔“

”یہ تو شادی کے بعد بھی ہوتا رہے گا بلکہ فوزیہ کتنا اچھا لگے گا جب ہم ایک دوسرے کی زندگی کے ساتھی بن کر ایف آر سی ایس کے لیے لندن جا رہے ہوں گے۔“ ڈاکٹر جواد نے چپکٹی آواز میں کہا۔ اس کے لہجے میں خوش آئند مستقبل کی تابندہ امید پنہاں تھی۔

”لو جی شادی کے فوراً بعد کیا پڑھائی میں سرکھپائی کریں گے؟“ ڈاکٹر فوزیہ نے مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا تو ڈاکٹر جواد کی جھنجھلائی ہوئی آواز ابھری۔

”دھت تیرے کی.....! یہ تو میں نے سوچا ہی نہ تھا..... چلو جی پہلے شادی تو کر لیں، باقی پڑھائی کے لیے تو پوری عمر پڑی ہے، بہر حال میرے بزرگ آج تمہارے ہاں آئیں گے اور تم کو دونوں طرف کے بزرگوں کی گفتگو پر کان دھرے رہنا ہوگا بلکہ مجھے پل پل کی خبر بذریعہ فون دینا ہوگی۔“

”جی جناب.....! یہ جاسوسی والے کام بابدولت سے نہیں ہوں گے کیونکہ میں ایک مشرقی لڑکی ہوں۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ پھر مزید چند منٹوں کی پُرشوخ اور ذومعنی گفتگو کے بتادلے کے بعد خدا حافظ پر موقوف ہوئی تو اس کے بعد فوزیہ نے اپنی رست و اوج میں وقت دیکھا۔ صبح کے دس بجے تھے، آج چھٹی کا دن تھا اور مہمانوں کی آمد شام پانچ بجے کے بعد ہی متوقع تھی۔ ڈاکٹر فوزیہ نے موسیٰ کو لیا اور اپنی کار میں سوار ہو کر سدھوراں کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

کوئی گھنٹہ بھر بعد اس کی کار عین سدھوراں کے گھر کے دروازے پر رک گئی۔

ڈاکٹر فوزیہ کا رستہ اتری، دروازے پر جھولتے ٹاٹ کو پرے سرکا کر جب اس نے دستک دینی چاہی تو دروازے کے دونوں پٹ اسے بھڑے ہوئے دکھائی دیئے تاہم پھر بھی ڈاکٹر فوزیہ نے دروازے پر دستک دی مگر جو بابا اندر خاموشی چھائی رہی..... فوزیہ کی پیشانی پر سونیس نمودار ہو گئیں تب وہ دروازہ دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہو گئی، سامنے صحن ویران پڑا تھا، وہی بھی اندر آگئی۔ فوزیہ متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھنے لگی پھر اس نے دو تین مہینے سدھوراں کو پکارا مگر جواب نہ دار..... اب تو فوزیہ کا ماتھا ٹھکا اور اسے تشویش ہونے لگی کہ آخر سدھوراں کدھر گئی..... اس نے سارے کمرے دیکھ ڈالے تھے۔ دروازہ بھی کھلا پڑا تھا۔ پریز کے معمولات کے بارے میں تو فوزیہ یہ جانتی تھی کہ وہ اس وقت اپنے ہوٹل پر ہوگا مگر سدھوراں کو گھر میں ہی موجود ہونا چاہئے تھا پھر اس خیال کے تحت کہ کہیں سدھوراں پڑوس میں کسی کے ہاں نہ گئی ہو، اس نے موسیٰ کو پاس پڑوس کے چند گھروں میں سدھوراں کو دھونڈنے کے لیے بھیج دیا۔

پھر جب موسیٰ نے آکر اپنا سرفی مہں ہلاتے ہوئے اطلاع دی کہ سدھوراں پڑوس میں بھی نہیں ہے تو ڈاکٹر فوزیہ کو تشویش لاحق ہونے لگی..... پورا گھر خالی تھا، بھائیں بھائیں کرتے کمرے، سائیں سائیں کرتا صحن.....

پھر اسی دوران محلے کی دیگر عورتیں بھی آکر وہاں جمع ہو گئیں یوں یہ بات آگ کی طرح چورے محلے میں پھیل گئی کہ سدھوراں پُراسرار طور پر غائب ہو چکی ہے۔

☆=====☆=====☆

مردود اور دعا باز گاتریا کو جھونپڑی سے باہر آتا دیکھ کر سارنگ فوراً ادور ذرا کھجوروں کے جھنڈ میں جا بکا اور منخوس گاتریا کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا..... رات اپنے جو بن بٹ، چاند تاروں کی طلسماتی روشنی میں سارنگ نے جیوش بابا کی جھونپڑی کی طرف دیکھا اسے گاتریا باہر نکلتا ہوا دکھائی دیا، اس کے کاندھے پر ایک نسوانی وجود پڑا ہوا تھا، یہ رکمنی نمائے ہوش.....! سارنگ نے غصے سے دانت بھینچ لئے، وہ سمجھ گیا کہ اب یہ منخوس بھابی نہ اس کی طرف اس معصوم رکمنی کا بھی یہی حشر کرے گا..... گاتریا نے باہر آ کر دائیں بائیں دیکھا شاید وہ جیوش بابا کے سیوک کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اسے کیا معلوم تھا کہ وہ سیوک اس کی موت بن کر ذرا فاصلے پر گھات لگائے بیٹھا ہے، بہر طور گاتریا نے اسے اٹل خاص اہمیت نہ دی اور اپنی سائنڈنی کی طرف بڑھا، پہلے بے ہوش رکمنی کو اس پر لا دالہ بعد

میں خود بھی سوار ہو گیا پھر اس کی رسی تھامتے ہوئے اسے ڈنکارا..... رات کے پُر مہر سنانے میں ساندنی آگے بڑھنے لگی..... سارنگ کا دل کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا، گاتریا کو دیکھ کر جیسے اس کے سینے میں آتش انتقام یکدم شعلہ فشاں ہونے لگی تھی، اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

ساندنی اب کھجوروں کے جھنڈ کے بالکل نزدیک آچکی تھی پھر وہ اس کے قریب سے گزرنے لگی جیسے ہی ساندنی قریب آئی، سارنگ اپنی جگہ سے شکاری بھیڑیے کی طرح کھڑا اور گاتریا پر چھلانگ لگا دی، دونوں ریت پر آگرے، ساندنی ایک طرف کو کھڑی ہو گئی رکنی کا بے سدھ وجود ہنوز اس کی چوڑی پشت پر لدا ہوا تھا۔ گاتریا بھی کم طاقتور نہ تھا، ریت پر گرتے ہی ساندنی کی سی پھرتی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا، اب سارنگ اور گاتریا آئے سامنے ایک دوسرے کو خوں فشاں نظروں سے گھور رہے تھے..... گاتریا، سارنگ کو نہیں پہچان پایا تھا مگر وہ اسے جیوش بابا کے سیوک کے طور پر ضرور پہچانتا تھا۔

”تیری یہ ہمت.....؟ تُو نے..... تُو نے مجھ پر.....!“ گاتریا کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے کیونکہ اگلے ہی لمحے سارنگ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ چپتے کی طرح اس پر چھپا..... گاتریا، سارنگ کے مقابلے میں بہت منحنی سا تھا مگر قد کا لمبا تھا..... وہ دھڑ سے ریت پر گرا اور سارنگ اس کے سینے پر سوار ہوتے ہوئے غرا کر بولا۔

”مجھے پہچان مردود دعا باز گاتریا.....! میں وہی ہوں جس کی بھابی اور اس کے معصوم بچے کو تو دھوکے سے صحرائے تھر سے یہاں لے آیا تھا اور جانے اب تک تُو کتنے انسانوں کو بے گھر کر چکا ہوگا۔“

سارنگ کی بات سن کر ایک لمحے کو گاتریا ششدر رہ گیا اور اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرائے مگر پھر دوسرے ہی لمحے جان بچانے کی لگن خوف پر غالب آگئی اور وہ کسی صحرائی لومڑی کی طرح سارنگ کے نیچے سے تپ کر نکلا اور پھرتی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا، پھر اس نے اپنی شلو کا نمائش کے اندر سے تیز چمکدار قرولی نکالی مگر سارنگ اس بے رحم ہتھیار سے ذرا بھی خائف نہ ہوا تھا لیکن وہ محتاط ضرور ہو گیا تھا۔ گاتریا نے اپنے حلق سے وحشیانہ چیخ نکالی اور قرولی ہاتھ میں تو لے سارنگ پر چھپا..... جیسے ہی گاتریا اس پر چھپا، سارنگ بے سرعت ایک طرف ہٹ گیا اور اس نے ذرا جھک کر گاتریا کے قرولی والے ہاتھ کو پکڑ لیا اور اب اسے مروڑنے لگا..... سارنگ کو اب صحیح معنوں میں مردود گاتریا کی طاقت کا اندازہ ہوا..... وہ منحنی جسم ضرور تھا مگر کمزور بہر حال نہیں تھا، گاتریا نے زور کا گھٹنا سارنگ

کے پیٹ میں جڑ دیا، سارنگ تکلیف کی شدت سے کراہ اٹھا۔

گاتریا نے سارنگ کو سنبھلنے کا موقع دینے بغیر اسے دھکا دیا..... بد قسمتی سے سارنگ کے قدم لڑکھڑا گئے اور وہ پشت کے بل ریت پر جا گرا اور یہی گاتریا چاہتا تھا..... سارنگ کو چاروں شانے چت گرتے دیکھ کر وہ اپنے دائیں ہاتھ میں قرولی تولتا ہوا سیدھا سارنگ کے اوپر آ رہا تھا سارنگ موت کا خطرہ بھانپتے ہی یکدم ایک طرف کو لوٹ لگا چکا تھا، گاتریا دھپ سے ریت پر گرا تو سارنگ تڑپ کر پھرتی اٹھا اور گاتریا کے اوپر جا پڑا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے..... گاتریا کی انتہائی کوشش یہی تھی کہ کسی طرح تیز دھار قرولی سارنگ کے وجود میں پست کر کے اسے گھائل کر دے مگر سارنگ نے اسے موقع نہیں دیا تھا، اس نے گاتریا کا قرولی والا ہاتھ دبوچ رکھا تھا۔

اچانک ایک موقع پر سارنگ نیچے آ گیا اور گاتریا پھر اس کے سینے پر سوار ہو گیا، اب گاتریا اپنے وجود کی پوری طاقت سے قرولی کو سارنگ کے سینے میں گھونے کی کوشش کر رہا تھا، سارنگ نے اللہ کا نام لیا اور اپنے جسم کی پوری قوت اپنے ایک بازو میں جمع کرتے ہوئے گاتریا کے قرولی والے ہاتھ کو سینے سے پرے کر دیا اور پھر ایک بھر پور گھونسا گاتریا کے چہرے پر جڑ دیا، گاتریا کے حلق سے کراہ آمیز چیخ خارج ہو گئی اور یہی وہ موقع تھا جب سارنگ نے لینے لینے گاتریا کے ہاتھ سے قرولی جھپٹ لی پھر ایک لات سے گاتریا کو پرے اچھال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”گاتریا.....! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ سارنگ قرولی کو اپنے دائیں ہاتھ میں تولتے ہوئے قہر آلود لہجے میں غرایا۔ گاتریا نے اچانک قریب کھڑی ساندنی کی طرف دوڑ لگائی مگر سارنگ اب اس زندہ چھوڑنے والا کہاں تھا، اس نے وہیں سے زقند بھری اور فرار ہوتے ہوئے گاتریا کی پشت میں تیز دھار قرولی اتار دی۔ رات کے دم بخود سنانے میں گاتریا کے حلق سے ابھرنے والی چیخ بڑی ہولناک تھی..... سارنگ پر جیسے جنون سوار تھا، اس نے قرولی اس کی کمر سے کھینچ کر دوبارہ گھونپ دی، اس بار گاتریا تورا کر ریت پر گرا اور گرتے ہی جھنڈا ہو گیا اسی لمحے سارنگ ساندنی کی طرف متوجہ ہوا، جس کی کمر پر بے ہوش رکنی لدی ہوئی تھی..... سارنگ اپنے بدترین دشمن گاتریا کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اب خود کو ہلکا چھکا محسوس کرنے لگا تھا، اس نے سب سے پہلے رکنی کے بے ہوش وجود کو فریدو کے پاس پہنچایا جو قریب ہی ڈھینگروں اور جھنگروں میں دودن سے سارنگ کی ہدایت کے مطابق چھپا بیٹھا تھا..... سارنگ نے رکنی کو وہاں چھوڑا، فریدو کو گاتریا کے مرنے کی خوشخبری سنائی جسے سن کر فریدو بہت خوش ہوا کیونکہ یہ منحوس گاتریا ہی تھا جس کی وجہ سے یہ

کمرے کے اندر روشنی ہونے کا مطلب یہ تھا کہ کوئی اندر جاگ رہا تھا..... سارنگ اگرچہ کسی خیال کے تحت تھوڑا سا ٹھکا ضرور تھا مگر اس نے اپنی گرہ پیش قدمی ترک نہیں کی تھی، وہ بدستور آگے بڑھ رہا تھا اور پھر جیسے ہی وہ روشن دان کے نیچے سے دبے پاؤں گزرنے لگا تو اچانک اس کی ٹھنکی ہوئی سماعتوں میں کسی کے سسکنے کی آواز سنائی دی..... سارنگ کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور اس کے قدم جیسے زمین نے پکڑ لئے، اس نے کھڑے کھڑے سر اٹھا کر روشن دان کی طرف دیکھا، وہ اس کے سر سے زیادہ اونچا نہ تھا، سارنگ خاموشی سے مگر بغور کھڑا رونے کی آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگا، اچانک اسے احساس ہوا کہ یہ آواز غیر مانوس نہ تھی، پہلا خیال جو اس کے دل میں آیا وہ بد نصیب بھابی اللہ وسائی کا تھا پھر دوسرے ہی لمحے سارنگ کو ایک ننھے معصوم بچے کے بھی رونے کی آواز سنائی دی تو یکدم اس کا دل دکھ سے بھر گیا، اس کا دل صاف گواہی دے رہا تھا کہ اندر وہ دونوں بد نصیب موجود تھے۔

☆=====☆=====☆

چاچا سکھیو کے بہیمانہ قتل کے بعد ملوکاں، میراں اور بیوہ چاچی کے دلوں میں گہرے غم و اندوہ کے ساتھ ایک انجانے قسم کے خوف نے بھی گھر کر لیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ چاچا سکھیو کی طبعی موت نہیں ہوئی تھی بلکہ اسے قتل کیا گیا تھا اور قاتل ہونے کا شک سیدھا خالقو پر جا رہا تھا بلکہ اب تو یہ شک اس وقت یقین میں بدل چکا تھا جب ملوکاں نے غم، اندوہ کا طوفان تھمنے کے بعد چاچی اور میراں کو یہ بتایا کہ مرتے وقت چونکہ ملوکاں، چاچا سکھیو کے قریب تھی اس نے ٹوٹے ہوئے لفظوں میں بمشکل یہ بتایا تھا کہ اسے قتل کرنے والا اور کوئی نہیں خالقو ہے۔ ویسے بھی اگر چاچا سکھیو مرتے وقت یہ نہ بھی بتاتا تو بھی حالات اور قرآن سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس بد نصیب بوڑھے کو قتل کرنے کا جرم خالقو کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔

ملوکاں ہوں تو اس اچانک غم زدہ حالات یا ناگہانی افتاد پر ایک لمحے کو غم صم ہو گئی تھی لیکن پھر جب سکھیو چاچا کے الفاظ اس کے کانوں میں کوٹنے لگتے تو اس کی جلتی سلگتی آنکھوں میں اپنے بے غیرت اور خود غرض بھائی خالقو کا مکروہ چہرہ رقص کرنے لگتا تھا تب ملوکاں کے اندر باغیانہ خیالات نے پوری شد و مد کے ساتھ سر اٹھانا شروع کر دیا، وہ جان گئی تھی کہ اسے کمزور اور بے سہارا کیا جا رہا تھا تا کہ اسے بآسانی اپنے مفادات کی سولی پر

لوگ خجل خوار ہوتے ہوئے کہاں سے کہاں آگئے تھے، اب صرف بھابی اللہ وسائی اور اس کے بچے کو رام دیال کی قید سے رہائی دلانا تھی لہذا سارنگ نے فرید کو ہوشیار بیٹھے رہنے کی تاکید کی اور پلٹا پھر سب سے پہلے اس نے گاتریا کی لاش کو دو رویرانے میں پھینک دیا تاکہ گدھ اور دوسرے صحرائی جانور اس کی لاش کو چٹ کر جائیں..... سارنگ اب راتوں رات ہی یہ سارے کام نمٹا دینا چاہتا تھا اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ قسمت بھی اس کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی..... سارنگ نے خون آلود قرولی کو اپنی نمیض کے اندر چھپا لیا اور سانڈی پر سوار ہو کر آبادی کی طرف روانہ ہوا، وہ اب رام دیال کی حویلی پہنچ کر ایک آخری فرض نمٹانا چاہتا تھا یعنی بھابی اللہ وسائی اور اس کے ننھے بچے منٹھا رکورام دیال کی قید سے آزادی دلانا۔ اس کے بعد سارنگ کا ارادہ ان کو سب کو لے کر اپنے دیس، اپنی دھرتی صحرائے تھرتی طرف کوچ کر جانا تھا۔

تھوڑی دیر بعد سارنگ آبادی میں داخل ہو چکا تھا، ماحول پر مہیب سناٹا طاری تھا، کچی، کچی گلگیاں ویران تھیں، فرید نے سارنگ کو پہلے ہی سے رام دیال کا حویلی نما مکان دکھا رکھا تھا لہذا سارنگ کو رام دیال کا مکان ڈھونڈنے میں زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

رام دیال کا یہ حویلی نما بڑا سا مکان گلی کے آخری سرے پر اور ذرا الگ تھلگ واقع تھا، سارنگ سانڈی کو مکان کے قریب لے آیا پھر اس کی پشت سے اتر کر مکان کے محل وقوع کا جائزہ لینے لگا، مکان زیادہ وسیع اراضی پر پھیلا ہوا نہیں تھا البتہ دو منزلہ تھا، سارنگ نے باریک بینی سے مکان کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ مکان کی چہار دیواری جو غالباً احاطے کے طور پر مستعمل تھی، زیادہ اونچی نہیں تھی پس سارنگ نے فوراً حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا اور سانڈی کی پشت کو پیار سے تھپک کر اسے وہیں موجود رہنے کا اشارہ کیا اور مکان کے عقب میں آگیا..... یہاں اسے دیوار ذرا سلین زوہ محسوس ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ دیوار کے عین اوپر بلندی پر پانی کی ٹنکی تھی اور پائپ لائنیں اوپر سے نیچے آ رہی تھیں، سارنگ نے فوراً پائپوں کا سہارا لے کر اوپر چڑھنا شروع کر دیا اور جلد ہی وہ احاطہ نما چہار دیواری پھاند کر اندر کود گیا، اندر مدہم روشنی پھیلی ہوئی تھی، چہار سو دیوانی کاراج تھا، سارنگ اندر کودنے کے بعد چند ٹائپے صحرائی بلے کی طرح دم سادھے دیکر بار پھر جب کوئی مشکوک آہٹ نہ ابھری تو وہ اندرونی دیوار کے ساتھ ساتھ گرہ قدمی سے آگے بڑھنا شروع ہوا، وہ ایک کمرے کی دیوار کے عقب سے گزر رہا تھا، اچانک سارنگ کو اس کمرے کی عقبی دیوار میں بنے روشن دان سے روشنی چھوٹی ہوئی نظر آئی، رات کے اس پہر

”اور تجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں ملوکاں تیرے خلاف قتل کا پرچہ نہ کٹا دے۔“ آچر خان بیجا کر مٹھی میں دبی ہوئی بیڑی کی راکھ جھاڑتے ہوئے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو ہاتھ بونفوں کی طرح اپنا سر ہلا دیا۔

”اڑے بابا جھوکر!.....! تُو نے مجھے کیا ایسے ہی سمجھ رکھا ہے، میرا یہ جو ہوٹل ہے ناں ہر قسم کا آدمی آتا ہے، یہ تھانے کا انچارج بھی اپڑاں یار ہے، پر تیرا جھگی سے غائب رہنا درست نہیں ہے، اس طرح لوگوں کو اور شک ہوگا تُو ابھی واپس چلا جا اور ملوکاں کے تھانے سے لوٹنے کا انتظار کر۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد آچر کچھ سوچتے ہوئے پھر بولا۔ ”بلکہ ناٹو.....! تیرے کو بھی اپڑیں ملوکاں کے ساتھ تھانے جانا چاہئے تھا، پر خیر.....! کوئی بات نہیں.....! اب تُو چلا جا۔“

خالقو نے اثبات میں سر ہلایا اور سیدھا اپنی جھگی کا رخ کیا۔ وہاں پہنچا تو ماں نے اڑاؤ نظر پوچھا۔ ”پٹ.....! کیا کہہ رہا تھا آچر خان.....؟“

خالقو قریب کچھ کھری چارپائی پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”کہہ رہا تھا کچھ نہیں ہوگا، میں ہوں، سنبھال لوں گا، علاقے کے تھانے سے میری جان پہچان ہے۔“

ماں کو تسلی پھر بھی نہیں ہوئی، بولی۔ ”دیکھ لے پٹ.....! پولیس آتی ہے تو کسی کو نہیں پہچانتی اور مار مار کر بھر کس نکال دیتی ہے۔“

خالقو کو ماں کی بات پر ایک دم غصہ آ گیا۔ ”تو اور کہا کروں میں..... بھاگ جاؤں گھر سے تاکہ پولیس کو مجھ پر پکا شک ہو جائے۔“

ماں سہم کر چپ ہو رہی..... آچر خان سے ملاقات کے بعد خالقو کی جو تھوڑی بہت پریشانی کم ہوئی تھی، اب ماں کی باتوں سے پھر سوا ہونے لگی۔ خاصی دیر بعد باہر شور سنائی دیا، لوگوں کی باتوں کے علاوہ کسی گاڑی کے انجن کی گھر گھر ابٹ بھی اس میں شامل تھی، خالقو جلدی سے اٹھا، اچانک جھگی کا ناٹ پرے سرکا اور دو پولیس والے اندر داخل ہوئے، انہوں نے جھکڑیاں تھام رکھی تھیں۔

”تمہیں سکھو کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔“ ایک پولیس والے نے آگے بڑھ کر کہا اور اسے آہنی زیور پہنا دیا۔ قریب کھڑی عجیبیاں نے اپنا سینہ پیٹ ڈالا۔

قصہ کوتاہ وہی ہوا جس کا ذکر تھا، ملوکاں نے تھانے جاتے ہی اپنے بھائی خالقو کے خوف قتل کی رپورٹ درج کروادی تھی اور متعلقہ تھانے کے انچارج انسپکٹر جھٹل شاہ نے نہ وقت خالقو کی گرفتاری کے احکامات جاری کر دیئے تھے، اسے لاک اپ کر دیا گیا تھا۔

چڑھایا جاسکے..... وہ خوب جانتی تھی کہ پہلے اس کے باپ کو ذہنی مرض میں مبتلا کر کے اس کا نفسیاتی قتل کیا گیا اور اب چاچا سکھو کو بھی قتل کر ڈالا، ملوکاں یہ بھی خوب جانتی تھی کہ خالقو یہ سب آچر خان کی ملی بھگت سے کرتا آ رہا تھا، ان شوریدہ خیالات نے ملوکاں کے اندر آگ سی بھردی۔ سانول اور ماما اللہ رکھو کو بھی چاچا سکھو کے قتل کی اطلاع مل چکی تھی..... ملوکاں نے پھر گوٹھ والوں کے مشورے کے مطابق تھانے میں اس بہیمانہ قتل کی رپورٹ درج کروانے کی ٹھانی تو اس کی ماں عجیبیاں مائی اور بھائی خالقو پریشان نظر آنے لگے کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ کہیں ملوکاں تھانے میں خالقو کا نام نہ لے دے اور اس وقت خالقو مزید پریشان ہو گیا جب ملوکاں گوٹھ کے دیگر معتبر لوگوں کے ساتھ تھانے جانے لگی تو اس نے جاتے جاتے خالقو کو شعلہ بار نظروں سے گھورا۔

”پپ..... پٹ..... خالقو.....! تت.....! تُو بھاگ جا، مجھے تو لگتا ہے کہیں ملوکاں پولیس میں تیرے خلاف پرچہ نہ کٹا دے۔“ ملوکاں اور دیگر لوگوں کے تھانے روانہ ہوتے ہی جب دونوں ماں، بیٹا اپنی جھگی میں داخل ہوئے تو مائی عجیبیاں نے تشویش زدہ لہجے میں خالقو سے کہا۔

”ٹھیک ہے امڑ.....! میں ابھی سیدھا آچر خان کے ہوٹل جاتا ہوں، اب میرے لیے وہی کچھ کر سکتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ سیدھا آچر خان کے ہوٹل پہنچا۔

”کیوں ڈرے تُو بڑا پریشان نظر آ رہا ہے، بھلا اب پریشانی کیسی.....؟“ آچر خان نے اسے دیکھتے ہی معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔

وہ دونوں حسب معمول ہوٹل کے اندرونی الگ تھلگ گوشے میں کھجور کی چٹائی پر بیٹھے تھے..... آچر خان کی مٹھی میں بیڑی دبی ہوئی تھی، ایک اس نے خالقو کو بھی خود ہی سلگا کر دی۔

”ہاؤ یار آچر سائیں.....! پریشانی کی بات تو ہے اسی لئے تو میں تیرے پاس دوڑا چلا آیا۔“ خالقو نے بیڑی کا طویل کش لے کر کہا اور پھر اپنی پریشانی کی اصل وجہ بتاتے ہوئے مزید بولا۔ ”پتہ نہیں آچر سائیں.....! اس بڑھے سکھو کی مرتے وقت کیسے مجھ پر نظر پڑ گئی تھی..... تین گولیاں کھا کر بھی اس کے لاغر جسم میں جان باقی تھی..... جب ملوکاں اسے سنبھالنے جھگی سے باہر آئی تو بڑھے نے مرتے مرتے ملوکاں کے کان میں میرے نام کی سرگوشی کر ڈالی تھی، اب ملوکاں گوٹھ کے چند معتبروں کے ساتھ تھانے میں قاتل کے خلاف پرچہ کٹوانے گئی ہے۔“

”دیکھ دھیئے.....! اب بھی کچھ نہیں بگڑا تو اگر تھا نیدار کو جا کر یہ کہہ دے کہ خالقو بے گناہ ہے تو.....!“

”برگز نہیں ماں.....!“ ملوکاں یکدم ماں کی بات کاٹ کر بولی۔ ”میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میرے بے غیرت بھائی خالقو نے چاچا سکھو کا خون کیوں کیا ہے، اسے اب اپنے کئے کی سزا ضرور ملنی چاہئے..... ماں.....! میں اب تیرے سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی، ٹو چلی جا یہاں سے۔“ بیٹی کی کاٹ دار بے رخی پر مائی عجیباں کے چہرے پر ایک لمحے کوفرت کے تاثرات ابھرے اور پھر وہ اسے گھورتی ہوئی وہاں سے چلی گئی..... اس کے جاتے ہی ملوکاں، بیوہ چاچی اور میراں کو تسلی دینے کی غرض سے اندر کوٹھری میں آگئی۔

☆=====☆=====☆

آچر خان کو خالقو کی گرفتاری کی اطلاع مل چکی تھی اور اب وہ متعلقہ تھانے کے انسپٹر جھٹل شاہ کے کمرے میں موجود تھا۔ ”انسپٹر سائیں! آپ مائی باپ ہو، یہ کیس ادھر ہی ختم کر دو تو میں ساری عمر آپ کی خدمت کرتا رہوں گا۔“ آچر خان نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے سامنے کرسی پر براجمان انسپٹر جھٹل شاہ سے کہا۔ انسپٹر جھٹل شاہ اس کی ”خدمت“ والی بات کا مطلب سمجھ چکا تھا مگر وہ ایک ایماندار اور فرض شناس پولیس افسر تھا چنانچہ وہ آچر خان کے چرنے پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے متانت سے بولا۔ ”آچر خان.....! یہ کوئی جھوٹا موٹا کیس نہیں ہے، قتل کا کیس ہے قتل کا..... جس کی سزا پھانسی ہے یا پھر عمر قید.....!“

”سائیں.....! پیسے سے کیا نہیں ہو جاتا..... آپ کو تمیں.....!“

”آچر خان.....!“ معاً انسپٹر جھٹل شاہ اس کی بات کاٹ کر قدرے کڑک دار لہجے میں بولا۔ ”یہاں پیسہ نہیں چلے گا صرف انصاف چلے گا اور بس.....!“

”کیا ضمانت وغیرہ.....!“

”وہ عدالت میں ہو سکتی ہے کیونکہ یہ قتل کا کیس ہے اور پولیس آلہ قتل بھی برآمد کر چکی ہے۔“

انسپٹر کی بات سن کر آچر خان بری طرح چونک پڑا، وہ اب خالقو کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکا تھا اور پھر اس سے ملاقات کے بغیر وہاں سے چلا آیا، اسے اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ خالقو اب اس کے کام کا آدمی نہیں رہا، اب ملوکاں کو حاصل کرنے کے لیے

ملوکاں کو اب اپنے بھائی خالقو سے نفرت ہوگئی تھی بلکہ وہ تو اپنی ماں سے بھی نفرت کرنے لگی تھی، خالقو کو گرفتار کروانے کے بعد ملوکاں کے اندر کی آگ کچھ ماند پڑی تھی بلکہ اس نے تو اب تہیہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، وہ خالقو کو قتل واقعی سزا دلوا کر رہے گی، وہ جانتی تھی کہ خالقو نے اس کے نئے کھرے کرنے کے لیے ہی سکھو چاچا کو راستے پر سے ہٹایا تھا، اب ملوکاں نے حالات سے ٹکر لینے کی قسم کھا رکھی تھی..... اگرچہ اس کے اس اقدام سے اس کی بیوہ چاچی، میراں اور ماما اللہ رکھو نے بس دکھ کا اظہار کیا تھا، ماما اللہ رکھو تو تھوڑی دیر وہاں رہ کر چلا گیا پھر اس کے جاتے ہی مائی عجیباں روتی بیٹھتی اور اپنی بیٹی ملوکاں کو کوستی ہوئی جھگی میں داخل ہوئی اور قریب کھڑی اپنی بیٹی ملوکاں کو جھنجھوڑتے ہوئے غصے سے بولی۔ ”ٹو کیسی بہن ہے ٹی.....! پڑیں سگے بھائی کو بھی نہیں بخشا تو نے.....! اسے پولیس کے حوالے کر کے ہی چھوڑا، اب مل گئی تیرے کلیجے کو ٹھنڈک.....!“

ملوکاں پر ماں کی گریہ وزاری کا مطلق اثر نہ ہوا، اس نے کسی قدر ناگواری سے ماں کا ہاتھ پرے جھٹکا اور پھر اسے سخت نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ”میں نے جو کیا ہے بالکل صحیح کیا ہے، اس نے چاچا سکھو کا خون کیا ہے بلکہ اس نے اور تو نے مل کر میرے بابا کو بھی دفنی پریشانی میں مبتلا کر کے اس کو مار ڈالا..... تم دونوں ماں، بیٹے لالچ میں اندھے ہو چکے ہو۔“ ادھر بیوہ چاچی اور میراں ایک طرف خاموش کھڑے سسک رہے تھے، اگرچہ انہیں بھی اپنی بھلاؤں کا آنا برا لگا تھا مگر جب ان کی اپنی ہی بیٹی اس کے لتے لے رہی تھی تو ان کا درمیان میں کچھ کہنا عاثر تھا۔

”ماں.....! ٹو یہاں سے چلی جا.....“ ملوکاں نے ناگواری سے اپنا منہ ایک طرف پھیر کر سرد لہجے میں کہا۔

عجیباں تڑ سے بولی۔ ”میں اب کہاں جاؤں..... میرے بگھر و بیٹے کو ٹو نے نیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل ڈالا..... اب میرا کون سہارا بنے گا.....؟“

”تیرا یہ بگھر و بیٹا کتا مٹا کیا تھا ماں جو تجھے اس پر اتنا فخر تھا.....؟“ ملوکاں نے اچانک اس کی طرف دیکھ کر استہزاء سے لہجے میں کہا۔ ”اور جہاں سے وہ تھوڑے بہت روپے لاتا تھا، وہ بھی میں جانتی ہوں اچھی طرح بس ٹو یہاں سے چلی جا ماں.....! اس کہنے بھائی نے ہمارا بھی تو سہارا چھین لیا..... بتا چاچی اور میراں کا اب کیا بنے گا..... ان بے چاریوں کا اب یہی تو سہارا تھا جو تیرے لالچی بیٹے نے چھین لیا۔“ لمحہ بہ لمحہ ملوکاں کے لہجے میں درشت آہیزخی نمود کر آئی تو ایسے میں وہ دونوں ماں، بیٹیاں روتی سسکتی ہوئی اندر کوٹھری میں چلی گئیں۔

اسے خود حرکت میں آنا پڑے گا کیونکہ اب تو چاچا سسکھو بھی اس دنیا میں نہیں رہا تھا البتہ آچر خان، ماما اللہ رکھو اور بالخصوص سانول کی موجودگی سے ضرور کھٹک رہا تھا۔

☆=====☆=====☆

انسپکٹر یاور حیات کے اپنی پولیس پارٹی کے ساتھ واپس لوٹتے ہی سدھوراں کے گرو محلے کی چند ہمدرد عورتوں کا ہنگامہ سا لگ گیا، وہ اس سے طرح طرح کے سوالات پوچھنے لگیں مثلاً پولیس کیوں آئی تھی؟ کیا پرویز کو گرفتار کرنا چاہتی تھی؟ مگر سدھوراں کے پاس ان کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا، وہ بے چاری مزید پریشان ہو گئی تو اس نے ان عورتوں سے نہایت عاجزی کے ساتھ اسے تنہا چھوڑ دینے کی درخواست کی پھر ذرا ہی دیر بعد سدھوراں تنہا رہ گئی اور اپنے کمرے میں آکر رونے لگی، وہ بری طرح پریشان تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب کیا کرے..... پرویز مفروضہ تھا اور پولیس اس کے تعاقب میں تھی، خود سدھوراں جانتی تھی کہ بقول اس کے شوہر پرویز کے یہ ساری کارستانی اس کے دوست دلدار حسین کی تھی کیونکہ پرویز نے اس کی ایک شرمناک ترغیب پر اسے بے عزت کر کے اپنے گھر سے نکالا تھا اور وہ خطرناک نتائج کی دھمکی دے کر چلا گیا تھا۔

اسے پرویز کی فکر تھی سو تھی مگر اب تو اسے اپنی اور اپنے ہونے والے بچے کی بھی فکر زیادہ ستا رہی تھی..... اچانک اسے اپنی محسنہ عظیم ڈاکٹر فوزیہ کا خیال آیا تو اس کے اندر چھائی مایوسیوں کی تاریکی چھٹنے لگی، اس نے اسی سے ڈاکٹر فوزیہ سے ملاقات کرنے کی ٹھانی، دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی..... وہ چونک گئی پھر کمرے سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھی، کھولنے سے پہلے اس نے ذرا بلند آواز سے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”بھابی!..... میں ہوں دلدار حسین.....!“ دوسری طرف سے آواز ابھری جسے پہچان کر سدھوراں پہلے تو ڈری گئی مگر پھر دوسرے لمحے اس کے چہرے پر نفرت سی کھنڈ آئی اور پھر جواہر اسی لہجے میں بولی۔

”تم دفع ہو جاؤ یہاں سے بد معاش!..... ورنہ میں ابھی شور مچا کر محلے والوں کو اکٹھا کر لوں گی۔“

”بھابی!..... آپ مجھے غلط نہ سمجھیں، مجھے جیسے ہی پتہ لگا کہ پرویز کے ہوٹل پر پولیس نے چھاپہ مارا ہے اسے گرفتار کرنے کے لیے تو میں.....“

”تم نے تو اپنی دشمنی نکال لی نا.....! پولیس والوں کے ساتھ سازش کر کے اب

میں کیا لینے آئے ہو؟“ سدھوراں نے اس کی بات کاٹ کر غصیلے لہجے میں کہا۔

دوسری طرف سے دلدار کی نہایت شستہ آواز ابھری۔ ”بھابی!..... میں پھر یہی کہوں گا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، دوستوں میں لڑائی ہوتی رہتی ہے، میں وہ بات کب کا بھول گیا ہوں، میں تو اس لئے آیا تھا کہ پرویز بھائی کی ضمانت قبل از گرفتاری ہو جائے، میں نے اس سلسلے میں علاقے کے بڑے پولیس افسر سے بھی بات کی تھی مگر جیسے آپ کی مرضی بھابی!.....! میں چلا جاتا ہوں۔“ دلدار نے بڑی مکاری سے کہا تو سدھوراں کے چہرے پر پہلی بار تذبذب کے تاثرات ابھرے۔ اس وقت وہ ایسے نازک حالات سے دوچار تھی کہ اسے نکلے کا سہارا بھی بہت معلوم ہو رہا تھا، اس بے چاری کو صحیح اور غلط کی بھی پہچان نہیں رہی تھی، یہی سبب تھا کہ وہ مکار دلدار حسین کے جھانسنے میں آگئی اور اسے جاتا پا کر جھٹ سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے اس کی نگاہ پڑی، دلدار واپس لوٹ رہا تھا، ایسے میں وہ واپس لوٹا ہوا سدھوراں کو بے ضرر اور بے قصور محسوس ہوا، اس نے بے ساختہ اسے آواز دے ڈالی۔

”دلدار بھائی!.....! ذرا رکنا!.....!“

دلدار رک گیا پھر لوٹ کر دروازے کے قریب آیا، اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔

”تت..... تم کسی ضمانت کی بات کر رہے تھے؟“ سدھوراں نے کھلے دروازے کی پونکٹ پر کھڑے کھڑے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں بھابی!.....! دراصل میں چاہتا ہوں اگر پرویز بھائی کی گرفتاری سے پہلے اس کی ضمانت ہو جائے تو بہتر رہے گا ورنہ اگر خدا نخواستہ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا تو بعد میں پرویز کو چھڑانے میں بڑی مشکل پیش آئے گی۔“ دلدار نے چالاکی سے کہا۔

سدھوراں کو اپنی حالت کے پیش نظر زیادہ دیر کھڑے ہونے میں تقاہت سی ہو رہی تھی، اس نے دلدار سے قدرے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بھائی! اندر آ جاؤ، مجھے کھڑے ہونے میں دقت ہو رہی ہے۔“ سدھوراں یہ کہہ کر اسے اندر آنے کا راستہ دینے کی غرض سے پٹنی تو دلدار اپنی کامیابی پر مسرور مسرور سا اندر داخل ہوا اور عقب میں دروازہ کو کھنڈی لٹکانے کی بجائے اسے صرف بھیڑ دیا۔

”بھابی!.....! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے، مجھے آپ ذرا بیمار سی نظر آرہی ہیں؟“ شخص میں آکر دلدار نے اپنے لہجے میں مکارانہ ہمدردی سموتے ہوئے پوچھا ”تم سدھوراں کو اس حالت میں دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک لمحے کو عجیب سے الجھن آمیز

ہدایت تھا اور تیاری کے آخری مراحل میں تھا، سدھوراں کی بے چینی اس دیران اور دور
ہے غلطی کو دیکھ کر مزید سوا ہونے لگی، اس کے خیال کے مطابق کمشنر صاحب کا دفتر کسی
معروف اور بارون علاقے میں ہونا چاہئے تھا۔

”دلدار بھائی.....! کمشنر صاحب کا آفس ادھر ہے.....؟“ بالآخر اس نے پوچھ لیا۔
دلدار نے جواباً کہا۔ ”ہم کمشنر صاحب کے دفتر نہیں ان کی رہائش گاہ کی طرف۔
جا رہے ہیں کیونکہ اپنے دفتر میں وہ بہت مصروف ہوتے ہیں۔“

دلدار کی بات سن کر وہ خاموشی ہو گئی مگر دل اس کا ہنوز بے چینی میں مبتلا تھا پھر ایک
پش بنگلے کے سامنے دلدار نے ٹیکسی والے کو روکنے کا کہا۔

پھر ٹیکسی کے رکتے ہی دلدار ڈرائیور کو کرایہ ادا کر کے نیچے اتر آیا اور اس دوران
سدھوراں بھی نیچے اتر آئی، پریشانی نے اس کی طبیعت مزید بگاڑ دی تھی، اس کو اب شدید
فائت محسوس ہو رہی تھی..... ٹیکسی والا چلا گیا تو اچانک ایک پرانے ماڈل کی ایک کار طوفانی
رفتار سے ان کے قریب آ کر چرچراتے ٹائروں کے ساتھ رکی..... سدھوراں اور دلدار
دونوں چونک سے گئے پھر اچانک کار سے تین افراد نمودار ہوئے، ان میں ایک شخص کو دیکھ
کر سدھوراں کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے تاثرات پھیل گئے جبکہ قریب کھڑے دلدار
کے چہرے پر الجھن آمیز پریشانی کے تاثرات نمودار ہو گئے تھے، ان تینوں میں سے وہ
شاسا آدمی پرویز تھا، اس نے ایک قہر بار نظر قریب کھڑے دلدار پر ڈالی اور پھر سدھوراں
کے قریب آ کر بولا۔ ”سدھوراں.....! تو اس مردود کے ساتھ یہاں کیا کرنے آئی
ہے.....؟“

سدھوراں نے اسے اپنے یہاں آنے کا حال بتایا تو پرویز کے چہرے پر درشتی کے
ساتھ اب نفرت بھی عود کر آئی اور وہ آگے بڑھ کر دلدار کا گریبان پکڑتے ہوئے خونخوار لہجے
میں غرا کر بولا۔ ”رذیل انسان.....! تجھے جرات کیسے ہوئی میری بیوی کو یہاں لانے کی
بول.....؟“

دلدار، پرویز کو اچانک دیکھ کر بری طرح بوکھلا گیا تھا مگر اس کے جواب دینے سے
پیشانی قریب کھڑی سدھوراں نے اپنے شوہر سے کہا۔ ”پرویز.....! دلدار بھائی کو غلط مت
سمجھو، یہ تمہاری ضمانت کے لیے مجھے یہاں.....!“

اچانک پرویز نے سدھوراں کی بابت کانتے ہوئے درشت لہجے میں اس سے کہا۔
”سدھوراں.....! یہ ذلیل آدمی تجھے دھوکے سے یہاں لایا ہے، یہ بنگلہ کمشنر کا نہیں ہے بلکہ

تاثرات پھیل گئے تھے مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ہونٹ بھیجنے کر معنی خیز انداز میں
ہولے سے اپنے سر کو جنبش دی۔ پھر سدھوراں اسے اندر کمرے میں لے جا رہی تھی مگر دلدار
بچکپاتے ہوئے بولا۔ ”بھ..... بھابی.....! میں ادھر ہی ٹھیک ہوں اور زیادہ دیر رکا بھی نہیں
چاہتا۔“

”مم..... مگر تم تو ضمانت کی بات کر رہے تھے؟“ بے چاری سدھوراں اچانک
پریشان سی نظر آنے لگی۔

”ہاں.....! اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ ہمیں ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں کرنی
چاہئے۔“ دلدار نے مکاری سے کہا۔ ”پرویز بھائی کی ضمانت کے لیے میرے ساتھ آپ کا
بھی چلنا ضروری ہے۔“
”میرا چلنا.....؟“

”ہاں بھابی.....! ہم کسی پولیس افسر سے ملنے تھوڑی جا رہے ہیں، یہ تو حرام خور
ہیں، میں شہر کے کمشنر کے ہاں تمہاری فریاد لے جانا چاہتا ہوں..... تم خود چلو گی تو اس پراڑ
پڑے گا کیونکہ کمشنر صاحب نرم دل کے ہمدرد آدمی ہیں۔“ دلدار نے اسے سمجھاتے ہوئے
کہا اور سدھوراں..... بے چاری تذبذب کا شکار ہو گئی۔ موجودہ حالات نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا
تھا، اسے کچھ سمجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کیا کرے، ہر قدم انجامانے اندیشوں کا راہی معلوم
ہوتا تھا مگر..... نہ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہنے سے مزید پریشانی بڑھ سکتی تھیں، وہ دلدار پر بھروسہ
نہ کرتی تو پھر کیا کرتی.....؟ ایسے حالات میں اچھے بھلے آدمی کی عقل خبط ہو کر رہ جاتی ہے اور
سدھوراں تو پھر صنف نازک تھی، اس نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر چادر اوڑھی اور دلدار کے
ساتھ چل دی، اسے دروازے پر تالا لگانے کا بھی خیال نہ رہا تھا۔

دلدار نے ٹیکسی کر لی تھی..... سدھوراں عقبی سیٹ پر براہمان تھی اور دلدار ٹیکسی
ڈرائیور کی براہروی سیٹ پر..... سدھوراں، دلدار کے ساتھ چلی تو آئی تھی مگر اب اس کا دل
بری طرح گھبرا رہا تھا۔ سدھوراں کا دلدار کے ساتھ گھر سے نکلنے کا یہ وہ وقت تھا جب اس
کے جانے کے ٹھیک ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر فوزیہ، موسیٰ کے ساتھ سدھوراں کے گھر پہنچی تھی تو
اسے خالی گھر بھائیں بھائیں کرتا ملا تھا۔

ٹیکسی سبک رفتاری سے دوڑی چلی جا رہی تھی اور سدھوراں عقبی سیٹ پر شدید
گھبراہٹ اور پریشانی کا شکار تھی، تقریباً نصف پون گھنٹے تک ٹیکسی معروف شاہراہوں
کا مزین رہنے کے بعد اچانک ایک پوش علاقے میں آ گئی، یہ نئی رہائشی اسکیم کا کوئی زیریں

اس عیاش آدمی انسپکٹر یاور حیات کا عشرت کدہ ہے۔“

پرویز کی بات سن کر سدھوراں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی اور پھر اچانک اسے چکر آ گیا۔ وہ بے اختیار اپنا سر پکڑ کر غش کھانے کے انداز میں ڈرائز کھڑا سی گئی۔ پرویز نے دلدارہ گریبان چھوڑا اور سدھوراں کو سنبھالنے کے لیے لپکا، ادھر دلدارہ نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک جانب دوڑ لگا دی۔ پرویز غش کھاتی سدھوراں کو تھمتے ہوئے چیخ کر اپنے دونوں ساتھیوں سے بولا۔ ”اس مردود کا پیچھا کرو۔۔۔۔۔۔ یہ جانے نہ پائے۔“

اس کا حکم سنتے ہی اس کے دونوں ساتھی فوراً دلدارہ کو پکڑنے کے لیے دوڑ پڑے، ادھر سدھوراں بے ہوش ہو کر پرویز کی بانہوں نے جھول چکی تھی۔

☆=====☆=====☆

ڈاکٹر فوزیہ، سدھوراں کو گھر پر غیر موجود پا کر بری طرح پریشان تھی، اس نے وہاں محلے کی عورتوں سے بھی سدھوراں کے متعلق پوچھنے کی کوشش کی مگر سب نے لاعلمی کا ہی اظہار کیا تھا البتہ ایک عمر رسیدہ عورت نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے اسے بتایا۔ ”سدھوراں آج کل اپنے شوہر پرویز کے ساتھ کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس معائنے کے لیے جاتی رہتی تھی، ہو سکتا ہے وہ اس وقت بھی وہیں گئی ہو۔“

ڈاکٹر فوزیہ نے اس سے اس لیڈی ڈاکٹر کے کلینک یا میٹرنی ہوم کے بارے میں بھی پوچھا مگر اس نے لاعلمی کا اظہار کیا پھر ڈاکٹر فوزیہ خاصی دیر تک وہاں انتظار کرنے کے بعد موسیٰ کے ساتھ اپنی کار میں آ بیٹھی۔ اس کا ارادہ پولیس کو اطلاع کرنے کا تھا چنانچہ اس نے کار میں بیٹھتے ہی اپنے پرس سے موبائل نکالا اور انسپکٹر مشتاق احمد کے نمبر چیخ کرنے لگی، تھوڑی دیر بعد رابطہ ہوتے ہی ڈاکٹر فوزیہ نے ششہ لہجے میں کہا۔ ”انکل۔۔۔۔۔۔ آداب! میں ڈاکٹر فوزیہ بات کر رہی ہوں۔“

دوسری طرف سے جواباً انسپکٹر مشتاق احمد شفیق لہجے میں بولے۔ ”ہاں بیٹی فوزیہ! خیریت تو ہے کیسے فون کیا۔؟“

ان کے استفسار پر ڈاکٹر فوزیہ نے سدھوراں کی پراسرار گمشدگی کے متعلق انہیں آگاہ کیا تو وہ چند ثانیے پر سوچ خاموشی کے بعد بولے۔ ”ٹھیک ہے، اگر تمہیں کسی قسم کے اغوا کا شک ہو رہا ہے تو میں ابھی کارروائی کا آغاز کرتا ہوں اور ساتھ ہی متعلقہ تھانے سے بھی رابطہ کرتا ہوں۔“

”جی بہت بہتر۔۔۔۔۔!“ ڈاکٹر فوزیہ نے کہا اور پھر موبائل آف کر کے دوبارہ اسے پرس میں ڈال لیا اور اپنی کار اشارت کر کے آگے بڑھا دی۔ اب وہ سدھوراں کے شوہر پرویز کے ہوٹل کی طرف گامزن تھی۔

سارے راستے اس کے دماغ میں سدھوراں سے متعلق پریشان کن اور وسوسہ انگیز خیالات گردش کرتے رہے، وہ سوچ رہی تھی آخر سدھوراں یوں اچانک کدھر غائب ہو گئی تھی۔ اس کی حالت ایسی تو نہیں تھی کہ وہ کہیں آجاسکتی۔۔۔۔۔۔ پھر اچانک اسے اس وڈیرے جہاں داد کا خیال آیا، کہیں اس نے تو سدھوراں کو نہیں اٹھوایا۔؟ یہ متحوش سا خیال آتے ہی وہ کانپ سی گئی مگر پھر فوراً ہی اسے خیال آیا کہ انسپکٹر مشتاق احمد نے جہاں داد کے باپ وڈیرے میر منصب خان سے اس کی ڈیفنس والی شاہانہ کوٹھی میں ملاقات کر کے انہیں تنبیہ کی تھی کہ وہ اپنے اوپاش بیٹے کو قابو میں رکھے۔ یہ تب کی بات تھی جب ڈاکٹر فوزیہ کو جہاں داد نے یرغمال بنانے کی مجرمانہ حرکت کی تھی اور وڈیرے میر منصب خان کی طرف سے معافی طلبی کے بعد یہ معاملہ سرد پڑ گیا تھا، یہی سبب تھا کہ ڈاکٹر فوزیہ کو اپنا یہ خیال بھی رد کرنا پڑا کہ جہاں داد دوبارہ سدھوراں کے ساتھ ایسی کوئی اچھی حرکت کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

انہی پریشان کن خیالات میں جب ڈاکٹر فوزیہ پرویز کے ہوٹل پہنچی جو نرسری میں واقع تھا تو اسے بند پایا۔۔۔۔۔۔ اسے بڑی حیرت ہوئی پھر اس کے بعد وہ پرویز کے گہرے دوست پہلووان دودھ والے کی دکان پر آئی تو اس سے معلوم ہوا کہ پرویز کو پولیس پکڑنے ہوٹل آئی تھی اور اس نے ہی اس کا ہوٹل سیل کیا ہے۔ ڈاکٹر فوزیہ کو پرویز کے ہوٹل پر پولیس چھاپے کی بڑی حیرت ہوئی، وہ سوچنے لگی کہ آخر اس نے ایسا کون سا جرم کیا تھا۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر فوزیہ اب دہری پریشانی کا شکار ہونے لگی، بہر طور وہ کار میں بیٹھی اور اپنی رہائش گاہ پر آ گئی۔

اندر پہنچی تو اسے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر جواد احمد کی امی اور چند دیگر مہمان آئے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر فوزیہ، ڈاکٹر جواد احمد کی والدہ کے آنے کا مطلب بخوبی جانتی تھی مگر اس کے دل دماغ میں سدھوراں کی پریشانی کا غلبہ تھا اور وہ خود کو بہت تھکا تھکا محسوس کر رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

مختلف حالات کے پیش نظر ”بڑوں“ میں طے پایا کہ سروسٹ ان دونوں کی معافی کر دی جائے، شادی ڈاکٹر فوزیہ کے ایف آر سی پی کرنے کے بعد تک مؤخر کر دی گئی۔ سرجن بیٹی حیدر شاہ کا خواب اور خود ان کی ہونہار بیٹی ڈاکٹر فوزیہ کا یہ شوق تھا کہ وہ لندن سے ایف

نہر میں قحط سالی کے دوران لگی تھی اور اس بیماری کی وجہ سے اس بے چاری کو اپنے معصوم نولود بچے سمیت قافلے سے الگ کر دیا گیا تھا جس کا خلیازہ دونوں معصوم ماں، بیٹے ابھی تک بھگت رہے تھے۔

سارنگ بڑی ہوشیاری کے ساتھ ان دونوں ماں، بیٹے کو باہر نکال لایا پھر انہیں سانڈی پر بٹھا کر آگے تاریکی میں بڑھ گیا۔ جیوش بابا کی جھونپڑی کے قریب پہنچنے تک اس نے بھابی اللہ وسائی کو طویل اور پُر مصائب سفر کے بارے میں مختصر آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس نے کس طرح اس مردود گاتریا کو بھیا تک انجام سے دوچار کیا نیز فریدو کے متعلق بھی سارنگ نے اسے بتایا کہ وہ بالکل خیریت سے ہے۔ پھر جیوش بابا کی جھونپڑی کے قریب پہنچ کر سارنگ سانڈی کو گھجوروں کے جھنڈ کے قریب لایا جدھر فریدو اور بے ہوش رکنی موجود تھے، رکنی کو ہوش آچکا تھا اور وہ بہت سرا سیمہ اور پریشان نظر آرہی تھی تاہم فریدو نے اسے سارنگ کی ہدایت کے مطابق ہوش آنے پر آگاہ کر دیا تھا کہ کس طرح جیوش بابا اسے مردود گاتریا کے حوالے کر چکا تھا مگر سارنگ نے اسے جہنم واصل کر ڈالا۔ یہ سب لوگ آپس میں مل کر بہت خوش تھے۔ اب سارنگ کے سر پر رکنی کی ذمہ داری بھی تھی، اسے بھی بخیریت اس کے گھر تک پہنچانا تھا لہذا جب اس نے یہ کام بھی نمٹانے کی غرض سے رکنی سے گھر چلنے کو کہا تو وہ بے چاری رودی اور گلو کیر لہجے میں بولی۔ ”میں اب اپنے گھر کیسے جاسکتی ہوں، میرے ماتا، پتا مجھے پھر اسی شیطان کے حوالے کر دیں گے۔“

سارنگ اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں.....! اب ایسا نہیں ہوگا کیونکہ تم نے ذکر ماجیت سے شادی کرنے کا جوڑ رامہ رچایا تھا، وہ الٹا تمہارے ہی گلے آن پڑا تھا، اب ظاہر ہے تم ایسا نہیں کرو گی تو تمہارے ماتا، پتا بھی تمہیں اب دوبارہ اس کے حوالے نہیں کریں گے۔“ پھر بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ ”ویسے مجھے گاتریا کی طرح اس شیطان جیوش بابا کو کبھی نیست و نابود کر دینا چاہئے۔“

”نن..... نہیں بھیا.....! ایسا غضب بھی نہ کرنا۔“ اچانک رکنی نے اسے باز رکھتے ہوئے متوحش سے لہجے میں کہا۔ ”جیوش بابا کے گندے خون.....! اپنے ہاتھ کیوں خراب کرتے ہو.....؟ اگر تم نے اس کو مار ڈالا تو تم سب ایک اور بڑی مصیبت کا شکار ہو جاؤ گے اور تمہارا واپسی کا سفر بھی کھٹائی میں پڑ جائے گا کیونکہ اس گٹھ کے لوگ اس شیطان کی یوں سمجھو بوجا کرتے ہیں..... وہ مشتعل ہو کر تم لوگوں کے پیچھے پڑ جائیں گے اور ریت میں قدموں کے نشانات کے ذریعے تم لوگوں کو تلاش کرنا کچھ مشکل نہ ہوگا۔“

آرسی پی کی ڈگری حاصل کرے۔ یوں تو ڈاکٹر جواد بھی میڈیسن میں ایف سی پی ایس کر رہا تھا، بہر طور ڈاکٹر فوزیہ اور ڈاکٹر جواد احمد کی منگنی کی تاریخ تین دن بعد کی طے کر دی گئی۔

☆=====☆=====☆

سارنگ چند ثانے تاریکی میں دم بخود کھڑا ان دونوں ماں، بیٹے کے رونے اور سننے کی آوازیں سنتا رہا پھر وہ سائے کی طرح دیوار سے چپکا، بے آواز قدموں سے چلتا ہوا سامنے کے رخ پر آ گیا۔ یہ کوٹھری نمائگرہ تھا، جو گھر کے وسیع صحن کے دہنی جانب ایک کونے میں بنا ہوا تھا، صحن ویران تھا جدھر مدہم روشنی پھیلی ہوئی تھی، دروازے کے قریب پہنچ کر سارنگ نے دیکھا کہ دروازے پر محض کنڈی لگی ہوئی تھی، خوشی سے اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا، یہ کمرہ کیونکہ وسیع و عریض گھر کے اندر تھا اس لئے شاید اسے مقفل کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی تھی۔ اس نے آہستگی سے کنڈی کھولی اور دروازے کا صرف ایک پٹ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

اندر بلب کی یرقان زدہ روشنی میں سارنگ کی نظر جونہی سامنے ایک کونے کے سلین زدہ فرش پر پڑی تو اس کا دل دکھ اور خوشی کے ملے جلے تاثرات سے بھر گیا، اس کی الم نصیب بھابی اللہ وسائی اپنے چھوٹے بچے کو گود میں لیے بیٹھی رو رہی تھی۔ سارنگ پر نگاہ پڑتے ہی وہ سرا سیمہ سی نظر آنے لگی، وہ سارنگ کو اس کی بڑھی ہوئی داڑھی کی وجہ سے پہچان نہیں پاتی تھی مگر دوسرے ہی لمحے سارنگ نے آگے بڑھ کر انتہائی مبہور نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور سر پر ملائمت آمیزی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے رقیق لہجے میں بولا۔ ”بھابی.....! یہ میں ہوں سارنگ.....!“ اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ بھابی اللہ وسائی کی آنکھوں میں حیرت آمیز خوشی کے تاثرات ابھرے اور اس کا ستا ہوا چہرہ یکدم کھل گیا، وہ بے یقینی سے اس کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی لرزاں آواز میں بولی۔

”س..... سارنگ.....! یہ..... یہ..... تم ہو؟“

”ہاں..... بھابی.....! یہ میں ہوں سارنگ.....! تیرا بھائی..... چل جلدی کر، میں نے تجھے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا، آجا میرے ساتھ۔“ سارنگ نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور اس کی گود میں بٹکتے ہوئے بچے کو بھی پیار کیا۔ بھابی اللہ وسائی کی حالت پر اس کا دل کٹ کر رہ گیا، وہ پہلے..... یہ بھی زیادہ کمزور اور نحیف نظر آرہی تھی، اس بے چاری کے سر کے بال بھی جھڑ چکے تھے جس کا مطلب تھا اسے وہ پہلا اسرار بیماری ابھی تک چھٹی ہوئی تھی جو اسے

رکشی کی صراحت پر سارنگ خاموش ہو گیا پھر بولا۔ ”پھر چلو میں تمہیں پہلے تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔“

”نہیں بھیا!۔۔۔ یہ جگہ میرے لیے اجنبی نہیں۔۔۔ میں خود اپنے گھر چلی جاؤں گی، تم لوگ یہاں سے نکلنے میں دیر مت لگاؤ۔۔۔ آگے پتہ نہیں کتنا فاصلہ طے کرنا پڑے۔“ رکشی نے خلوص سے کہا۔ اس کی بات درست تھی۔ سارنگ کے پاس واقعی بہت کم وقت تھا، سرحد پار کر کے اپنے دیس نکلنا بھی ایک الگ اور کم خطرناک کام نہ تھا، رہی بات رکشی کی، وہ تو بھی ہی یہاں کی رہنے والی، اپنے گھر پہنچنا اس کے لیے چنداں مشکل نہ تھا۔

پھر سارنگ، بھابی اللہ وسائی اور فریدو، رکشی سے رخصت ہو کر سانڈنی پر سوار تاریکی میں لپ و لپ صحرائی وسعتوں کی طرف بڑھ گئے۔

سارنگ اپنے ایک مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن اب اسے سرحد پار کرنا تھی اور یہ مرحلہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا کیونکہ سارنگ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ جب تھر سے سرحد پار کر کے راجستھان کی سرحد میں داخل ہوا تھا تو ایک مڈ بھیڑ انڈین بارڈر سیکورٹی فورسز سے ہو گئی تھی اور وہ ان کے ہتھے چڑھ گیا تھا پھر سفاک انڈین آفیسر اسے زبردستی پاکستانی جاسوس بنانے پر تل گیا تھا اور یہ جرم اس کے سر تھوپنے کے لیے اس نے اس پر تشدد کی بھی انتہا کر دی تھی، بعد میں وہ ان کی گرفت سے نکل بھاگا تھا۔ سارنگ کو یقین تھا کہ اب وہ بھیڑیوں کی طرح اس کے خون کی بوسو گھمتے پھر رہے ہوں گے مگر سارنگ کو خود سے زیادہ بھابی اللہ وسائی، اس کے ننھے بچے اور فریدو کی فکر تھی، اس نے اپنی سی پوری کوشش کی کہ وہ انڈین سیکورٹی فورسز کی نظروں میں آئے بغیر سرحد پار کر جائے، اس نے ایک محتاط اندازے کے تحت متبادل راستہ اپنایا تھا اور اب خدا سے یہی دعا میں مانگتا ہوا محو سفر تھا کہ وہ خیریت سے سرحد پار کر کے اپنی دھرتی پہنچ جائے۔

زادراہ کے لیے ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا مگر وہ اس وقت جس صحرائی مقام سے گزر رہے تھے، وہاں کہیں کہیں کھجوروں کے درخت نظر آ رہے تھے اور دو ایک برساتی ٹوبے بھی انہیں دکھائیے تھے، اس طرح انہوں نے کھجوروں اور پانی سے پیٹ بھرا تھا اور زادراہ کے نام پر تھوڑا بہت کھجوروں اور پانی کا ذخیرہ بھی کر لیا تھا۔ سارنگ کو بھابی اللہ وسائی نے دوران سفر اپنی اور فریدو کی کر بٹاک روداد سے بھی آگاہ کیا تھا جب وہ مردود گارتیادھو کے سے اسے اور فریدو کو یرغمال بنا کر راجستھان لے آیا تھا اور ہندو سیٹھ کے ہاتھ انہیں فروخت کر دیا تھا۔ بھابی اللہ وسائی نے سارنگ کو اپنی کتھاسنا تے ہوئے یہ بھی بتایا کہ جب رام

دیاں نے اسے اپنی کنیر بنایا تو پھر اس کے سر کی جلد کی پراسراری کا بھی اس نے ہی ایک حکیم سے علاج کروایا تھا اور اس سے کافی افادہ ہوا تھا۔

اب دور مشرق کی سمت صحرائی ٹیلوں سے افق سے سپیدہ سحر نمودار ہونے لگا تھا مگر سارنگ نے سفر ترک نہ کیا اور مسلسل اللہ کے آسرے پر چلتا رہا، اسے پوری امید تھی کہ اللہ نے اگر اب تک اسے اتنے مشکل اور دشوار گزار حالات سے سرخرو فرمایا تھا تو وہی آگے بھی اس نیک مقصد میں ضرور کامیاب کرے گا۔

اچانک سارنگ کو اپنی دہنی جانب ذرا دور ریت کے بگولے اڑتے ہوئے دکھائی دیے۔۔۔ وہ بری طرح ٹھٹک گیا، وہ یہی سمجھا کہ کہیں یہ کسی صحرائی طوفان کا آغاز تو نہیں مگر پھر جلد ہی اسے یہ احساس ہوا کہ یہ طوفان نہیں بلکہ کوئی مختصر سا قافلہ ہے جو نیل گاڑیوں پر مشتمل تھا۔

سارنگ نے کسی خیال کے تحت سانڈنی کو روک دیا پھر وہ سب ریت پر اتر کر کھڑے ہو گئے، وہ قافلہ پانچ، چھ نیل گاڑیوں پر مشتمل تھا، سارنگ ان کے راستے سے ذرا ہٹ کر کھڑا قافلے کے قریب آنے کا منتظر تھا۔ یوں اس کا دل انجانے اندیشوں سے دھڑک رہا تھا مگر اس قافلے والوں سے راستہ پوچھنا بھی ضروری تھا ورنہ وہ اس اجنبی سرزمین میں راستہ بھٹک سکتا تھا۔ قافلہ ان کے قریب آ کر رک گیا، ان میں مرد، عورت، بوڑھے اور بچے سب ہی شامل تھے، یہ سب خانہ بدوش تھے۔۔۔ جسیم اور خاکستری رنگت والے۔ سب سے اگلی نیل گاڑی میں سوار ایک عمر رسیدہ شخص نے سارنگ سے بولا۔ ”رے بالکے!۔۔۔“

سارنگ نے اپنا مقصد بیان کیا تو عمر رسیدہ شخص نے اسے مطلوبہ راستہ سمجھایا اور پھر اپنے بیلوں کی پشت پر چابک مار کر انہیں آگے بڑھا دیا۔ سارنگ کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنے پاس موجود تھوڑی کھجوریں کھائیں اور پانی سے حلق تر کیا اور آگے بڑھ گئے۔ ابھی تھوڑا ہی دور چلے ہوں گے کہ اچانک سارنگ کو بائیں جانب پھر ریت سی اڑتی نظر آئی مگر سارنگ اب رکنا نہیں چاہتا تھا، وہ سانڈنی کو درمیانی رفتار سے دوڑائے جا رہا تھا۔ فریدو اس کے آگے سانڈنی کی موٹی گردن پر بیٹھا تھا جبکہ سارنگ کے پیچھے بھابی اللہ وسائی۔۔۔ یوں تو سارنگ کبھی سانڈنی سے اتر کر بھی تیز چلنے لگتا تھا مگر بہ وقت ضرورت وہ خود بھی سانڈنی پر سوار ہو کر اسے دوڑنے لگتا۔

سارنگ کو اپنی دھرتی کا راستہ معلوم ہو چکا تھا لہذا اب ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرنا

خالقو اپنے گرو گھنٹال آچر خان کو دیکھ کر بولا۔ ”آ..... آچر سائیں.....! میری ضمانت کا کیا بنا..... مجھے یہ پولیس والے بہت مارتے ہیں..... مجھے فوراً یہاں سے نکالنے کا بندوبست کرو۔ آچر سائیں.....!“ وہ بہت پریشان تھا، اس کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی اور بہت تپلی حالت ہو رہی تھی اس کی۔

آچر خان اسے تسلی دیتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ ”اڑے چر یا.....! تو کیا سمجھتا ہے کہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں، کوشش کر رہا ہوں میں۔“ پھر وہ دائیں بائیں کن انکھوں سے دیکھتے ہوئے اس سے بولا۔ ”اچھا یہ تو بتاؤ نے پولیس کو کچھ بتایا تو نہیں ہے نا.....؟“

”نہیں.....! میں نے ابھی اقرار جرم نہیں کیا، اتنا کچا تھوڑا ہی ہوں میں۔“ خالقو سینہ پھلا کر بولا۔ آچر خان کو دیکھ کر اسے ذرا حوصلہ ہوا تھا۔ وہ مزید بولا۔ ”پر آچر سائیں.....! پولیس مجھے بہت مارتی ہے..... کل بھی مجھے اس نے مارا تھا۔“

”اچھا.....! یہ تو اور اچھی بات ہے، اس طرح تیرا کیس اور مضبوط ہوگا کیونکہ پولیس عدالت سے ریمانڈ لئے بغیر تشدد نہیں کر سکتی۔“ آچر خان نے وکیلوں کی طرح اسے نکتہ سمجھایا۔ ”آچر سائیں.....! میری ضمانت کا کیا ہوا.....؟“ خالقو نے پوچھا تو اسی وقت پولیس والے نے آکر آچر خان سے کہا۔

”بس سائیں! ملاقات ختم..... تمہانیدار صاحب آنے والے ہیں۔“ اس کی بات سن کر آچر خان نے خالقو کو تسلی بخشی دی اور وہاں سے لوٹ آیا۔

آچر خان ایک سازشی اور بڑا منصوبہ ساز شخص تھا، اتنا تو اسے بھی احساس ہونے لگا تھا کہ خالقو کہ وہ اب بچا نہیں سکتا کیونکہ خالقو کے خلاف اس کی بہن ملوکاں کی گواہی اور آلہ قتل بہت مضبوط محرک تھے، جو اسے عمر قید یا پھانسی کے تحت تک پہنچا سکتے تھے چنانچہ اس نے اب ایک تیر سے دوڑنا شروع کر کے فیصلہ کیا..... وہ اب اپنے منصوبے پر فوری عمل کرنا چاہتا تھا ورنہ خالقو کو اگر شہر کی بڑی جیل منتقل کر دیا جاتا تو اس کا منصوبہ فیل ہو سکتا تھا، اس نے اچھی طرح اپنے اس خفیہ منصوبے پر غور کیا تو اسے ہر طرح سے اپنا منصوبہ بے داغ اور تیر بہدف محسوس ہوا..... اس کا دل اپنی ذہانت پر آپوں آپ بلیوں اچھلنے لگا کیونکہ اس خفیہ منصوبے کی کامیابی کے بعد سانپ بھی مر جاتا اور لاشی بھی نہیں ٹوٹی۔ آچر خان اب خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔

ادھر ماما اللہ رکھو روزانہ ملوکاں، میراں اور چاچی کی خبر گیری کے لیے ان کے ہاں آتا

چاہتا تھا، اس نے سرحد پار کرنے کا ایک محتاط طریقہ سوچ لیا تھا، وہ رات کی تاریکی میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا..... وقت گزرتا رہا، صحرا میں تیش بڑھنے لگی مگر سارنگ کا سفر مسلسل جاری رہا پھر اسے ایک نخل کے آثار نظر آئے، اس نے اس کی چھاؤں میں گرم دن کاٹنے کا فیصلہ کیا، اس کے انداز کے مطابق اب وہ سرحد سے چند میلوں کے فاصلے پر تھا۔

☆=====☆=====☆

چاچا سکھو کی موت کے بعد سے اب ملوکاں کو زیادہ شدت کے ساتھ اپنے دوسرے بھائی سارنگ کی یاد آنے لگی تھی کیونکہ وہ تینوں عورتیں یعنی ملوکاں، چاچی اور میراں خود کو تنہا محسوس کرنے لگی تھیں۔ ادھر یہ تینوں الم نصیب عورتیں اپنی قسمت کو رو رہی تھیں اور ادھر بدخصلت آچر خان اپنے ہونٹوں میں بیٹھا ایک نئی سازش کے تانے بانے بن رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ملوکاں کی نسبت ماما اللہ رکھو کے بھانجے سانول سے طے کر دی گئی ہے، یہی سبب تھا کہ چاچا سکھو کو خالقو کے ہاتھوں قتل کروانے کے باوجود اس کا مسئلہ وہیں انکا ہوا تھا بلکہ اب خالقو کی ضمانت نہ ہونے کی وجہ سے یہ معاملہ مزید الجھ ہو گیا تھا۔ آچر خان اب کف افسوس ملتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس نے خالقو کے ہاتھوں چاچا سکھو قتل کروانے کی غلطی کی، وہ اسے قتل کروانے کی بجائے ماما اللہ رکھو کے بھانجے کو قتل کروا دیتا تو ساری کہانی ہی ختم ہو جاتی۔ کیونکہ اس کی راہ کا اصل کاٹنا تو سانول تھا چنانچہ اس نے سانول کو راستے ہٹانے کا فیصلہ کیا مگر اس کے ساتھ ساتھ اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے مقید خالقو کی طرف سے بھی تشویش لاحق ہونے لگی تھی کہ جب خالقو کو یہ پتہ چلے گا کہ وہ اسے جیل سے چھڑانے میں ناکام رہا ہے تو کوئی بعید نہیں کہ وہ پولیس کو اصل حقیقت بتا دے کہ اسے چاچا سکھو کو قتل کرنے پر اس نے ہی اکسایا تھا اور آلہ قتل بھی آچر خان نے ہی اسے دیا تھا۔ یہ سوچ کر آچر خان کو اب اپنی فکر لاحق ہونے لگی تھی کہ اگر خالقو نے پولیس کے آگے سچ بول دیا تو پولیس اسے دھرنے میں دیر نہیں لگائے گی۔

اب آچر خان سوچنے لگا کہ اسے تمہانے جا کر خالقو سے ملاقات ضرور کرنی چاہئے۔ وہ اسے تسلی بخشی دینا چاہتا تھا، اب تو ویسے بھی خالقو کی مدد کرنا آچر خان پر لازم ہو چکا تھا، اس نے اسی وقت سب سے پہلے تمہانے جا کر خالقو سے ملاقات کرنے کا ارادہ کیا اور سیدھا تمہانے پہنچا۔ اس وقت انسپکٹر چھٹل شاہ وہاں موجود نہ تھا، آچر خان نے ایک پولیس والے کی مٹھی گرم کی تو اس کا کام آسان ہو گیا۔

”لے بھلا اس میں احسان کی کیا بات ہے..... ٹھیک ہے پھر یہی بہتر ہے، تو اب شادی کی تاریخ خود ہی بتا دے، مجبوری ہے، ابھی تو بے چارے بھاسکھو کی قبر کی منی بھی سوکھی نہیں ہے، پر کیا کریں عورتوں والی مجبوریاں ایسی ہی ہوتی ہیں نہ پائے ماندن نہ جائے رقت.....“

”ٹھیک ہے بھلا.....! تو جو تاریخ، مہینہ بتائے گا، وہی ٹھیک رہے گا۔“ بالآخر وہ دل مسوس کر بولی۔

اور ماما اللہ رکھو نے اس ماہ کا آخری ہفتہ دے دیا۔ چاچی نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔

☆=====☆=====☆

سدھوراں کو بے ہوشی کی حالت میں دیکھ کر پرویز ایک لمحے کو کچھ پریشان سا ہو گیا، اس کے دونوں ساتھی، مردود دلدرا کو پکڑنے کے لیے اس کے تعاقب میں دوڑ چکے تھے، پرویز خود بے ہوش سدھوراں کو انسپکٹر یا در حیات کے نو تعمیر شدہ بنگلے کے سامنے سنبھالے کھڑا تھا پھر وہ بمشکل سدھوراں کے بے ہوش وجود کو سنبھالتے ہوئے اپنی کار تک لایا، کار کا پچھلا دروازہ کھولا اور اسے اندر سیٹ پر لٹا دیا..... سدھوراں اب نیم بے ہوشی کے عالم میں کراہنے لگی، اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی، پرویز نے کار اسٹارٹ کی اور آگے بڑھادی، ذرا ہی دور اس کے دونوں ہانپتے ہوئے ساتھی آ گئے۔

”وہ بھاگ گیا استاد.....!“ ایک نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بتایا۔

”میری بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں اسے قریبی ہسپتال لے جا رہا ہوں، تم چوکنار ہو اور ابھی اپنے اذوں سے بھی دور رہو۔“ پرویز نے انہیں ہدایات دیں پھر ان کی کچھ سنے بغیر کار آگے بڑھادی اور مین شاہراہ پر آ گیا..... پرویز کے چہرے پر تشویش جیسے مثبت ہو کر رہ گئی تھی، عقبی سیٹ پر لیٹی نیم بے ہوشی کی حالت میں سدھوراں کے کراہنے کی آوازیں اب بتدریج بڑھنے لگی تھیں، پرویز اس کی حالت سے بخوبی واقف تھا، پرویز کو دلدرا پر بری طرح طیش آ رہا تھا، اس رذیل نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے معصوم سدھوراں کو پھانسنے کی کوشش کی تھی، اس کمینے کو سدھوراں کی حالت پر بھی رحم نہ آیا تھا..... پرویز کے دل و دماغ میں اب دلدرا سے انتقام لینے کی آگ سلگ رہی تھی۔

بہر طور وہ مطلوبہ میٹرنی ہوم پہنچا اور سدھوراں کو وہاں داخل کرنے کے بعد اس نے سوچا کہ سدھوراں کے پاس کسی عورت کا رہنا ضروری ہے، اس صورت حال نے اسے مزید

رہتا تھا۔ ایک روز اس نے چاچا سکھو کی بیوہ سے کہا۔ ”ادی مان واری.....! اللہ سائیں، بھاسکھو کو جنت نصیب کرے، انسانی ہمدردی کے ناتے مجھے اب تمہاری اور سب سے زیادہ دھی ملوکاں کی فکر رہنے لگی ہے، یہ موقع تو نہیں ہے یہ بات کہنے کا مگر جب حالات ہی ایسے ہوں تو ہمیں چاہئے کہ جلد سے جلد اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں تو بہتر ہے۔“

”ادا سکھو.....! میں تیری بات سمجھ رہی ہوں، اب تو جیسے بول.....!“ چاچی نے رنجیدہ سے لہجے میں کہا۔

”ادی.....! ہمیں اب سانول اور ملوکاں کی شادی کر دینا چاہئے، بالکل سادگی اور خاموشی کے ساتھ.....!“

چاچی نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا تو ماما اللہ رکھو چند ثانے کچھ سوچتا رہا، اس کے متذہب چہرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ کوئی ایسی بات بھی کہنا چاہتا تھا جس کے لیے اسے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ تب پھر بیوہ چاچی نے ہی اس کی طرف زدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا بات ہے ادا.....! تو کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے؟“

”ہا..... ہاؤ ادی مان واری.....!“ اس کے استفسار پر ماما اللہ رکھو نے ذرا حوصلہ پکڑتے ہوئے فوراً کہا اور مزید بولا۔ ”دیکھو ادی.....! میری بات اگر تیرے کو بری لگے تو ناراض مت ہونا مگر رب سائیں جانتا ہے ایسا میں تمہاری بھلائی کے لیے ہی کرنا چاہتا ہوں، ادی مان واری.....! زمانہ بہت خراب ہے، ملوکاں کی شادی کے بعد تو اور میراں دھی تنہا رہ جاؤ گی، میراں کو بھی میں اپنی دھی سمجھتا ہوں، دراصل میں چاہتا ہوں کہ ملوکاں اور سانول کی شادی کے بعد میرے پاس رہنے کی بجائے وہ دونوں ادھر تمہارے پاس ہی رہیں، اس طرح تمہیں بھی سہارا ہو جائے گا یا پھر تو اور میراں دھی میرے ساتھ آ کر رہو، ہم سب مل کر خوش رہیں گے۔“ ماما اللہ رکھو نے اتنا کہہ کر سکھو کی بیوہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ بے اختیار چاچی کی آنکھیں بھیگ گئیں..... ماما اللہ رکھو کے خلوص بھرے لہجے نے اسے رقیق سا کر دیا تھا۔

”رونی کیوں ہو ادی.....! اگر تجھے تیرے ادا کی بات اچھی نہیں لگی تو.....!“

”نہیں ادا.....! یہ بات نہیں۔“ چاچی نے فوراً اس کی بات کاٹ کر رقیق اقلسی سے کہا۔ ”تو نے تو یہ کہہ کر ہم پر بڑا احسان کیا ہے، بھلا تیری بات مجھے کیوں بری لگے گی۔“

پر میں زمانے سے ڈرتی ہوں، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تیرے گھر رہنے کی بجائے سانول اور ملوکاں شادی کے بعد ادھر ہی آ کر رہیں، ہمارے ساتھ.....!“

دلدار.....؟“

”استاد کا نام تیز سے لو رنہ.....!“ دلدار کے ایک گرگے نے زہر خند لہجے میں کہا تو پرویز نے اس کے چاقو والے ہاتھ پر زور سے لات رسید کر دی..... چاقو اس کے ہاتھ سے ٹریا، دوسرا چاقو تو توتا ہوا غرا کر پرویز پر چھٹا..... پرویز نے ذرا سنبھل کر اس کے چہرے پر لات رسید کر دی، وہ ہلبلا کر پیچھے الٹ گیا..... پرویز اس وقت ہر قسم کے نتائج سے عاری اور بے پروا تھا مگر ادھر ان دونوں بد معاشوں نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی اور بیک وقت خونخوار کتوں کی طرح اس پر چھپے..... اس بار پرویز نے اپنے دائیں ہاتھ کا گھونسا ایک کی ناک پر رسید کر دیا جہاں سے خون کا پرنا لہ پھوٹ پڑا مگر پھر جب پرویز نے دوسرے کے سینے پر اپنی لات رسید کرنی چاہی تو وہ بھی اس مرتبہ متاثر ہو کر کمال پھرتی سے پرویز کی اپنے سینے کی طرف اٹھی ہوئی لات کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر اسے بل دینے کی کوشش کرنے لگا مگر پرویز بھی انہی کے قبیل کا آدمی تھا چنانچہ وہ فوراً اپنی زمین پر ٹکی ایک ٹانگ کے سہارے زور سے اچھلا اور دوسری ٹانگ کی بھرپور ضرب مد مقابل کے چہرے پر رسید کر دی..... اس کے حلق سے خرخراتی ہوئی آواز نکلی اور وہ عقب میں لڑکھاتا ہوا گر تاجلا گیا۔

پرویز کی ٹانگ آزاد ہوتے ہی وہ پہلے والے مد مقابل کی طرف متوجہ ہوا، جس نے اپنی خون آلود ناک کی پروا کئے بغیر دوبارہ پرویز پر حملہ کرنے کی جرأت کی اور قریب رکھی یک کمری اٹھا کر پرویز پر دے ماری، پرویز فوراً نیچے جھک گیا، کمری وہاں بھیجی ایک بد وضع کی چوٹی میز پر ٹوٹ کر گر پڑی، باقی لوگ ارد گرد دم سادھے کھڑے یہ جنگ دیکھنے میں محو تھے، ان سب کے چہروں سے عجیب طرح کا اشتیاق بھلک رہا تھا، اس اثناء میں وہ دونوں مد مقابل سنبھل کر کھڑے ہو چکے تھے اور پرویز کو بڑی کینہ تو ز نظروں سے گھور رہے تھے۔ پرویز نے جس مد مقابل کی ناک کی تواضع کی تھی، اس کی مضروب ناک سے بھل بھل بہنے لگے خون نے اس کے چہرے کو خوف ناک بنا دیا تھا مگر پرویز مثل آتش فشاں بھبک رہا تھا، اپنے دشمن دلدار کے ان دونوں غنڈوں کی حیثیت اس کے سامنے ادنیٰ چیلوں سے بڑھ کر نہ گی لہذا جیسے ہی وہ دونوں غنڈے پرویز کو چھڑانے کے لیے اس کی طرف لپکے، پرویز نے یک کی گردن اپنے دونوں ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑ لی اور اسے گھما کر دوسرے مد مقابل کے بڑے مارا مگر دوسرا بھی کانیاں تھا، اس نے خود کو بچاتے ہوئے بہ سرعت گھونسا پرویز کے نرے پر رسید کر دیا صرف ایک ثانیے کے لیے پرویز کا دماغ جھنجھٹا سا گیا تب اس کے اندر کالا دھیسے ابل پڑا، اس نے دوسرے مد مقابل کی اس مہم جوئی کا مزہ چکھانے کے لیے اس

پریشان کر دیا..... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس عورت کا بندوبست کرے جو سدھوراں کے پاس موجود رہے اور اس کی تیمارداری کرے..... اسے خود اپنے دھڑلے جانے کی بھی پریشانی لاحق تھی، پولیس اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی اور وہ خود اس سے چھپتا پھر رہا تھا پھر اچانک اسے سدھوراں کی ہمدردی نے ڈاکٹر فوزیہ کا خیال آیا لہذا اس نے میٹرٹی ہوم کی ایک نرس اور آیا کی مٹھی گرم کرتے ہوئے سدھوراں کا پوری طرح خیال رکھنے کی تاکید کی اور پھر خود دوبارہ کار میں آ کر بیٹھا اور سیدھا ڈاکٹر فوزیہ کی رہائشگاہ پر آپہنچا مگر ڈاکٹر فوزیہ گھر پر موجود نہ تھی البتہ ماسی نے پرویز کو پہچان لیا تھا۔ پرویز نے جلدی جلدی اسے اپنے اور سدھوراں کے بارے میں بتایا اور ساتھ ہی اس میٹرٹی ہوم کا پتہ بھی اسے سمجھا دیا کہ اگر ڈاکٹر فوزیہ آئیں تو وہ انسانی ہمدردی کی خاطر وہاں جا کر سدھوراں کی خیر خبر لے لیں۔

وہاں سے پرویز سیدھا نرسری اپنے دوست پہلوان دودھ والے سے ملا اور اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس نے بھی اسے یہ بتایا کہ ڈاکٹر فوزیہ یہاں آئی تھی اور اس کا اور سدھوراں کا پوچھ رہی تھی۔

”یار.....! میں اس وقت بہت پریشان ہوں اور پولیس کے ڈر سے چھپتا پھر رہا ہوں ٹو ذرا بھائی کو کسی طرح سدھوراں کے پاس بھیج دے، میں تیرا یہ احسان ساری زندگی نہیں فراموش کروں گا۔“

”ارے یار.....! کیسی باتیں کرتا ہے، ہم تو یاروں کے یار ہیں، تُو بے فکر ہو جا، میں ابھی خود تیری بھائی کو لے کر سدھوراں کے پاس پہنچتا ہوں۔“ پرویز نے اسے جلدی جلدی میٹرٹی ہوم کا پتہ سمجھایا اور اپنی کار میں آ بیٹھا۔

اس کی آنکھوں سے انتقام کے شعلے پھوٹ رہے تھے، وہ جانتا تھا کہ دلدار اسے کہاں ملے گا..... اس کا رخ اب بنگالی پاڑے کی طرف تھا۔

لگ بھگ گھنٹے بعد وہ ایک پسماندہ سی کچی بستی پہنچا، وہ سیدھا ایک جوئے خانے میں پہنچا جو بظاہر ایک چھپر نما گندے سے ہوٹل پر مشتمل تھا، وہاں ”ڈخل“ پر موجود دو آدمیوں نے پرویز کو پہچان لیا، وہ اس کے چڑھے ہوئے تیوروں کو بھانپتے ہوئے جارحانہ انداز میں پرویز کی طرف بڑھے، ساتھ ہی انہوں نے اپنی شلوار کے نیفوں سے گراری دار چاقو نکال لئے تھے..... وہاں موجود دیگر ادبائش لوگ صورت حال کی نزاکت بھانپ کر کئی کترانے لگے، ادھر پرویز ان دونوں کو چاقو ہاتھ میں تولتے ہوئے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر یکدم ٹھٹک کر رک گیا اور پھر قہر بار نظروں سے دونوں کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”کہاں ہے وہ کمینہ

پیت پر رسید کر دیا۔۔۔۔۔ یہ وار دلدار کے لیے ضرب شدید ثابت ہوا، اس کے حلق سے بیل جی ذکر اہٹ ابھری تو پرویز نے اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اس کی ناک پر بھی ٹکر رسید کر دی۔ یہ اس کا مخصوص وار تھا کیونکہ وہ جس انداز سے اپنے مد مقابل کی ناک پر سر کی ٹکر رسید کرتا تھا، اس میں اس کی ناک کا بانسہ سرک کر مد مقابل کا چہرہ ہی بگاڑ دیتا تھا اور ساتھ ہی ختم ہونے والے خون کا پرنا لہ جاری ہو جاتا۔۔۔۔۔ اپنے اس مخصوص وار سے تھوڑی دیر پہلے ہی وہ دلدار کے ایک گماشتے کو لمبا لٹا چکا تھا مگر دلدار، پرویز کی توقع کے برخلاف سخت جان ثابت ہوا تھا۔۔۔۔۔ وہ اپنی مضروب ناک کی پروا کئے بغیر وحیاناہ انداز میں غراتے ہوئے پرویز کو آگے کی طرف دھکیلتا چلا گیا اور پرویز کی کمر ایک میز کے کونے سے جا ٹکرائی، پرویز کے حلق سے تکلیف کی شدت سے کراہ خارج ہو گئی۔۔۔۔۔ اسے لمحہ بھر کو بے بس پا کر دلدار اس سے الگ ہو گیا، اس اثناء میں دلدار کے دوسرے چار پانچ ڈشکرے بھی جانے کہاں سے اچانک نمودار ہو کر اس کی مدد کو آ گئے اور دلدار کا اشارہ پاتے ہی ان سب نے مل کر پرویز کو دبوچ لیا اور اس پر لاتوں، مکوں کی بارش کر دی۔۔۔۔۔ پرویز نڈھال ہو کر بے دم سافرش پر گر گیا، اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا۔

☆=====☆=====☆

ماسی کی اطلاع پر ڈاکٹر فوزیہ اسی وقت اسے اپنے ساتھ لے کر آندھی طوفان کی طرح میزنی ہوم پہنچی تھی جہاں سدھوراں کودیں کیا گیا تھا، وہاں کی لیڈی ڈاکٹر آسیہ نے جب ڈاکٹر فوزیہ کو یہ خوشخبری سنائی کہ سدھوراں کو اللہ نے چاند سا بیٹا دیا ہے، اب زچہ بچہ دونوں بالکل ٹھیک ہیں تو اسی وقت ڈاکٹر فوزیہ نے ساری مینٹ اپنے ذمے لے لی اور سدھوراں کے کمرے میں آ گئی۔۔۔۔۔ وہاں دودھ والے پہلوان جی اور ان کی بیوی پہلے سے موجود تھے، سدھوراں بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کے پہلو میں ایک ننھا مناد وجود ہمک رہا تھا۔ ڈاکٹر فوزیہ، سدھوراں کو بہنوں کی طرح چاہنے لگی تھی۔۔۔۔۔ اسے اب ماں کے روپ میں دیکھ کر بے اختیار سدھوراں پر پیار آ گیا۔ سدھوراں بھی ڈاکٹر فوزیہ کو دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھی تھی۔

”بب۔۔۔۔۔ بابی۔۔۔۔۔ آ۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔؟“ سدھوراں کے ہونٹ لرزے اور اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔۔۔۔۔ وہ کہنیوں کے بل اٹھنے لگی تو فوزیہ یکدم آگے بڑھ کر اس سے جا

”سدھوراں۔۔۔۔۔! ٹوٹھیک تو ہے نا۔۔۔۔۔ یہ کیا ہے۔۔۔۔۔؟“ فوزیہ نے مسرت بھرے

کے پیٹ پر لات رسید کر دی، مد مقابل کے حلق سے اذیت ناک چیخیں بلند ہو گئیں اور وہ فرش پر پڑا مارے درد کے اٹھنے لگا۔۔۔۔۔ پہلے والے نے میدان چھوڑ کر بھاگنا چاہا تو پرویز نے اسے دبوچ لیا، ٹھیک اسی وقت گولی چلنے کی آواز آئی، پرویز کو گولی کی جان لیوا جھپک بالکل اپنے چہرے کے قریب سے گزرتی محسوس ہوئی، وہ ڈراٹھک گیا، سامنے دلدار ہاتھ میں ایک خوفناک سیاہ ٹی ٹی پستول پکڑے اس کی جانب قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا، پرویز نے فوراً اپنے مد مقابل اور اس کے بھگڑے گرے کو جھپٹ کر اپنی ڈھال بنالیا۔

”پرویز۔۔۔۔۔! میرے ساتھی کو چھوڑ دے ورنہ تیری لاش بھی ادھر نظر نہیں آئے گی۔“

دلدار خونخوار لہجے میں پرویز کو گھورتے ہوئے بولا۔

پرویز اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گردار لہجے میں بولا۔ ”سور کے بچے۔۔۔۔۔! میں تیرا خون پی جاؤں گا، ٹوٹے میرے گھر قدم رکھنے کی جرأت کیسے کی۔۔۔۔۔؟“

اس کی بات سن کر دلدار کے بدہیت ہونٹوں پر مکروہ ہنسی ابلی اور وہ ٹی ٹی پستول والا ہاتھ لہراتے ہوئے چند قدم آگے بڑھا اور استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ”تیرے سر پر اپنی نئی نوٹیلی بیوی کا کچھ زیادہ ہی عشق شوار ہو گیا تھا کہ ٹوہمیں بھی بھول گیا۔“

”بکواس بند کر کے ورنہ۔۔۔۔۔؟“ پرویز زہرناک لہجے میں مشتعل ہو کر چلایا اور پھر اگلے ہی لمحے اس نے اپنی گرفت میں پکڑے ہوئے دلدار کے گماشتے کو اس پر اچھال دیا اور ساتھ ہی خود بھی بجلی کی طرح حرکت میں آیا اور دلدار پر چھلانگ لگا دی۔ پرویز، دلدار کو اپنے ساتھ رگیدتا ہوا کرسیوں اور میزوں سے الجھتا ہوا فرش پر گر کر ساتھ ہی دلدار کے ہاتھ سے پستول بھی نکل کر دور تک پھسلتا ہوا چلا گیا۔

دلدار نے کمر کے بل زمین پر گرتے ہی اپنے دونوں گھٹنے سیکٹر کر پرویز کے پیٹ پر جمائے اور اسے دور اچھال دیا اور پھرتی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہی اس نے قریب دھری کرسی اٹھالی۔ ادھر پرویز نے جیسے ہی کھڑے ہونے کی کوشش کی، دلدار نے تاک کر کرسی اس کے سر پر دے ماری۔۔۔۔۔ پرویز کو اپنا سر چختا محسوس ہوا اور ایک ٹاپے کے لیے اس کی آنکھوں کے سامنے ترمرے سے ناچ گئے۔۔۔۔۔ دلدار اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر وحشی درندے کی طرح اس پر پل پڑا اور پرویز کے چہرے پر گھونٹوں کی بارش کر دی۔۔۔۔۔ پرویز کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا اور پھر جیسے ہی اس نے اپنے خون کا ذائقہ چکھا تو پھر وہ اپنی سارے تکلیف بھول گیا، اس کی رگوں میں خون لاوے کی طرح گردش کرنے لگا اور وہ غراتا ہو دلدار کے ساتھ اپٹ گیا پھر بڑی پھرتی کے ساتھ اس نے اپنی دہنی ٹانگ کا گھٹنا اس کے

انداز میں پوچھا اور پھر بچے کو پیار کرنے لگی اور بولی۔ ”کیا نام رکھا ہے اس منے سے شیطان کا.....؟“

سدھوراں نے متا بھری نگاہوں سے اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے اپنے بچے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ابھی تو اس کا نام نہیں رکھا باجی.....! آپ خود ہی اس کا نام رکھ لیں۔“

”اچھا بھئی! اس کا نام آج سے احمد علی ہے۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے کہا اور پھر پوچھا۔ ”ارے بھئی کسی نے اس کے کان میں اذان بھی دی ہے؟“

اس کی بات سن کر پاس ہی کرسی پر براجمان پہلوان جی نے خوشدلی کے ساتھ کہا۔ ”آہو جی بہن جی.....! میں نے ہی سب سے پہلے اس کے کان میں اذان دی تھی۔“

”باجی.....! بھائی پہلوان جی اور بھائی کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے، میں اکیلی تھی، یہ دونوں ہی فرشتہ صفت یہاں موجود رہے۔“ سدھوراں نے نمون نگاہوں سے پہلوان جی اور ان کی فر بہ اندام بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔

پہلوان جی کی بیوی یکدم بولی۔ ”ارے بہن.....! احسان کی کیا بات ہے، تجھے میں نے اپنی بہن کہا ہے تو سمجھا بھی ہے۔“

پھر ڈاکٹر فوزیہ کو جیسے اچانک کچھ یاد آیا، اس نے سدھوراں سے پرویز کے بارے میں پوچھا تو اچانک سدھوراں کے چہرے پر اداسی کے ساتھ پریشانی کے تاثرات بھی پھیل گئے مگر وہ پہلوان جی اور اس کے بیوی کی موجودگی کی وجہ سے کچھ بتانے سے کترانے لگی۔

تب پھر پہلوان جی نے اچانک بتایا۔ ”میں نے سنا ہے پرویز کے ہوٹل پر پولیس کا چھاپہ پڑا تھا..... سدھوراں! تو ہی کچھ بتا، آخر پرویز ہے کدھر.....؟ اگر خدا نخواستہ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا ہے تو ہم اسے چھڑانے کی کوشش کریں گے۔“

پہلوان کی بات سن کر سدھوراں نے سوچا کہ اب ان سے کچھ چھپانا مناسب نہیں تب پھر اس نے پرویز سے متعلق ان سب کو مختصراً آگاہ کر دیا۔ وہ سب، بالخصوص ڈاکٹر فوزیہ پریشان ہو گئی پھر چند ثانیے کچھ سوچنے کے بعد پہلوان جی کو مخاطب کر کے بولی۔ ”پہلوان جی.....! آپ ایک اور احسان کر دیں اس بیچاری پر.....!“

”اوہو..... بہن جی.....! یہ غیریت والی باتیں کیوں کر رہی ہیں..... پرویز تو میرا یاد ہے..... احسان کیسا؟“

”پہلوان جی.....! آپ سے اگر ہو سکے تو پرویز کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں ویسے میں بھی انسپلر مشتاق احمد سے بات کروں گی، اگر خدا نخواستہ پرویز شہر کے کسی بھی

نہ نے میں ہو گا تو اس کے لیے کچھ کیا جاسکے گا۔“

ڈاکٹر فوزیہ کی بات سن کر سدھوراں کے پڑ مردہ پڑتے چہرے پر امید بھری خوشی کے تاثرات اند آئے اور وہ حوصلہ پکڑتے ہوئے فوزیہ سے بولی۔ ”باجی.....! پرویز برا ضرور تھا مگر اب اس نے ہر برائی سے توبہ کر لی ہے..... اسے اب اس کے برے ساتھیوں نے ہی اس توبہ کی سزا دی ہے۔“

”ہاں.....! ہاں میں سمجھ رہی ہوں سدھوراں.....! تم پریشان مت ہو۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے اسے تسلی دی اور پہلوان جی سے دوبارہ مخاطب ہو کر بولی۔ ”پہلوان جی.....! آپ پہلے اپنے طور پر پرویز بھائی کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں پھر مجھے گھر پر اطلاع دے دینا، اس کے بعد میں بھی کچھ کروں گی، ویسے آپ دونوں کافی تھک چکے ہوں گے، اگر گھر جانا چاہیں.....!“

”اوہا جی نا.....! ہم کوئی تھکے وکے نہیں۔“ پہلوان جی نے مخصوص لہجے میں کہا۔

اچانک لیڈی ڈاکٹر آسیہ ایک نرس کے ساتھ اندر داخل ہوئیں اور خلیقانہ مسکراہٹ کے ساتھ سدھوراں کے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”کیسی ہو سدھوراں.....؟“

”جی ڈاکٹر نی صاحبہ.....! ٹھیک ہوں۔“

”بچے کو دودھ پلا رہی ہو اپنا.....؟“

”جی ڈاکٹر نی صاحبہ.....!“

”شاباش.....! اسے صرف اور صرف اپنا ہی دودھ پلانا کیونکہ ماں کا دودھ نوزائیدہ بچے کے لیے غذا بھی ہے اور دوا بھی.....!“ یہ کہہ کر ڈاکٹر آسیہ نے سدھوراں کا تفصیلی معائنہ کیا پھر ڈاکٹر فوزیہ سے کہا۔ ”زچہ، بچہ دونوں ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ہیں..... اگر آپ انہیں گھر لے جانا چاہیں تو لے جاسکتی ہیں۔“

”بہت شکریہ ڈاکٹر صاحبہ آپ کا.....! ہم بھی یہی چاہ رہے تھے کہ ان دونوں کو اپنے ساتھ لے جائیں۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے ڈاکٹر آسیہ کا شکریہ ادا کیا اور وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔

سدھوراں کو اسی وقت وہاں سے ڈسچارج کر دیا، ڈاکٹر فوزیہ، سدھوراں کو اپنے گھر لے جانا چاہتی تھی مگر سدھوراں، ڈاکٹر فوزیہ پر مزید بوجھ بننا نہیں چاہتی تھی، اس نے اپنے گھر جانے کو کہا تو ڈاکٹر فوزیہ نے اسے پیار سے جھڑک دیا اور پھر زبردستی اسے ساتھ لے لے گا کہ میں آئیٹھی..... پہلوان جی اور ان کی بیوی بھی آئیٹھے..... پھر یہ سب لوگ وہاں سے

روانہ ہو گئے۔

☆=====☆

وہ مختصر سا نخل کھجوروں اور بوہ کی کانٹے دار جھاڑیوں پر مشتمل تھا، قریب ہی ایک برساتی ٹوبہ بھی تھا جو خشک تھا، سارنگ ان سب کو لئے تین چار باہم جڑے ہوئے تنوں والے کھجور کے درختوں کے سائے میں آ گیا، اس نے سانڈنی کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا پھر یہ لوگ ریت پر ایک کپڑا بچھا کر بھنے ہوئے پنپے کھانے لگے، ریت پر گری ہوئی کھجوریں فریدو نے اکٹھی کی تھیں۔ بھابی اللہ وسائی اپنے بچے کو دودھ پلانے لگی، سارنگ تھوڑا بہت کھاپی چکنے کے بعد وہاں سے اٹھا اور اپنی آنکھوں پر اپنے ایک ہاتھ کا چھجبا بنا کر دور تپے ہوئے لق و دوں ریزگار کو تکتے لگا، اس مختصر سے قافلے کے خاکستری چہرے والے نے اسے سرحد کی طرف کا جوراستہ ذہن نشین کروایا تھا، اس حساب سے سارنگ بالکل ٹھیک سمت پر سفر کر رہا تھا..... اس خاکستری چہرے والے نے اسے سرحد تک رہنمائی کے سلسلے میں سب سے بڑی نشانی اپنے قافلے کے نقش پا کی دی تھی کیونکہ وہ لوگ بھی سرحد کے کسی قریبی گاؤں سے آ رہے تھے۔

سارنگ کا اب ارادہ شام ہونے کے ساتھ ہی آگے نکلنے کا تھا چنانچہ اس نے شام تک ذرا آرام کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر یہ سب لوگ وہیں لیٹ گئے مگر سونے سے قبل سارنگ، سانڈنی کو ایک درخت سے باندھنا نہیں بھولا تھا..... وہ سب کھجوروں کی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں میں سو گئے۔

وقت دبے پاؤں سرکٹا رہا، آگ اگلتا سورج سوانیزے پر پہنچ کر اب تھکے ماندے پنجھی کی طرح مغرب کی طرف جھکنے لگا تھا، چار سونٹاٹے دار صحرائی ویرانہ پھیلا ہوا تھا پھر دھیرے دھیرے سورج کی پرتیش کندنی کر نیں سنہری پڑنے لگیں، دن بھر چلنے والی بادِ سوم بھی معتدل ہونے لگی تھی پھر جب سورج کی لال ٹکیہ دور مغربی ٹیلوں کے عقب میں لڑھکنے لگی تو چار سواندھیرا پھیلنے لگا۔

یہ ایک قدرتی امر ہے کہ جب انسان سونے سے پہلے اپنے دل میں یہ تہیہ کر کے لینے کہ میں نے صرف چند گھنٹے نیند لینی ہے یا فلاں وقت جاگنا ہے تو عموماً وہ متعین کردہ وقت جاگ پڑتا ہے، یہی کچھ سارنگ بھی کر کے سویا تھا چنانچہ جیسے ہی شام گہری ہونے لگی تو سارنگ کی آنکھ کھلی گئی..... جاگتے ہی اس نے بھابی اللہ وسائی اور فریدو کو بھی بیدار کیا اور

ایک بار پھر یہ سب لوگ سانڈنی پر سوار ہو کر منزل کی جانب گامزن ہو گئے۔

جانے کیوں منزل کے قریب پہنچنے کے احساس کے ساتھ ہی سارنگ کے دل و دماغ میں انجانے اور پُر تشویش وسوسے صحرائی بچھوکی طرح اندر ہی اندر ڈیک مارنے لگے..... سارنگ کو بار بار انڈین سیکورٹی فورسز کی طرف سے خطرہ لاحق تھا، وہ اس سنگین حقیقت سے خوبی واقف تھا کہ اس نے انڈین سیکورٹی والوں کے ایک اہلکار کو قتل کرنے کا جرم کیا تھا، اگرچہ ایسا اس نے اپنے دفاع میں کیا تھا کیونکہ اسے بے گناہ پاکستانی جاسوس ہونے کا مجرم ٹھہرایا جا رہا تھا..... اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اسے ساری عمر بھارتی فورسز کی اذیت گاہوں میں ناکردہ جرم کی سزا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بھگتنا پڑتی۔

سارنگ کی کامیابی کے لیے یہ آخری اور فیصلہ کن مرحلہ تھا کہ وہ بخیر و عافیت بھابی اللہ وسائی اور فریدو کو یہاں سے نکال لے جائے۔ وہ سانڈنی کو اب دوڑا نہیں رہا تھا کیونکہ وہ کسی قسم کی بھگدڑ مچائے بغیر اس ”ڈیجیٹل زون“ سے نکل جانا چاہتا تھا۔ آسمان صاف اور روشن ہو چکا تھا، ٹھنڈے تاروں کی یلغار سمیت طباق چاند کی طلسمانی روشنی چہار سو چمکی ہوئی تھی۔

معاً سارنگ کو روشن چاندنی میں سامنے خاردار اہنی تار کی باڑ نظر آئی، اس کا دل خوش سے دھڑکنے لگا، اس خاردار اہنی باڑ کو دیکھ کر اس کے ذہن رسا نے فوراً یہ اندازہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے ملک کی سرحد کے اب بالکل قریب پہنچ چکا ہے کیونکہ اس باڑ کے بعد فری زون شروع ہوتا تھا..... خاردار باڑ زیادہ اونچی نہیں تھی مگر بہر حال اسے سانڈنی سمیت پار کرنا ممکن نہ تھا، اس لیے اس نے بھابی اللہ وسائی اور فریدو کو سانڈنی سے اترنے کو کہا اور پھر خود بھی نیچے اتر آیا پھر سب سے پہلے اس نے بمشکل بھابی اللہ وسائی کو باڑ پار کروائی پھر فریدو کو اس کے بعد جب سانڈنی کو باڑ پار کروانے لگا تو اس کے کھر اہنی تاروں میں الجھ گئے۔ اس مقام سے ٹھیک بائیں طرف شمال کی سمت لگ بھگ دو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع انڈین باڈر سیکورٹی فورسز کی بیرک کے ٹراسمیشن روم میں دائیں بائیں پانچ میل کے دائرے میں عمل پیر رہنے والی لاسکی لہروں نے اہنی خاردار کی بازگشت سے سیکورٹی والوں کو خبردار کر دیا بس بھر کیا تھا، آنا فنا وہاں موجود انڈین آفیسر نے اپنے پانچ عدد اہلکاروں کو ساتھ لیا اور پھر یہ سب لوگ ایک تیز رفتار چوڑے تاروں والی فوجی جیپ میں سوار ہو کر مطلوبہ سمت کی طرف روانہ ہو گئے۔

ادھر سارنگ اس سنگین خطرے سے بے نیاز بھارتی بھر کم سانڈنی کے خاردار تاروں میں پھنسے ہوئے کھروں کو نکالنے میں مصروف تھا کہ اچانک سیکورٹی والوں کی جیپ اس کے

سر پر پہنچ گئی..... سارنگ ایک لمحے کو اپنی جگہ جہاں کا تھا رہ گیا۔

”ہاٹ.....!“ سارنگ پر نظر پڑتے ہی انڈین اہلکار بڑی پھرتی کے ساتھ جیب سے کوڈ کر گئیں تاں اس کے قریب آ گئے، انڈین آفیسر نے سارنگ کو فوراً پہچان لیا اور چاکر اپنے ساتھیوں سے بولا۔ ”خبردار.....! یہ جانے نہ پائے..... یہ وہی ہے جو ہمارے ایک آدمی اشوک کو قتل کر کے بھاگا تھا۔“

سارنگ نے یہ سنا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، باڑکی دوسری طرف موجود بے چاری بھابی اللہ وسائی اور فرید وہ بھی خوف زدہ ہو گئے، انڈین آفیسر کے لہجے کو سارنگ پہچان چکا تھا۔

اس کے بعد کا قصہ مختصر عرصے میں نمٹا لیا گیا اور ان سب کو گرفتار کر کے بیرک میں لایا گیا۔ اب سارنگ ہی نہیں بلکہ بھابی اللہ وسائی اور فرید وہ سب ہی سنگین حالات کا شکار تھے، سارنگ کی پریشانی اور تشویش یہ سوچ سوچ کر فزوں تر ہو رہی تھی کہ اب تو اسے اپنی صفائی پیش کئے بغیر تختہ دار پر چڑھا دیا جائے گا پھر بھابی اللہ وسائی، اس کے گود کے ہمتے ہوئے بچے اور فرید وہ کا کیا بنے گا.....؟ مایوسی نے پوری طرح سارنگ کو دل گرفتہ اور شکست خوردہ سا کر دیا تھا۔ ادھر وہ سفاک اور خزانٹ انڈین آفیسر پہلے ہی اس پر ادھار کھائے بیٹھا تھا کیونکہ سارنگ اس کے ایک ماتحت اشوک کو قتل کرنے کے جرم کا مرتکب ہوا تھا۔

”ہوں.....! اب تو تمہارے پاکستانی جاسوس ہونے میں شبہ نہیں رہا..... اب تم اپنے دوسرے ساتھیوں کے نام بھی بتاؤ گے۔“ خزانٹ انڈین آفیسر نے سارنگ سے غراتے ہوئے پوچھا۔ اسے کمرے کے وسط میں ایک اسٹول نما کرسی پر بٹھایا گیا تھا۔

”میرے سانحی تم نے دیکھ ہی لیے ہیں آفیسر.....! ایک مصیبتوں کی ماری عورت، اس کا نومولود بچہ اور ایک گیارہ سالہ لڑکا.....!“ سارنگ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”تو تم اب بھی انکاری ہو کہ تم پاکستانی جاسوس نہیں ہو.....؟“

”میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تم آخر مجھے زبردستی پاکستانی جاسوس بنانے کیوں تلے ہوئے ہو.....؟“ بالآخر سارنگ نے اس بات تلخ لہجے میں کہا تو وہ خزانٹ آفیسر یکدم ہی ہتھے سے اتر گیا اور اس نے فوجی بوٹ سارنگ کے چہرے پر رسید کر دیا۔

سارنگ کے حلق سے اذیت ناک چیخ خارج ہو گئی وہ پیچھے الٹ گیا، اسٹول زمین کے ساتھ نصب تھا..... انڈین آفیسر نے خونخواری کے ساتھ سارنگ کو گریبان سے پکڑ کر کھڑا کیا اور

اس کی آنکھوں میں گھورتا ہوا ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

”تم نے ہمارے چار اہلکاروں کے ساتھ جنگ کی پھر ایک کو قتل کر کے ان کی جیب لے کر فرار ہو گئے..... یہ کارنامہ کسی عام یا معمولی آدمی کا نہیں ہو سکتا..... ایسا ایک تربیت یافتہ ایجنٹ ہی کر سکتا ہے..... کیا تم نے مجھے بے وقوف سمجھ رکھا ہے؟“

”میں..... میں..... سچ کہہ رہا ہوں.....!“ سارنگ نے بمشکل ہانپتے ہوئے کہنے کی کوشش کی۔

انڈین آفیسر نے ایک گھونسا اس کے چہرے پر جڑ دیا اور دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

”تمہارے لیے حتمی احکامات مجھے اوپر سے لینے ہی پڑیں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے وہاں موجود اپنے دیگر اہلکاروں کو مخصوص اشارہ دیا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا..... اس کے کمرے سے نکلتے ہی سارنگ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے بیدردی سے کونے میں ڈال دیا گیا اور جب وہ جانے لگے تو سارنگ نے جنونی انداز میں چیختے ہوئے بھابی اللہ وسائی اور فرید وہ کے بارے میں پوچھا مگر وہ لوگ کوئی جواب دیئے بغیر وہاں سے چلے گئے۔

سارنگ بے بسی کے عالم میں اپنا سر پٹتارہ گیا، مایوسی اور تفکر نے مل کر اسے نڈھال سا کر دیا تھا لیکن پھر فوراً ہی اس نے اپنی منتشر اور پریشان کن کیفیات پر قابو پا لیا اور اللہ سے دعا مانگنے لگا۔ اللہ کا ذکر کرنے کے دوران اس کے اندر قدرتی طور پر ہمت جاگنا شروع ہوئی اور اسے یقین کامل ہونے لگا کہ اللہ نے جہاں اسے اب تک ایسی کٹھن مشکلوں سے نکالا تھا، وہی آئندہ بھی ضرور اس کی مدد کرے گا..... بس ذرا ہمت، جو صلے اور جرأت سے کام لینا تھا۔ یہ سوچ کر اس نے مفکر کی راہ کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا..... اس کے کانوں میں اب بار بار اس سفاک انڈین آفیسر کے زہر خند الفاظ گونجنے لگے جس نے جاتے سے دھمکی آمیز انداز میں کہا تھا۔ ”اس کے بارے میں اب اسے اوپر والوں سے احکامات لینے پڑیں گے۔“ جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ خمیٹ آفیسر اب سارنگ کی زندگی اور موت کا فیصلہ ادھر ہی کرنا چاہتا تھا۔ سارنگ کو اپنی بھابی اللہ وسائی اور فرید وہ کی فکر ستانے لگی کہ جانے ان خمیٹوں نے ان بے چاروں کو کہاں قید کر رکھا تھا۔ سارنگ کی ایک مجبوری یہ بھی تھی کہ اس بار اس کے ہاتھ، پاؤں اپنی زنجیروں سے جکڑ دیئے گئے تھے اور وہ ٹھٹھی سا بنا ہوا تھا، اس حالت میں پڑے رہنے کی وجہ سے اس کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا..... اس عقوبت خانے میں صرف ایک یرقان زدہ بلب روشن تھا، بوسیدہ سے فرش کے وسط میں نصب اپنی اسٹول اور خود اس کے علاوہ باقی ہر چیز سے عاری یہ عقوبت خانہ اور بھی بھیا تک

محسوس ہو رہا تھا، باہر رات دے پاؤں بیت رہی تھی اور سارنگ کو گٹھڑی بننے اسی حالت میں جانے کتنے گھنٹے بیت گئے۔ کمرے میں روشن دان کے نام پر صرف ایک چوکور ساروزن بنا ہوا تھا جہاں سے ٹٹماتے ہوئے تاریک آسمان کا مقدور بھر مظر نظر آ رہا تھا۔ نیند تو سولی پر بھی آ جانے کے مصداق سارنگ وہیں ایک کونے میں گٹھڑی بنا سو گیا۔

ایک کھڑکے سے وہ جاگا تو کیا دیکھتا ہے کہ دو گن بردار باوردی انڈین اہلکار ملک الموت کی طرح اس کے سر پر کھڑے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہاں سے آنے والے دن کے اجالے سے سارنگ کو احساس ہوا کہ صبح ہو چکی تھی۔ ایک اہلکار نے ہاتھوں میں بد وضع سی ٹرے تھام رکھی تھی اور اس کی کمر سے مشین گن کی سیاہ نالی جھانک رہی تھی جبکہ دوسرا اپنے ہاتھوں میں گن تھامے اس کی نال کا رخ اس کی طرف کئے کھڑا تھا۔ پہلے والے نے اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی ٹرے سارنگ کے قریب زمین پر رکھی پھر وہ سارنگ کے بند کھولنے لگا۔ سارنگ کو اگرچہ اس موقع کا انتظار تھا مگر وہ بیک وقت ان دونوں مسلح اہلکاروں سے بھڑنے کا خیال بھی دل میں لانے سے کترار ہا تھا لیکن جب اس کے سارے جکڑ بند کھول کر اسے ایک اہلکار نے پر غرور اور نخوت بھرے انداز میں یہ بتایا۔ ”اوپر والوں نے اسے فائرنگ اسکوڈ کے آگے پیش کرنے کا حکم دیا ہے۔“ تو پھر سارنگ نے کر دیا مرنے والے اصول پر ہر ممکن خود کو بچانے کی کوشش کا مصمم ارادہ کر لیا۔

وہ ٹرے کی طرف متوجہ ہوا مگر اس کے وجود میں لہورنگ سنائے اترے ہوئے تھے۔ وہ دونوں اہلکار وہاں سے جانے لگے۔ سارنگ نے زمین پر بیٹھے بیٹھے دزدیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور پھر جیسے اچانک اس کی رگوں میں پارہ دوڑ گیا۔ وہ بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ حرکت میں آیا اور انجام سے یکسر غافل ہو کر دروازے کے آگے پیچھے بڑھتے ہوئے دونوں اہلکاروں میں سے پیچھے والے پر سارنگ چیتے کی طرح جھپٹا اور آں واحد میں اس کی کمر سے جھولتی ہوئی گن اپنے قبضے میں کرتے ہی اسے زور سے دھکا دیا، وہ اپنے آگے والے مسلح ساتھی سے جا ٹکرایا۔ پھر جب تک دونوں سنہلے، سارنگ نے خود کار مشین گن کا رخ ان کی طرف کرتے ہوئے لبلبی دبا دی۔ برست چلنے کی خوفناک آواز گونجی اور وہ دونوں اہلکار کر یہہ چیخوں کے ساتھ زمین پر گر کر خاک و خون میں تڑپنے لگے۔ سارنگ پھرتی کے ساتھ ان لاشوں سے چھلانگیں لگاتا ہوا ایک مختصری ویران راہداری میں آ گیا اور سیدھا دوڑتا چلا گیا تب اچانک اس نے دیکھا، سامنے وسیع بال تھا اور آٹھ دس کے لگ بھگ باوردی انڈین اہلکار گنیں تھامے اس کی طرف آ رہے تھے مگر

سارنگ نے انہیں سنہلنے کا موقع دیئے بغیر ان پر اوپر تلے برست فائر کر دیئے۔ نصف سے زائد اہلکار دلخراش چیخوں کے ساتھ تیور اگر گرے اور باقی چند بچے کھچے اہلکار دیوار کے ساتھ چپ گئے اور انہوں نے نے بیک وقت سارنگ پر فائر کھول دیا۔

سارنگ نے بمشکل خود کو اندھا دھند فائرنگ کی زد سے بچایا اور راہداری کی اندرونی دیوار کی اوٹ میں ہو گیا، وہ دشمنوں کو سنہلنے کا موقع دیئے بغیر بدستور انہیں حملے کی زد پر رکھنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے دوبارہ ان پر فائر کھول دیا۔ اس وقت اندر سائرین بج اٹھا۔ سارنگ کو امید تھی کہ اس دور افتادہ اور مختصری چوکی میں زیادہ نفری نہ ہوگی۔ اس کے دوسرے حملے نے دو چار کو مزید گرا دیا جبکہ ایک نے بھاگنے کی کوشش کی تو سارنگ نے اسے پکڑ لیا اور پھر اس سے پہلے کہ سارنگ اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرتا، اچانک سامنے کی راہداری میں بھاری بولوں کی چاپ ابھری۔ سارنگ نے زخمی اہلکار کی گن چھین کر اسے لاشوں کی طرف دھکیل دیا پھر ایک گن اس نے کمر سے لگائی اور دوسری ہاتھ میں پکڑ لی۔ راہداری میں تین اہلکار نمودار ہوئے، ان میں ایک وہی سفاک انڈین آفسر تھا جسے دیکھ کر سارنگ کے تن بدن میں آگ لگ گئی مگر پھر اس سے پہلے کہ وہ ان تینوں کو اپنی گن کے نشانے کی زد میں لیتا، ان تینوں نے سارنگ پر تراتر گولیاں برسا دیں۔ سارنگ کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

☆=====☆

ملوکان اور سانول کی شادی کی تاریخ اٹھارہ دن بعد طے کر دی گئی تھی، چاچا سکھو کی بیوہ سے بات کرنے کے بعد اگرچہ ماما اللہ رکھیو مطمئن ہو گیا تھا مگر ابھی اس نے ایک آخری مشورہ اپنے چیمپے بھانجے سانول سے بھی کرنا تھا چنانچہ وہ سکھو کی بیوہ سے ملنے کے بعد واپس اپنے گھر پہنچا اور سانول سے کہا۔ ”پٹ.....! تیرے سے ایک بات کرنی تھی۔“

”ہاؤ ماما.....! سن رہا ہوں۔“

”پٹ.....! میں تیرے بیاہ کی تاریخ پکی کر آیا ہوں، بس چٹ مٹنی پٹ بیاہ۔“

”نھیک ہے ماما.....! جیسے تیری مرضی، میں نے کب انکار کیا ہے۔“ سانول نے

بنے تاثر لہجے میں کہا۔

”دیکھ پٹ.....! میں تجھ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“ ماما اللہ رکھیو نے

کہا پھر سانول کی مستفسرانہ خاموشی پر وہ آگے بولا۔ ”بھاسکھیو کو اللہ سائیں جنت نصیب کرے، اس کے گزر جانے کے بعد سے اس کی بیوہ اور بیٹی بالکل بے سہارا رہ گئی ہیں۔ ملو کاں کی شادی کے بعد وہ دونوں عورتیں اور بھی تنہا رہ جائیں گی۔ میں چاہتا تھا کہ ملو کاں سے شادی کرنے کے بعد تو ان دونوں، دھیوں کا سہارا بن کر ان کے ساتھ رہے تو یہ بڑا ثواب کا کام ہوگا۔“

ماما اللہ رکھیو کی بات سن کر سانول یکدم پریشان سا نظر آنے لگا۔ یوں تو وہ اپنے ماما کی کوئی بات مشکل ہی سے نالتا تھا مگر یہ بات اس کے گلے سے نہیں اتر رہی تھی، وہ بولا۔ ”ماما! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”اس میں بھلا ہونے کو کیا ہے پٹ.....!“ ماما نے کہا۔ ”میں نے سیدھی سی بات تیرے سامنے رکھی ہے۔“

”پر ماما! تو بھی تو اکیلا رہ جائے گا؟“

”اڑے تو میری فکر کیوں کرتا ہے، میں تیرے سے دور تھوڑی ہوں، ایک ہی گوٹھ میں تو ہم رہتے ہیں۔ اب ایسا بھی نہ ہوگا کہ ہم ایک دوسرے کے پاس آنا جانا چھوڑ دیں۔“ ماما نے اس کی ہمت بندھائی۔

”ماما! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ملو کاں کی چاچی اور میراں ادھر ہی ہمارے پاس آ کر رہیں؟“ سانول نے جیسے مفکر کی آخری راہ ڈھونڈی۔

”میں نے یہ کہا تھا سکھیو کی بیوہ سے پر اسے یہ منظور نہیں، ویسے اس کی بات درست ہے، تیرا وہاں رہنا تو مجھ میں آتا ہے پر ان کا یہاں رہنا نہیں۔ ویسے بھی تو اور ملو کاں اس کے مرحوم باپ کی جھگی میں رہو گے، تھوڑے پیسے ہو جائیں گے تو دونوں جھگیوں کو ملا کر کچی دیواریں کھڑی کر کے کچا ہی گھر بنالیں گے۔“ ماما کی بات سن کر سانول چپ ہو رہا۔

☆ ===== ☆

آچر خان نے خالقو اور سانول کے خلاف جو خفیہ سازش تیار کی تھی، اسے حتمی شکل دینے کے لیے اس نے اپنے ایک خاص گماشتے بہرام کو بلایا تھا۔ بہرام ماضی میں ایک بدنام اور خطرناک ڈاکو رہ چکا تھا، جس نے دادو اور سہون کے علاقے میں خاصی دہشت اور لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا، وہ بہرہ و دھاریل کے نام سے مشہور تھا پھر گزشتہ دنوں ڈاکوؤں کے خلاف آپریشن کلین اپ کی وجہ سے نصف سے زائد خطرناک ڈاکوؤں کو لوٹوں کا قلع قمع کر

دیا گیا تو بہرہ و پوش ہو گیا تھا۔ ٹھنڈے کے اندرونی علاقے میں بہرام بن کر رہنے لگا تھا، اس کے روہ کا بھی قلع قمع کر دیا گیا تھا، اگرچہ پولیس اب بھی اس کی تلاش میں تھی مگر چونکہ وہ ایک عرصے سے وارداتوں کا سلسلہ موقوف کر کے بظاہر شریفانہ زندگی گزار رہا تھا اس لیے نہ رفتہ پولیس اسے فراموش کرنے لگی تھی، اب وہ ٹھنڈے میں ہی ایک بااثر و ذریعے کا ملازم بن چکا تھا لیکن جیسا کہ مثل مشہور ہے چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے اسی لئے بہرہ و، وڈیرے کی پشت پناہی اور اس کے مفادات کے لیے گاہے بگاہے خفیہ مجرمانہ کارروائیوں میں مصروف رہتا تھا۔

آچر خان کے بلاوے پر وہ فوراً آ گیا تھا۔ بہرام چالیس پینتالیس سال کا ایک تنو مند شخص تھا، رنگ سانولا تھا، چہرے پر ہلکی داڑھی، مونچھیں جو کھنی ہوا کرتی تھیں، اب باریک کر لی تھیں، اس نے شیشے کے کام والی سرخ سندھی ٹوپی پہن رکھی تھی اور کاندھوں پر اجڑک..... مٹھی میں بیڑی دبی رہتی تھی۔

”حکم کرو سائیں! بہت دنوں بعد یاد کیا، کسی کو لٹانا ہے تو بولو پر میرا حساب صاف رکھنا پڑے گا۔“

آچر خان اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”اڑے تو کیا سمجھتا ہے کہ میں نے تیرے کو اتنی دور سے مفت میں بلایا ہے..... فکر نہ کر، تیرا حساب میں نے پہلے ہی سے باندھ رکھا ہے۔“

اس کی بات سن کر بہرام کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نمودار ہو گئی، وہ بولا۔ ”کام بتاؤ اب!.....!“

”کام شاید مشکل ہے پر تیرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے مگر کرنا جلدی ہے.....“ آچر خان لمحہ بھر توقف کے بعد دوبارہ مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولا۔ ”ایک آدمی ہے تھانے کے لاک اپ سے اسے باہر نکالنا ہے اور بس تیرا کام ختم.....!“ اس کی بات سن کر بہرام کو چپ سی لگ گئی۔

”کیوں یارا!.....! چپ کیوں ہو گیا، کوئی ڈسٹرکٹ جیل سے قیدی چھڑانے کا کام تو نہیں لے رہا ہوں میں تجھ سے..... گوتھ کے تھانے کی کچی دیواروں کے پیچھے ایک قیدی کو بہرنگنا کیا مشکل ہے تیرے لیے.....؟“

”مشکل تو نہیں ہے پر آچر سائیں تو تو جانتا ہی ہے کہ یہ کام اکیلے کرنے کا نہیں ہے اس کے لیے پورے ٹولے کی ضرورت پڑتی ہے، اور میں اب اکیلا رہ گیا ہوں۔“ بہرام

نے عذر تراشا۔

”اڑے یار بہرہ.....! تو کیسی باتیں کرتا ہے، تو خود ایک بڑے گروہ کا سرغنہ رہ چکا ہے، یہ تیرے اکیلے کا ہی کام ہے۔“ یہ کہہ کر آچرخان نے اپنی قمیض کی اندرونی چار بیسوں والی صدی سے بڑے نوٹوں کی گڈی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی اور بولا۔ ”پورے بیس ہزار ہیں..... کام کے بعد اتنے ہی اور ملیں گے..... منظور ہے تو بول نہیں تو اور کسی کو دیکھوں؟“

نوٹوں کی ایمان ڈولنے والی جھلک دیکھ کر بہرام کی ساری تاویلیں دھری کی دھری رہ گئیں، وہ جھٹ سے انہیں اپنی جیب میں ڈال کر بولا۔ ”قیدی کا نام بتا.....!“

”خالقو.....!“

”کس جرم میں سزا کاٹ رہا ہے.....؟“

”ابھی اسے سزا تو نہیں ہوئی پر جلد ہی اسے شہر کی بڑی جیل منتقل کیا جانے والا ہے..... ویسے وہ اپنے چاچا کو قتل کرنے کے جرم میں لاک اپ میں ہے۔“ آچرخان نے بتایا۔

”ٹھیک ہے پھر آج رات کو یہ کام ہو جائے گا۔“

”یہ ہوئی ناں یاروں والی بات.....!“ آچرخان نے اسے گلے لگالیا۔

وہ دونوں اس وقت ہوٹل کے ایک اندرونی گوشے میں جو گفتگو تھے۔ بہرام وہاں سے نکلا اور سیدھا گوٹھ کے تھانے کی طرف روانہ ہوا تھا، تھانے کے قریب پہنچ کر اس نے اچھی طرح اس کے محل وقوع کا جائزہ لیا اور اس کی پولیس نفری کے بارے میں اندازہ لگایا کہ وہ زیادہ نہیں تھی، تھانے کے عقب میں تین چار رہائشی کوارٹرز بھی تھے جبکہ تھانے کا انچارج انسپلر مچھل شاہ اپنے کوارٹر میں ہی رات بسر کرتا تھا اور تھانے کے اندر چند قیدیوں کی وجہ سے رات کو پولیس پہرہ بھی چند ہی افراد پر محمول ہوتا تھا، اپنے طور پر یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد اسے اپنا کام خاصا آسان نظر آنے لگا تھا، اب اسے رات کا انتظار تھا۔

☆=====☆=====☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی..... ایک سیاہ چادر میں ملفوف سایہ تھانے کی شرٹی دیوار کو پھاندر اندر کودا..... قریب ہی ایک پولیس کی خستہ حال موہاں پتھروں پر کھڑی تھی، وہ سایہ لپک کر اس کی آڑ میں ہو گیا اور چند ثانیے اس کی آڑ میں دبک کر سامنے عمارت کے

برآمدے کو گھورنے لگا جہاں بیماری روشنی پھیلی ہوئی تھی، جب وہاں اسے کوئی ذی نفس گردش کرتا دکھائی نہ دیا تو وہ پراسرار سایہ جو بلاشبہ بہرام تھا، خستہ حال موہاں کے عقب سے نکلا اور محتاط روی کے ساتھ جھکے جھکے انداز میں چلتا ہوا تھانے کے نیم تارک برآمدے میں آگیا، یہاں سامنے ایک سیلن زدہ سی تارک رابدری تھی جس کے دائیں بائیں سلاخ دار لاک اپ کے دروازے نظر آ رہے تھے باقی رابدری کے سرے پر تین چار کمرے تھے جن پر چھتیں جھول رہی تھیں، تھانے میں ویرانی سی مسلط تھی..... کم خطرناک قیدیوں کی وجہ سے شاید تسابل پسند پہرے دار بھی ادھر ادھر کھسک گئے تھے مگر پھر اچانک بہرام کو دو آدمیوں کے ہنسی ٹھٹھے کی آوازیں سنائی دیں، وہ ٹھٹک کر آواز کی سمت دیکھنے کی کوشش کرنے لگا، سامنے تاریکی کے بطن سے اسے دو پولیس والے سگریٹ پیتے ہوئے آتے دکھائی دیئے..... ایک کے ہاتھ میں ریڈیو دبا ہوا تھا جس سے مائی بھاگی کے لازوال گیت کے بول ”کھڑی نیم کے نیچے ہوں تو ہیکلی“ ابھر رہے تھے۔

وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے قہقہے لگاتے برآمدے کی طرف ہی آ رہے تھے، بہرام نے اندازہ لگایا یہ دونوں شبینہ ڈیوٹی پر تعینات تھے، اسے اپنا کام اور بھی آسان محسوس ہونے لگا، بہرام اپنی جگہ پر دم سادھے بیٹھا اب ان دونوں من موجدی سپاہیوں کے کہیں نکلنے کا منتظر تھا پھر وہ دونوں سپاہی کھڑکھڑاتے ہوئے کے ساتھ برآمدے کی سیلن زدہ سیڑھیاں چڑھ کر قید خانے والی رابدری میں داخل ہوئے اور دو تین چکر لگانے کے بعد وہیں ایک محرر کے لیے بچھی ہوئی میز اور کرسیوں پر براجمان ہو گئے اور ریڈیو میز پر رکھ کر آواز بڑھا دی..... بہرام شکاری بھیڑیے کی طرح گھات لگائے مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا مگر پھر جلدی ہی اسے احساس ہو گیا اسے یہ مناسب وقت خود ہی نکالنا پڑے گا..... یہ سوچ کر اس نے ایک بار پھر تھانے کی اندرونی عمارت اور احاطے کے گرد ایک چکر لگایا، یہ تسلی کرنے کے بعد کہ پورے تھانے میں ان دونوں سپاہیوں کے علاوہ اور کوئی یہاں موجود نہ تھا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ان دونوں میں سے ایک سپاہی اٹھا اور چحق اٹھا کر ایک کمرے کے اندر چلا گیا۔

ذرا دیر بعد باہر آیا تو ہاتھوں میں رلیوں اور چادروں کے بستر دبائے ہوئے تھا، وہ اس نے برآمدے میں بچھا دیئے پھر اندر سے دو بوسیدہ تیکے بھی اٹھالایا۔

”چل ڈے محمد بخش.....! کھاٹ اٹھالائیں..... آج برآمدے کی بجائے باہر احاطے میں سوتے ہیں، آج بڑی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔“ ایک سپاہی نے کہا۔

آچر خان نے اسے خالقو کا حلیہ اچھی طرح ذہن نشین کروا دیا تھا۔ بہرام نے پہلے پہلے خالقو کو فوراً پہچان لیا جبکہ دوسرے لاک اپ کے فرش پر لیٹا ہوا شخص ایک ادھیڑ عمر و قد رے تو مند تھا، بہرام جلدی سے آواز پید کئے بغیر خالقو، الے لاک اپ کے تالے میں چابیاں آزمانے لگا اور بالآخر تالا ہلکی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ اس کا دل ٹپٹیوں میں جھک رہا تھا، تالا کھول کر اس نے بغلی دروازہ آہستگی کے ساتھ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ پھر خالقو جگانے لگا، تھوڑی کوشش کے بعد خالقو نے آنکھیں کھول دیں، وہ بری طرح غصہ کا مگر بہرام نے اسے خاموش رہنے کی ہدایت کی اور جلدی سے اسے لے کر باہر نکل آیا۔

دونوں دبے پاؤں آگے پیچھے چلتے ہوئے تھانے کی عمارت سے باہر آگئے اور پھر کافی دور آکر راستے میں بہرام نے اسے بتا دیا کہ اسے آچر خان نے بھیجا ہے، خالقو اسے اپنا نام بھی بتا چکا تھا، آچر خان کی ہدایت کے مطابق بہرام، خالقو کو لئے اس کے ہول میں آ گیا، ہول بند تھا، لکڑی کی میزیں اور کرسیاں ایک دوسرے پر الٹی پڑی تھیں اور ان کے گرد زنجیریں بندھی ہوئی تھیں، آس پاس ویرانی کا راج تھا، ایک بلب ہول کے چھپرے سے جھول رہا تھا، سامنے ایک کمرے سے روشنی پھوٹ رہی تھی، دروازہ کھڑا ہوا تھا، یہ دونوں دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئے، سامنے ایک کھری چارپائی پر آچر خان لیٹا سگریٹ پھونک رہا تھا، آہستہ پر آہستہ کراٹھا اور بہرام کو کامیاب دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”لے یارا۔۔۔! پکڑاؤں آدمی۔۔۔ میں نے تیرا کام کر دیا۔۔۔ لا اب باقی کی رقم سے تو میں اندھیرے میں ہی نکل جاؤں۔“ بہرام نے بہ نکت کہا تو آچر خان نے اس کا ہاتھ دبا کر آنکھوں کا مخصوص اشارہ دیا پھر اس نے جیب سے ایک پستول نکال کر خالقو کو نماتے ہوئے بولا۔

”خالقو۔۔۔ ایک آخری کام کر دے۔۔۔ بس پھر تیرے وارے نیارے۔۔۔“

”کک۔۔۔ کون کام سائیں۔۔۔!“ خالقو الجھ کر بولا۔

”یہ پستول پکڑو اور اسی وقت سانول کے گھر کی طرف نکل جا۔۔۔ میں اور بہرام تیرا ہاتھ انتظار کر رہے ہیں۔“ آچر خان نے سنناتے لہجے میں سرگوشی کی۔ ”تجھے اب سانول کا تمام کرنا ہے۔“

خالقو اس کی بات سن کر پریشان ہو گیا، آچر خان اسے متذبذب پا کر بولا۔ ”اڑے سانول کا کام تمام کرنا ضروری ہے، تو نہیں جانتا تیری بہن ملوکان اور سانول کی عنقریب

”باؤ یار سو ہنرا۔۔۔! آج تو واقعی گرمی بھی کم ہے اور ہوا بھی ہے۔ چل پھر۔۔۔“ دوسرے نے جواباً کہا تو بہرام چوکس ہوا کر بیٹھ گیا، اس کا دل بلیوں اچھٹے لگا، وہ دونوں سپاہی باہر احاطے میں سونے کا ارادہ کر رہے تھے، اس طرح بہرام کے منصوبے میں مزید آسانی ہو سکتی تھی۔

دونوں سپاہی اپنی اپنی کھاٹ اٹھائے باہر کشادہ جگہ پر لیاں بچھائے لیٹ گئے مگر ابھی وہ سوئے نہیں تھے، بہرام ان کے سونے کا انتظار کر رہا تھا، وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ دوسرے سپاہی کو جانے کیا سوچھی، اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”اڑے یار محمد بخش۔۔۔! کہیں مروانہ دینا صبح صاحب نے ہمیں اس طرح پڑے سوتا دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی۔“

”اڑے یار۔۔۔! کچھ نہیں ہوتا، خود صاحب (انسپکٹر) اپنے کوارٹر سے دس بجے سے پہلے نہیں نکلتا۔۔۔ ہم اس سے پہلے ہی جاگ جائیں گے۔“

وہ دونوں اس قیامت سے بے خبر تھے جو بہرام کی صورت میں چھپی ہوئی تھی پھر تھوڑی دیر بعد دونوں کے خزانے گونجنے لگے، ان دونوں نے اپنی میٹھیں اتار کر چارپائیوں کی پائنتی پر ڈال دی تھیں اور بہرام کو یقین تھا کہ لاک اپ کی چابیاں ان دونوں کی قمیضوں کی کسی ایک جیب میں ضرور موجود ہوں گی، نہ بھی ہو تیس تو اس نے اس کا بھی بندوبست کر رکھا تھا جو مشکل طلب مرحلہ ضرور تھا مگر ناممکن نہ تھا لیکن بہرام نے اپنا کام آسان پاتے ہی یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ خاموشی سے ان کے قریب جا کر چابی اڑالے گا۔ ذرا دیر مزید اپنی جگہ دبکے رہنے کے بعد وہ دبے پاؤں گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے چارپائیوں کے قریب آیا پھر دم سادھ کر اس نے پہلے ایک قمیض کی تلاشی لی، وہ خالی تھی پھر دوسری قمیض سے چابیوں کا گچھا اس کے ہاتھ لگ گیا، اس نے چابیوں کا گچھا ہاتھ میں لیا اور جب واپس پلٹنے لگا تو اچانک ایک سپاہی نے کروٹ بدلی۔۔۔ بہرام ٹھٹک گیا اور فوراً چو پائیوں کی طرح چارپائی کے نیچے سرک گیا، کروٹ بدلنے والا سپاہی تھوڑا کھانسنے لگا۔۔۔ بہرام دم سادھے ملی کی طرح چارپائی کے نیچے دبکا رہا پھر جب خاموشی چھا گئی تو وہ بچوں اور گھٹنوں کے بل چلتا ہوا چارپائی سے نکل کر برآمدے میں آیا اور بے آواز تیزی کے ساتھ چلتا اندر نیم تاریک راہداری میں آ گیا، دائیں طرف دو لاک اپ تھے، دونوں ہی میں قیدی پڑے سو رہے تھے، تیسرے کمرے کا دروازہ لوہے کا تھا جو بند تھا، بہرام نے اندازہ لگایا یہ کمرہ شاید کوئی اسٹور وغیرہ تھا۔

آچر خان اور بہرام خالقو کی واپسی کے بے چینی سے منتظر تھے، خالقو کے فرشتوں کو بھی اپنے خلاف تیار ہونے والی اس سازش کا علم نہ تھا کہ موت کا فرشتہ اس کی بھی گھات میں بیٹھا تھا مگر کہاں.....؟ آچر خان کے ہوٹل میں یا ادھر جہاں وہ کسی کی زندگی کا چراغ گل کرنے جا رہا تھا، قسمت دونوں طرح سے سفاک آچر خان کا ساتھ دے رہی تھی، چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر..... دونوں ہی صورت میں آچر خان کا کام آسان تھا۔

☆ ===== ☆ ===== ☆

شادی ہونے والی ہے، تیری بیوہ چاچی اور سانول کے ماما اللہ رکھو نے دونوں کی بات پکی کر دی ہے۔ تو اپنا کام پورا کر کے ادھر ہی آ جانا پھر بہرام کے ساتھ میں تجھے اس علاقے سے بہت دور بھیج دوں گا..... وہاں تو بہت مزے کی زندگی گزارے گا..... جاہلت کر.....!

آچر خان کے ہمت دلانے پر خالقو تیار ہو گیا، اس کے پاس اب آچر خان کی بات ماننے کے سوا چارہ ہی کیا تھا، وہ خود اس علاقے میں نہیں رہنا چاہتا تھا، پولیس کا ڈر بھی تھا اسے چنانچہ وہ فوراً پستول منجھالے وہاں سے نکل گیا البتہ بہرام کے چہرے پر الجھن آمیز تاثرات صاف عیاں ہو رہے تھے اور پھر خالقو کے وہاں سے جاتے ہی اس نے آچر خان سے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اڑے سامیں.....! اس کو میرے گلے کیوں ڈال رہا ہے۔ اس طرح پولیس میرے بھی پیچھے لگ جائے گی، کیوں مجھے مروارہ ہے.....؟“

اس کی بات پر آچر خان کے مکروہ لب سیاہ پر معنی خیز مسکراہٹ رقصاں ہو گئی اور پھر وہ اس کے کاندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ دھرتے ہوئے چار پائی پر بٹھا کر بولا۔ ”بہرام.....! میری بات سن..... پر پہلے یہ پکڑ اپنے باقی کے پیسے.....“ یہ کہہ کر آچر خان نے اپنی جیب سے چند بڑے نوٹوں کی گڈی اسے تھما دی جسے بہرام نے جلدی سے اپنی قمیض کی جیب میں رکھ لیا اور بدستور مستفسرانہ نظروں سے آچر خان کی طرف دیکھنے لگا تب آچر خان دھیمی آواز میں بتانے لگا۔ ”بہرام.....! تو تیاروں کا یار ہے، بس میرا ایک آخری کام اور کر دے..... یہ خالقو جیسے ہی اپنا کام پورا کر کے لوٹے تو تو اسے اپنے ساتھ لے جانا اور کہیں دور لے جا کر اس کا کام تمام کر دینا۔“

بہرام اس کی بات سن کر بری طرح چونکا مگر اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی آچر خان دوبارہ بولا۔ ”تو فکر نہ کر اس کام کے میں تجھے الگ سے پیسے دوں گا۔“

”وہ تو ہیک ہے آچر خان.....! لیکن اسے قتل کرنے کی کیا ضرورت ہے، اگر خالقو کو قتل کر، ہی ضروری تھا تو پھر اسے حوالات سے کیوں فرار کروایا تھا؟“ بہرام نے قدرے الجھ کر پوچھا۔

”مجھے ذر تھا کہ کہیں خالقو پولیس تشدد سے مجبور ہو کر میرا نام نہ لے دے کہ اس نے میرے ہی کہنے پر سکھو چاچا کا قتل کیا تھا پھر میں بھی پکڑا جاتا..... اب اس کام کے بعد میرے آگے کوئی رکاوٹ نہ رہے گی۔“

بہرام اس کی بات سن کر دھیرے دھیرے پر خال انداز میں اسے سر کو جنبش دینے لگا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا جواد.....! جب میرے ممّا، پاپا کو اس بات پر اعتراض نہیں تو پھر تم کیوں معترض ہو؟“

”فوزیہ.....! بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“ ڈاکٹر جواد نے متحمل لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری آگے چل کر اپنی لائف بھی ہوگی، تمہارے ممّا، پاپا کے گھر کی اور بات ہے، جب ہم دونوں ایک الگ گھر میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کریں گے تو.....!“

”تو تب کی تب دیکھی جائے گی۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے اپنی ہٹ پر قائم رہتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ڈاکٹر جواد کے چہرے پر ایک لمبے کوتھنی کے آثار نمودار ہوئے مگر وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے بالآخر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ”نہیں فوزیہ.....! اس بات کو ابھی کلیئر ہونا چاہئے۔“

”آف کورس..... میں بھی یہی چاہتی ہوں۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے بھی بلاتل سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”جب تک میرے بازو میں قوت ہے، میں سدھوراں کو مصیبت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی اور جب بھی موقع ملا، میں اس کی مدد کرنے سے منہ نہیں موڑوں گی..... میرا یہ آخری فیصلہ ہے۔“

پھر اس دن کے بعد سے دونوں میں بات چیت بالکل بند ہوگئی حالانکہ اب ان کی منگنی میں صرف دو دن رہ گئے تھے مگر ان کے بڑوں کو ان دونوں کی ناراضی کا قطعاً علم نہ تھا، یہ تو اس وقت پتہ چلا جب ڈاکٹر جواد احمد کی طرف سے منگنی سے انکار ہو گیا، ڈاکٹر فوزیہ تنہائی سے مسکرا کر رہ گئی تاہم ان دونوں کے گھر والوں کو شدید حیرانی ہوئی تھی چونکہ یہ خالصتاً لڑکے، لڑکی کا معاملہ تھا اس لیے جب ان سے منگنی سے انکار کی وجہ پوچھی گئی تو راز کھلا کہ معاملہ کیا تھا۔ ڈاکٹر فوزیہ کے ممّا، پاپا نے تو کوئی خاص پروا نہ کی کیونکہ انہوں نے سب کچھ اپنی لاڈلی اور اکلوتی بیٹی کے سپرد کر رکھا تھا، وہ اپنے برے بھلے کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتی تھی لیکن ڈاکٹر جواد کی والدہ ماجدہ خاتون اس صورت حال سے خاصی حد تک آزرده تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کا فرماں بردار بیٹا جواد احمد فوزیہ کو کس قدر چاہتا تھا۔ وہ ایک بردبار اور نیک صالح خاتون تھیں، ان کا تعلق اپر مل کلاس سے تھا، شوہر کا انتقال جواد احمد کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا، وہ بینک کے افسر تھے لہذا ماجدہ خاتون کی اپنے بیٹے جواد احمد کی پرورش میں زیادہ وقت پیش نہ آئی تھی، گلستان جوہر میں ان کا چھوٹا سا اپنا بنگلہ تھا جو حال ہی میں انہوں نے لیا تھا۔

”بیٹا.....! فوزیہ ایک اچھی لڑکی ہے، اگر اس کے دل میں کسی کی ہمدردی کا درد ہے تو یہ کوئی ایسی برائی نہیں کہ تم اس سے بالکل ہی ناراض ہو کر بیٹھ جاؤ۔“ ماجدہ خاتون نے پیار

سدھوراں ایک بار پھر اپنی ہمدردی سے ڈاکٹر فوزیہ کے ساتھ رہنے لگی تھی مگر اس بار اس کی گود میں ایک ننھا وجود بھی ہلک رہا تھا۔ یوں سدھوراں کا اپنی حسد پر بوجھ بننے پر دل مائل نہیں ہوا تھا مگر وہ مجبور تھی، اس کا شوہر پرویز لاپتہ ہو چکا تھا اور پولیس اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ یوں تو ڈاکٹر فوزیہ نے گھر آتے ہی موبائل پر انسپکٹر مشتاق احمد سے رابطہ کیا تھا اور پرویز کے سلسلے میں ان سے مدد کی بھی درخواست کی تھی کیونکہ سدھوراں نے ڈاکٹر فوزیہ کو بتا دیا تھا کہ پرویز نے برے کاموں سے کنارہ کشی کر کے جب شریفانہ راہ اپنانا چاہی تو پھر اس کے ساتھی اس کی جان کے دشمن ہو گئے۔

انسپکٹر مشتاق احمد نے پرویز کے سلسلے میں ڈاکٹر فوزیہ کو اپنے تعاون کا یقین دلایا مگر یہ سب تب ہی ممکن ہو سکتا تھا جب پرویز ہاتھ آتا، وہ تو سرے سے ہی لاپتہ ہو گیا تھا۔ سدھوراں کو جہاں اپنے ماں بننے کی بے حد خوشی تھی۔ وہاں پرویز کی طرف سے بھی اسے شدید پریشانی لاحق تھی۔

جب ڈاکٹر جواد احمد ڈاکٹر فوزیہ کی زبانی اس حقیقت کا علم ہوا کہ سدھوراں اپنے نومولود بچے سمیت پھر ڈاکٹر فوزیہ کی پناہ میں آگئی ہے تو وہ قدرے ناراض ہو کر بولا۔ ”فوزیہ.....! آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے.....؟ میری سمجھ میں نہیں آتا، تم سدھوراں کا چیڑھ کلوز کیوں نہیں کر دیتیر، اس کی وجہ سے تم خود کتنے سنگین حالات سے گزر چکی ہو اور کڈ نیپ بھی ہو چکی ہو۔“

فوزیہ کو پہلی بار جواد احمد کی بات ناگوار گزری۔ اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”جواد.....! میں نے سدھوراں کو اپنی بہن بنایا ہے اور میں آخری دم تک اس کی مدد سے منہ نہیں موڑ سکتی۔“

”مگر فوزیہ.....! تم آخر کب تک اس کی دست گیری کرتی رہو گی، اس طرح تو خود ہماری لائف بھی ڈسڑب ہو سکتی ہے۔“

سے بیٹے کو سمجھایا۔

”امی! بات ہم ردی کی نہیں ہے، فوزیہ کی حد سے بڑھی ہوئی اس عادت نے اسے خود بھی نقصان پہنچایا ہے، وہ ایک بار انہو بھی ہو چکی ہے، نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔“ جواد احمد نے کہا۔

”بیٹا! تقدیر میں جو لکھا ہوتا ہے، وہ ہو کر رہتا ہے۔ چلو چھوڑو اس بحث کو میں آج خود بھائی وصی حیدرہ شاہ کے ہاں جا کر فوزیہ بیٹی کو سمجھاؤں گی مگر تمہیں اب اپنا انکار اقرار میں بدلنا ہوگا۔“

”نہیں امی! آپ وہاں ہرگز نہیں جائیں گی۔“ ڈاکٹر جواد نے گہری متانت سے کہا۔

”بس! اتنی ہی محبت تھی تجھے فوزیہ سے۔۔۔؟“ ماں نے جیسے اسے جوش دلایا۔
”اسے بھی تو مجھ سے اتنی ہی محبت تھی ورنہ وہ میری بات کیوں ٹھکراتی، ایسی پاگل لڑکی تو آگے چل کر اپنے ساتھ مجھے بھی کسی بڑی مصیبت میں پھنسا سکتی ہے، اچھا ہوا یہ معاملہ ادھر ہی ختم ہو گیا۔“

”نہیں جواد! تمہارے سر پر بھی اس وقت غصہ سوار ہے، تم نے غصے میں غلط قدم اٹھالیا ہے، مجھے یقین ہے کہ تمہیں آگے چل کر پچھتانا پڑے گا۔۔۔۔۔ بتاؤ فوزیہ کو بھلا کسے گا۔۔۔؟“

ماں کی بات سن کر ڈاکٹر جواد احمد کے دل کو گھونسا ساگا، وہ لا جواب سا نظر آنے لگا مگر پھر دوسرے ہی لمحے جب فوزیہ کا تلخ لہجہ اسے یاد آنے لگا تو اس کا نرم پڑ تادل دوبارہ پتھر ہونے لگا تاہم وہ ماں کی بات بھی رد کرنا نہیں چاہتا تھا، وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا لہذا وہ بولا۔ ”ٹھیک ہے امی! آپ فوزیہ کو اگر سمجھانا چاہتی ہیں تو فون پر اس سے بات کر سکتی ہیں مگر آپ ان کے گھر نہیں جائیں گی۔“

ماجدہ خاتون خاموش ہو رہی ہیں، ان کے لیے یہی غنیمت تھا چنانچہ انہوں نے اسی دن فوزیہ سے بات کرنے کی ٹھانی، ان کے پاس فوزیہ کا موبائل نمبر موجود تھا، یہ رابطہ انہوں نے اپنے بیٹے جواد کی غیر موجودگی میں کیا۔

”ہیلو بیٹی فوزیہ! میں بول رہی ہوں جواد کی امی!۔۔۔۔۔!“
”آداب آنٹی! کہئے کیسے فون کیا؟“ ڈاکٹر فوزیہ نے ان کا احترام کرتے ہوئے پوچھا۔

”بیٹی! مجھے تم سے شکایت ہے۔“ ماجدہ خاتون نے پیار بھرے لہجے میں شکوہ کیا۔
”کیسی شکایت آنٹی۔۔۔۔۔؟“

”تمہارے اور جواد کے درمیان اتنی سی بات پر ناراضی ہو گئی اور تم نے مجھے نہیں بتایا۔۔۔۔۔ مجھے بتاتی تو میں خود اس نالائق کے کان میں جیتی۔۔۔۔۔ لو بھلا یہ بھی کوئی ناراضی والی بات ہے۔“
”آنٹی! کیا آپ کے بیٹے نے آپ سے ہماری ناراضی کا ذکر کیا تھا؟“ فوزیہ نے پوچھا۔

”ہاں!۔۔۔۔۔! جیسی تو میں نے اس نالائق کی خوب خبر لی۔“ ماجدہ خاتون نے کہا اور پھر پیار سے سمجھاتے ہوئے بولیں۔ ”دیکھو بیٹی! تم دونوں ماشاء اللہ سمجھدار ہو اور پڑھے لکھے بھی ہو، کم از کم تم دونوں کو اس معاملے میں اپنے اپنے بڑوں کا مشورہ تو ملحوظ رکھنا چاہئے تھا۔“

”آنٹی! اس میں بڑوں سے مشورہ لینے کی بھلا کیا بات تھی؟“ فوزیہ نے کہا۔ ”جواد نے خود ہی ایک چھوٹی سی بات کو وجہ تنازع بنا ڈالا۔ اگر اس کی کوئی بہن تکلیف یا مصیبت کا شکار ہوتی تو کیا وہ اس کی مدد نہ کرتا یا میں اس کا اس نیک مقصد میں ساتھ نہ دیتی۔“
”یہ تو بہت اچھی بات ہے بیٹی! میں تم سے صد فیصد متفق ہوں۔“ ماجدہ خاتون نے مفاہمانہ انداز میں اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”چلو بیٹی! تم غصہ تھوک دواور بے فکر رہو، میں تمہارے ساتھ ہوں، شادی کے بعد ہم دونوں ساس، بہو مل کر اس نالائق کے کان کھینچیں گے۔“ ماجدہ خاتون کے پیارے بھرے لہجے میں پنہاں اپنائیت آمیز یقین پر بے اختیار فوزیہ ہنس پڑی۔ فوزیہ کی ہنسی نے ایک پریشان حال ماں کو مسرور کر دیا اور انہوں نے فون پر ہی فوزیہ کے دو تین بوسے لے ڈالے جس کی چٹ، چٹ کی ہلکی آواز فوزیہ کے کانوں میں بھی پڑی تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”بیٹی! تم نے ایک پریشان حال ماں کا دل خوش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ تم واقعی ایک اچھی، نیک اور فرماں بردار بیٹی ہو، اب تم دیکھنا میں کس طرح اس نالائق کی خبر لیتی ہوں۔“ ماجدہ خاتون نے مسرور لہجے میں کہا پھر کچھ سوچ کر ذرا سنجیدہ لہجے میں فوزیہ سے پوچھا۔ ”بیٹی! جواد کے انکار پر کیا تمہارے ماما، پاپا تو ناراض نہیں ہیں۔۔۔۔۔ تم اگر کبوتر تو میں خود ان سے اپنے بیٹے کی طرف سے معافی!۔۔۔۔۔!“
”نہیں!۔۔۔۔۔ نہیں!۔۔۔۔۔ آنٹی! اس کی ضرورت نہیں۔“ فوزیہ نے اچانک ان کی

کون سی سزا دی جائے لیکن ابھی تم صرف اس بات کا شکر ادا کرو کہ تم اس وقت کسی تھانے میں نہیں ہو۔“

پرویز اس کے ”کام“ نہ کرنے کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھتا تھا لہذا غصے سے دانت پیس کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ”انسپکٹر..... تم وردی کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرو اور میں شکر کس بات کا کروں تم مجھے تھانے لے جاسکتے ہو۔“

”شاوا ابھئی شاوا.....! بڑا شوق ہے رے تجھے سرکاری مہمان بننے کا؟“ اس کی بات پر انسپکٹر یاور حیات مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولا پھر دوسرے ہی لمحے ہونٹ چبا کر غراتے ہوئے گویا ہوا۔ ”پرویز.....! تو نہیں جانتا اگر میں نے وردی میں تجھے اپنے تھانے کی سیر کرا دی تو تو ساری عربیل کی سلاخوں کے پیچھے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گا..... میں نے تیرے سارے اڈوں پر چھایہ مار کر انہیں سیل کر ڈالا ہے اور تیرے آدمیوں کو بھی گرفتار کر لیا ہے، وہ میرے ایک اشارے سے تیرے خلاف وعدہ معاف گواہ بن جائیں گے۔“

”وہ اڈے میری ملکیت کبھی نہیں رہے۔“ پرویز اس کی دھمکی سے مرعوب ہوئے بغیر بولا۔ ”وہ کسی اور کی سرپرستی میں چلتے تھے، میں تو صرف ایک معمولی کارکن تھا بلکہ اب تو میں نے وہاں جانا بھی چھوڑ دیا ہے۔“

”زیادہ چالاک کو ابھنے کی کوشش کرو گے تو ابھی تھانے لے جا کر گیارہ نمبر کا لٹر آزمائوں گا تو تم اپنے سارے جرائم کا فر فر اعتراف کرنے لگو گے..... میں تو پتھروں میں بھی جونک لگا دیتا ہوں، تم تو پتھر بھی گوشت پوست کے انسان ہو۔“ انسپکٹر یاور حیات نے روایتی سفاکی سے کہا۔ جو اب پرویز خاموش رہا تھا پھر انسپکٹر یاور حیات اپنے ساتھ کھڑے دلدار کو مخاطب کر کے بولا۔ ”دلدار.....! پہلے تو یہ ایسا نہیں تھا، اب اسے کیا ہو گیا ہے کہ یہ اپنے گھر کا دانہ ہی چکھانے سے انکاری ہو گیا ہے؟“ پرویز کو اس خبیث انسپکٹر کے لہجے پر طیش تو آیا مگر وہ مصلحتاً چپ رہا۔

”صاحب.....! اس کی جو دوسری بیوی ہے نا یعنی سدھوراں اس نے اس پر کچھ ایسا جادو کر ڈالا ہے کہ یہ نہ صرف ہماری کوئی بات نہیں مان رہا بلکہ اب تو اس نے شریفانہ زندگی گزارنے کا بھی عہد کر ڈالا ہے۔“

”کیا اتنی ہی حسین ہے اس کی بیوی.....؟“ انسپکٹر یاور حیات کے لہجے میں ہوسناکی اتر آئی..... دلدار نے جواباً اثبات میں سر ہلادیا۔

پرویز غصے سے دلدار کو گھورتے ہوئے دانت پیس کر بولا۔ ”کیوں رذیل.....! تیری

بات کا تکر کہا۔“ میرے ماما، پاپا روشن خیال انسان ہیں، انہیں مجھ سے زیادہ اپنی تربیت پر فخر ہے..... ویسے بھی ان کا ایسا مزاج ہے ہی نہیں کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل میں لئے بیٹھے رہیں..... ویسے میں بھی ان سے ذکر کروں گی۔“

ڈاکٹر فوزیہ کی بات نہ کر مابعدہ خاتون تو خوشی سے کھل اٹھی تھیں، فوزیہ سے یہ بات کرنے کے بعد انہوں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ اپنے لاڈلے کے کان ضرور کھینچیں گی ساتھ ہی انہوں نے اللہ کا شکر بھی ادا کیا کہ ایک نازک مسئلہ افہام و تفہیم کی ہلکی پھلکی گفتگو میں ہی حل ہو گیا۔

☆=====☆

پرویز کو ہوش آیا تو اس کے گرد تاریکی چھائی ہوئی تھی مگر یہ تاریکی اس کے دماغ کی تھی کیونکہ اس نے جب دو تین بار اپنے دماغ کو جھکا دیا تو اس کی آنکھوں سے دھند چھٹ گئی تب اسے احساس ہوا کہ وہ ایک نیم تاریک کمرے میں مقید ہے..... رفتہ رفتہ اس کے حواس بحال ہونے لگے اور اسے یاد آنے لگا کہ وہ دلدار کے ساتھ لڑائی میں اس کے گماشتوں کے ہاتھوں اس حالت تک پہنچا ہے..... غصے اور طیش کی ایک آتشیں لہر اس کے مضروب وجود میں اترتی چلی گئی، اس کا جوڑ جوڑ پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا، دلدار کے ہٹے گماشتوں نے اسے خوب پیٹا تھا، بہر طور جب رفتہ رفتہ اس نے اپنی کھولتی ابلتی کیفیت پر قابو پایا تو وہ سوچنے لگا کہ کون سی جگہ ہے، کیا یہ دلدار کے ہوٹل یا جوئے خانے کا ہی کوئی کمرہ ہے۔

اچانک دروازہ کھلا، چوکھٹ پر پرویز نے دو سائے کھڑے دیکھے، اگلے ہی لمحے چٹ کی آواز کے ساتھ ہی کمرے کی نیوب لائٹ جل اٹھی..... روشنی ہوتے ہی پرویز کی نظر سامنے پڑی اور ایک موٹے سے شخص کو دیکھ کر پرویز بری طرح چونکا پھر دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں پھوٹنے لگیں، وہ ان دونوں کے قریب آنے پر انہیں پہچان گیا تھا۔

ایک تو دلدار تھا جبکہ دوسرا شخص انسپکٹر یاور حیات تھا جو اس وقت وردی میں نہیں تھا..... پرویز انہیں دیکھ کر بے بسی اور غصے سے گھور کر رہ گیا تھا تاہم اسے انسپکٹر یاور حیات کو سادہ لباس میں دیکھ کر یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ اس وقت کسی تھانے کی بجائے کہیں اور ہی تھا، انسپکٹر یاور حیات اسے زہر خند نظروں سے دیکھ کر استہزائیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ”کیوں پرویز.....! اب کیا کہتے ہو..... میرا کام نہ کرنے کی تجھے

سے فرار کروانے کے بعد خالقو کو اب اپنے گرد و آچہ خان کی طاقت پر کچھ زیادہ ہی بھروسہ ہو چلا تھا، بہر طور رات کے پچھلے پہر کی گہری تاریکی میں خالقو وحشی سائے کی طرح بڑھا چلا جا رہا تھا بالآخر وہ ایک گلی میں داخل ہو گیا، گلی اس سے ویران تھی، خالقو چار پانچ گھر چھوڑنے کے بعد ایک گھر کے سامنے رک گیا، یہ ماما اللہ رکھو کا گھر تھا۔

خالقو اپنے مطلوبہ مکان کے سامنے پہنچ کر چند ثانیے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا پھر اس نے اپنی قمیض کے اندر پستول کی موجودگی کا احساس کیا اور مکان کے بالکل ساتھ لگے نیم کے ایک پیڑ پر چڑھ گیا، پیڑ اگرچہ مکان کی کچی دیوار سے ذرا دور تھا لیکن خالقو کسی طرح آگے کو پھیلے ہوئے موٹے تنوں والی شاخوں پر سرکتا ہوا یکدم جنگلی بلے کی طرح اچھلا اور دوسرے ہی لمحے وہ دیوار کی منڈیر پر تھا، چند ثانیے وہیں دبک کر اس نے کچے صحن میں دیکھا تو دو چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں..... گرمیوں کا موسم تھا اس لیے آج کل لوگ ویسے بھی ڈر بہ نما کوٹھریوں کی بجائے گھر کے صحن میں چار پائیاں ڈال کر کھلے آسمان تلے سوتے تھے بلکہ کچھ لوگ تو گھر کے باہر بھی سونے کے لیے رات میں چار پائیاں ڈال لیتے تھے۔ خالقو کسی ٹھنکے ہوئے شکاری بلے کی طرح گارے مٹی والی کچی دیوار کی مگر پر نکا بغور صحن میں بچھی ان دونوں چار پائیوں پر کسی کو محو خواب گھورے جا رہا تھا، اس کے خیال کے مطابق ان میں سے ایک ماما اللہ رکھو تھا اور دوسرا سانول..... شروع کی تاریخوں کا چاند سو گوار سے انداز میں کہیں پرے جھکا ہوا تھا، آسمان پر آج تارے بھی نہیں غنما رہے تھے یہی وجہ تھی کہ خالقو کو ان دونوں میں سے سانول کو پہچاننے میں دقت کا سامنا تھا، جانے کیا بات تھی کہ اندر کو دینے کی اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی، اس کی وجہ ظاہر ہے یہی رہی ہوگی کہ وہ چاچا سکھو کو بھی اس طرح دیدہ دلیری سے قتل کرنے کے بعد پکڑا جا چکا تھا، اب بھی اسے یہی خدشہ پریشان کر رہا تھا مگر نیچے اترے اور سانول کو پہچانے بغیر چارہ نہ تھا تب اچانک خالقو کے دماغ میں بجلی کی سرعت کے ساتھ ایک خیال کوندا، اس نے ایک سفاک فیصلہ کیا یعنی دونوں کا ہی بیک وقت قتل..... یقیناً ان دونوں میں ایک سانول ہی ہوگا، جہاں ایک قتل کیا تو دوسرا اور تیسرا بھی سہی..... یہ خیال آتے ہی خالقو نے بمشکل دیوار کی منڈیر پر خود کو ذرا مضبوطی سے جمایا پھر پستول والا ہاتھ دھیرے دھیرے سیدھا کیا اور باری باری دونوں چار پائیوں کو نشانہ بناتے ہوئے ٹرائیگر دباتا چلا گیا۔

پہر رات کے دم بخود سناٹے گولیاں چلنے کے سمع خراش دھا کوں سے گونج اٹھے..... خالقو کو اپنے کام کی تسلی سے زیادہ یہاں سے فوراً فوجکے ہونے کی فکر تھی چنانچہ وہ دیوار سے

بھی تو بیوی حسین اور جوان ہوگی۔ تو کیوں نہیں اپنے ”صاحب“ کو خوش کر دیتا جس کا ہاتھ اتنے عرصے سے غلام بنا ہوا ہے۔“

پرویز کی ترش گوئی پر انسپٹر یاور حیات کو طیش آ گیا اور اس نے غصے سے بے قابو ہو کر ایک لات پرویز کے منہ پر رسید کرنی چاہی تو پرویز نے پھرتی کے ساتھ اسے پکڑ کر مروڑ ڈالا..... دلدار اپنی گماشتہ گیری کے زعم میں اپنے صاحب کو بچانے کے لیے آگے بڑھا تو اس اثنا میں پرویز، انسپٹر یاور حیات کی ٹانگ پکڑ کر اسے پرے دھکیل چکا تھا، دلدار پر تو وہ شاید ادھار کھائے بیٹھا تھا چنانچہ جیسے ہی دلدار جا رہا نہ انداز میں اس کی طرف بڑھا تو پرویز نے اپنے دائیں ہاتھ کا گھونسا پوری قوت سے اس کی ناک پر رسید کرنا چاہا تو دلدار نے ایک طرف کو جھکا کر دی، اپنی ناک کو بچاتے بچاتے پرویز کے طاقتور گھونسے نے اس کے دائیں جبڑے کی تواضع کر ڈالی، گھونسے کی ضرب اس قدر شدید تھی کہ دلدار کو اپنی داڑھیں تک ہلکی محسوس ہوئی تھیں، اس اثنا میں انسپٹر یاور حیات نے سنبھلتے ہوئے فوراً اپنی قمیض کے اندر کر کے گرد بندھے ہوئے پٹی ہولسر سے اپنا سرورس ریو اور نکال کر پرویز پر تان لیا اور غرا کر بولا۔

”خبردار.....! اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ گولی سے پیٹ پھاڑ ڈالوں گا۔“

ناچار پرویز بے بسی سے اپنے دانت پیس کر رہ گیا، اس دوران غصے میں بھرے ہوئے دلدار نے پرویز پر چڑھائی کرنے کی کوشش کی تو انسپٹر یاور حیات نے اسے پیش قدمی سے روک دیا اور دلدار، پرویز کو خون آشام نظروں سے گھور کر رہ گیا۔

”میرا خیال ہے اسے تھانے ہی لے چلنا چاہیے۔“ وہ ہونٹ بھیج کر بڑبڑایا، اس کی قبر آلود سنسناتی ہوئی نظریں ہنوز پرویز کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

تاہم دلدار زیر خند لہجے میں اپنے صاحب کو مشورہ دیتے ہوئے بولا۔ ”میرا تو خیال ہے صاحب.....! اس کے ادھر ہی سارے کس بل نکال دینے چاہئیں۔“ مگر انسپٹر یاور حیات نے اس کی بات پر نفی میں سر ہلایا پھر بولا۔ ”میں ابھی تھانے فون کر کے مو بائل بلواتا ہوں..... میں اس سے تھانے میں زیادہ بہتر طریقے سے نمٹوں گا۔“ اس کے زہر خند لہجے میں چھپی سفاکی کو محسوس کر کے پرویز کی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ سی اترتی چلی گئی۔

☆=====☆=====☆

مرتا کیا ناکرتا کہ مصداق خالقو، آچہ خان کی ہدایت کے مطابق چاچا سکھو کو قتل کرنے کے بعد سانول کو قتل کرنے کے لیے اس کے گھر کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا، حوالات

کو دور تار یک گلی میں دوڑتا چلا گیا۔

☆=====☆=====☆

وہ بانپتا لرزتا آچر خان کے ویران ہوٹل میں پہنچا تو بہرام تیار بیٹھا تھا، آچر خان نے ان دونوں کے رخصت ہوتے وقت بڑی سفاکی سے بہرام کو اس کا راستے ہی میں صفایا کرنے کا مخصوص اشارہ کیا پھر بہرام بڑی سنگدلانہ مسکراہٹ سے اپنا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے خالقو کو لئے تاریکی میں نکل گیا۔ اب خالقو، بہرام کے ساتھ چل رہا تھا، اس بات سے بے خبر کہ بہرام موت کے فرشتے کی صورت اس کے ہمراہ ہے، بہرام کا خالقو کو ٹھکانے لگانے کا کام بہت آسان تھا، خالقو ویسے ہی ایک قاتل اور مفور قیدی تھا، اس کی لاش دیکھ کر پولیس خود ہی سکھ کا سانس لے گی یا پھر اس کیس سے جان چھڑانے کے لیے کاؤنٹر فائرنگ ڈیتھ قرار دے کر یہ کیس ہی داخل دفر کر دے گی۔

اب دور مشرقی سمت میں پوہ پھوٹنے والی تھی، نیشل ہائی وے سے ذرا قریب لنی کھڑو کی جھاڑیوں کے درمیان ایک بل کھائی پگڈنڈی نما کچے راستے پر بہرام چلتے چلتے رک گیا اور فوراً اپنی جیب سے ریوالتور نکال کر خالقو پر تان لیا..... خالقو کے چہرے پر حیرت و خوف کے طے جلے تاثرات ثبت ہو کر رہ گئے، آن واحد میں اسے اپنے گرو گھنٹال آچر خان کی سفاک سازش کا ادراک ہوا مگر اب دیر ہو چکی تھی، بہرام نے اس کے دل کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبا دیا، ٹھک کر کے گولی خالقو کے سینے میں دل کے مقام پر سرخ روشندان بنا گئی..... اذیت ناک موت کے بعد اس کے چہرے پر غیر یقینی حیرت کے تاثرات چسپاں ہو کر رہ گئے تھے۔

☆=====☆=====☆

ان تینوں ہلکاروں بشمول انڈین آفیسر کی گتوں سے نکلنے والی گولیوں کی بوچھاڑ سے سارنگ نے خود کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کی تھی مگر پھر بھی ایک بھولی بھٹکی گولی اس کی بائیں ران کا گوشت چھیدتی ہوئی نکل گئی تھی۔

سارنگ تکلیف کی شدت سے چیخ اٹھا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اس وقت بھوکے بھیڑیوں کے بھٹ میں ہے اور جن کے کئی ساتھی اس کے ہاتھوں لقمہ اجل بن چکے ہیں، ناگ کے زخم کو خاطر میں لا کر سپر ڈالنے کا مطلب صرف اور صرف موت تھا..... ایک بھیا تک موت.....! اب مارو یا مر جاؤ والی پچویشن بھی چنانچہ اس نے بھی اپنی گن سیدھی کر کے ان تینوں پر جوابی فائرنگ کر ڈالی، انڈین آفیسر کے سوائے باقی دونوں ہلکار کر یہہ چیخ کے

ساتھ زمین پر ڈھیر ہو گئے۔

انڈین آفیسر پسپا ہو کر راہ فرار اختیار کرنے لگا تو سارنگ نے شیر کی طرح اسے جھپٹ لیا اور غرا کر بولا۔ ”خبیث انسان! تُو نے جان بوجھ کر مجھ بے گناہ کو پھنسانے کی کوشش کی جس کی سزا تیرے ساتھیوں کو بے گناہ بھگتنی پڑی ہے۔ میرے سر پر اس وقت جنوں سوار ہے، شرافت سے مجھے بتاؤ میری بھابی اللہ وسائی اور اس کے بچے فریدو، منٹھار کو تُو نے کدھر بند کر رکھا ہے؟“ سارنگ کے گزے ہوئے تیوروں اور حتمی لہجے کی سفاکی پر وہ انڈین آفیسر گھگھیا کر رہ گیا۔ ”چل مردود.....! لے چل مجھے وہاں جدھر تُو نے ان کو بند کر رکھا ہے۔“

سارنگ اس کو گھیننے لگا تو انڈین آفیسر اسے عمارت کے بالائی حصے میں لے آیا، اس اثناء میں چار پانچ مزید اسلحہ بدست ہلکار بھی وہاں آدھمکے تھے مگر اپنے آفیسر کو سارنگ کے خون آشام شکنجے میں دیکھ کر ان میں سارنگ پر فائرنگ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی تھی، سارنگ اپنی رائفل کی نال انڈین آفیسر کی گردن سے چپکائے ہوئے تھا مگر وہ ان چار پانچ مسلح ہلکاروں کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ خود ایک عام انسان تھا، ایسے حالات سے اس کی کبھی سابقہ نہ پڑا تھا مگر بہر حال زندگی پر بن آئے تو ملی بھی بچہ مارتی ہے..... یہ سب لوگ تربیت یافتہ تھے، سارنگ نے ان سب کو اپنی گتیں پھینکنے کا حکم دیا تھا مگر جب انہوں نے اس کی بات پر عمل نہ کیا تو سارنگ نے انڈین آفیسر سے درشت اور سفاک لہجے میں کہا۔ ”اپنے کتوں سے کہو کہ اپنے ہتھیار پھینک دیں ورنہ.....!“ اس نے یہ کہہ کر دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

انڈین آفیسر نے اپنے ماتحتوں کو یکدم غیر مسلح ہونے کا حکم دیا پھر سارنگ کی اگلی ہدایت کے مطابق ان سب کو ہاتھ اٹھائے دیوار کے ساتھ چپک جانے کو کہا۔ علاوہ بریں ایک ہلکار کو بھابی اللہ وسائی اور فریدو کو بھی لانے کا کہا۔ تھوڑی دیر بعد ڈرے سبب بھابی اللہ وسائی اور فریدو کو سارنگ نے دیکھا تب وہ آہستہ آہستہ باہر کو کھٹکنے لگا، عمارت سے باہر آ کر سارنگ ایک کھڑی جیب میں سوار ہوا اور جلدی جلدی بھابی اللہ وسائی اور فریدو کو بھی اس میں سوار کرایا پھر انڈین آفیسر سے جیب کی چابی منگو کر اسے اشارت کیا اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی..... جیب آگے بڑھانے سے قبل اس نے انڈین آفیسر کا خون کرنا مناسب نہ جانا تھا البتہ اسے ریت میں دھکا ضرور دے دیا تھا، جیب کے آگے بڑھتے ہی چوکی عمارت سے گولیوں کی برسات اند پڑی مگر سارنگ جیب کو آندھی طوفان کی طرح دوڑائے

بخود نظروں سے سارنگ کو جاتا دیکھ رہے تھے پھر انہوں نے دیکھا سارنگ گرتا پڑتا قافلے والوں سے جا ملا۔۔۔۔۔۔ یہ دونوں ہاتھوں کا چھبنا بنائے سارنگ اور قافلے والوں کو تنکے جابجے تھے، ذرا ہی دیر بعد ان کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ ایک اونٹ تیزی سے دوڑتا ہوا ان کی طرف آ رہا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ شاید انہیں لینے آرہے تھے، ذرا دیر بعد اونٹ ان کے قریب پہنچ گیا، اس کے کجاوے میں سارنگ اور ایک دوسرا شخص بیٹھا تھا۔۔۔۔۔۔ اس ساربان نے ”ہش۔۔۔۔۔۔ ہش“ کر کے اونٹ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر ایک عورت کو دیکھ کر ساربان ”ہودے“ سے نکل آیا اور اللہ وسائی اور فرید کو اندر سارنگ کے ساتھ بٹھا دیا پھر ساربان خود اس کی رسی پکڑے قافلے والوں سے جا ملا۔

یہ قافلہ ایک ہی خاندان پر مشتمل تھا اور بدین کی طرف جا رہا تھا۔۔۔۔۔۔ سارنگ، بھابی اللہ وسائی اس قافلے کی منزل کا سن کر خوشی سے پھولے نہیں سائے تھے کیونکہ ان کے خاندان تھر پار کر کے ہجرت کر کے اسی طرف ہی گئے تھے۔۔۔۔۔۔ اگرچہ اس بات کو کئی مہینے گزر چکے تھے مگر سارنگ اور اللہ وسائی کو یقین تھا کہ ان کے ماں، باپ بدین کے ہی کسی گاؤں گوٹھ میں ہوں گے۔۔۔۔۔۔ اللہ وسائی کی آنکھوں کے سامنے اپنے شوہر خالقو کا چہرہ رقص کرنے لگا اور سارنگ کو اپنی منظور نظر میراں کا ملیح چہرہ تصور میں گردش کرتا دکھائی دینے لگا جو اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

☆=====☆=====☆

اپنی پاک دھرتی پر قدم رکھتے ہی سارنگ کو اپنے خاندان کے لوگ یاد آنے لگے۔۔۔۔۔۔ بوڑھے ماں، باپ، بھائی، خالقو، بہن ملوکاں۔۔۔۔۔۔ چاچا سکھیو، چاچی اور سب سے اہم چہرہ جو اس کے چشم تصور میں جم کر رہ گیا تھا، وہ میراں کا تھا۔۔۔۔۔۔ معصوم اور دل نواز چہرہ۔۔۔۔۔۔ سارنگ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر اپنوں میں پہنچ جائے۔

دو، تین دنوں کے کٹھن سفر کے بعد یہ لوگ بالآخر بدین کے ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔۔۔۔۔۔ کئی خاندانوں پر مشتمل اس قافلے کی منزل آگے تھی چنانچہ وہ سارنگ وغیرہ کو یہاں چھوڑ کر آگے روانہ ہو گئے۔۔۔۔۔۔ یہاں سارنگ نے گوٹھ کے ایک معتبر شخص سے ملاقات کی اور اپنا مدعا بیان کیا۔۔۔۔۔۔ وہ ایک بھلا مانس زمیندار تھا۔ اس نے انہیں اپنی اوطاق کے مہمان خانے میں ٹھہرایا اور پھر سارنگ کے خاندان کی تلاش شروع کر دی گئی۔

☆=====☆=====☆

جا رہا تھا، چوڑے اور مخصوص ساخت والے ٹائروں کی وجہ سے جیپ ریت پر صحرائی اونٹ کی طرح دوڑی جا رہی تھی پھر خاردار اسنی بازو کو توڑتی ہوئی وہ سرحدی علاقے سے نکل گئی۔

مگر سارنگ نے جیپ نہ روکی، وہ اسے اسی طرح ہی طوفانی رفتار سے دوڑاے جا رہا تھا، اپنی اس غیر یقینی کامیابی پر اس کا دل مسرت سے بلیوں اچھل رہا تھا۔

دن کا اجالا اب چہار سو پھیل چکا تھا، سورج کی حدت تیز ہونے لگی تھی، ان کے پاس سفر کے لیے زادراہ کچھ بھی نہ تھا مگر سارنگ ہی نہیں بلکہ سب اس بات کا ہی شکر ادا کر رہے تھے کہ اب وہ اپنی سرزمین، اپنی دھرتی پر زندہ سلامت قدم رکھ چکے تھے، وہ سب اللہ کے حضور شکر بجا لانے لگے جس نے ان سب کو بخیر و عافیت اتنی بڑی مصیبت سے بچا لیا تھا۔۔۔۔۔۔ سارنگ نے جیپ کی رفتار اب قدرے آہستہ کر لی تھی پھر ایک مقام پر جیپ خود ہی رگ لگی، فیول بتانے والی سوئی زیر و پر آچکی تھی، سارنگ نے جھنجھلاہٹ آمیز انداز میں اسٹیئرنگ پر مکا مارا، جیپ کا انجن اب گھر گھر کر خاموش ہو چکا تھا۔

جیپ میں بیٹھے بیٹھے سارنگ نے گرد و پیش کا جائزہ لیا، سورج سو انیزے پر آچکا تھا، دھوپ تیز ہو گئی تھی اور صحرا اپنے نگاہتہ حدنگاہ لہو و دق جہنم زار ریگستان کے سوا کچھ نہ تھا، گرمی اس قدر تیز تھی کہ سانس گھٹ رہی تھیں۔

”ادا۔۔۔۔۔۔ اب کیا ہوگا؟“ بھابی اللہ وسائی نے پریشانی سے کہا۔

”اللہ خیر کرے گا بھابی۔۔۔۔۔۔ اب تک اس نے ہی ہمیں ہر مصیبت سے نکالا ہے، آگے بھی وہی ہماری مدد کرے گا۔“ سارنگ نے اسے تسلی دی۔۔۔۔۔۔ ننھے منٹھار کی بھی حالت اس جھلساتی گرمی میں خراب ہو رہی تھی، وہ تو پھر بھی معصوم تھا، روئے چلا جا رہا تھا۔ سارنگ کو اب نئی پریشانی نے گھیر لیا تھا، درحقیقت انہوں نے ایسے حالات میں سرحد پار کی تھی کہ زادراہ کے لیے کچھ بھی اکٹھا نہ کر پائے تھے۔

”وہ دیکھو ادا۔۔۔۔۔۔!“ اچانک گیارہ سالہ فرید نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے پکارا تو وہ ٹھٹھک کر ادھر متوجہ ہوا پھر دوسرے ہی لمحے وہ خوش ہو گیا۔ فرید نے جس سمت اشارہ کیا تھا، وہ چھ سات اونٹوں کی مختصر قطار تھی، وہ ان سے کافی پرے ہو کر آگے بڑھی چلی جا رہی تھی۔۔۔۔۔۔ سارنگ جان گیا کہ یہ کوئی قافلہ تھا۔

سارنگ نے بھابی اللہ وسائی اور فرید کو وہیں جیپ میں بیٹھنے رہنے کی تلقین کی اور وہ جیپ سے اتر کر آگے بڑھتے ہوئے قافلے کی طرف دوڑا۔۔۔۔۔۔ بھابی اللہ وسائی اور فرید دم

کا ”پیرا“ ملتے ہی پولیس تعاقب میں ہوئی۔ قاتل کا پیرا مقتول ماما اللہ رکھیو کے گھر سے سیدھا آچر خان کے ہوٹل تک پہنچا تو وہاں شور مچ گیا۔ آچر خان کے کوئو راحراست میں لے لیا گیا۔ بعد میں قاتل کے پیرے کے ساتھ ایک اور شخص کا بھی پیرا ملا اور انسپکٹر جھٹل شاہ، آچر خان کو ہتھکڑیاں لگائے اپنی پولیس نفری سمیت آگے روانہ ہوا تو انہیں بڑی شارع کے قریب جھاڑیوں میں خالقو کی لاش مل گئی۔ انسپکٹر جھٹل شاہ کی محنت رنگ لائی، اس کے گھاگ ذہن نے یقینی انداز کیا کہ مفور قاتل جواب خود مقتول ہو چکا تھا، کو قتل کرنے والا وہی شخص تھا جو اس کے ہمراہ آچر خان کے ہوٹل سے نکلا تھا، بعد میں جب مقتول قاتل کے قاتل (بہرام) کے پیروں کے نشان کے تعاقب میں شارع تک آئے تو وہاں اس کا پیرا گم تھا جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ قاتل یہاں سے کسی مسافر لاری میں سوار ہو کر آگے نکل چکا ہے، اس کی تلاش سردست ناممکن تھی مگر اب آچر خان کی شامت آگئی، انسپکٹر جھٹل شاہ اسے لے آنا فانا تھانے پہنچا۔

”خالقو کوٹھنے ہی رات کو تھنا لاک اپ سے فرار کروایا تھا؟“ انسپکٹر جھٹل شاہ نے آنکھیں سکیڑ کر اس کے چہرے پر جمادیں۔

”سس..... سائیں..... میں ایک شریف آدمی ہوں، بھلا میرا خالقو جیسے قاتل سے کیا واسطہ۔“ آچر خان نے مکارانہ انداز میں جواب دیا۔

انسپکٹر جھٹل شاہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا سیاہ رنگ کا رول زور سے ٹیبل پر مارا اور کڑک دار لہجے میں بولا۔ ”تم جھوٹ بولتے ہو..... ابھی میں ادھر بہت سارے آدمی اکٹھے کر لوں گا جو اس بات کی تصدیق کر دیں گے کہ خالقو، چاچا سکھیو کے قتل سے پہلے تم سے ملتا رہتا تھا، کیا تم انکار کرتے ہو.....؟“

آچر خان فوراً جواب دیا۔ ”برابر سائیں برابر! میں بھلا اس بات سے کہاں انکار کر رہا ہوں کہ خالقو میرے پاس نہیں آتا تھا مگر اس کی حیثیت صرف میرے گاہک جیسی تھی اور بس.....!“

”اچھا.....! تو پھر مجھے یہ بتا کہ خالقو تھانے سے فرار ہو کر آدھی رات کو کیا تیرے باپ کی شادی میں شریک ہونے کے لیے تیرے ہوٹل آیا تھا؟“ انسپکٹر جھٹل شاہ نے زہر خند لہجے میں گھور کر کہا۔

آچر خان جلدی سے بولا۔ ”انسپکٹر صاحب.....! مجھے کیا معلوم..... ہو سکتا ہے وہ اپنے کسی ساتھی کے ساتھ.....!“

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے..... جنہم واصل خالقو نے اپنے مکافات عمل کی سزا سے گزرنے سے پہلے آچر خان کے کہنے پر جب سوئے ہوئے ماما اللہ رکھیو اور سانول پر فائرنگ کی تو ماما اللہ رکھیو نے اسی وقت دم توڑ دیا تھا جبکہ سانول کے ایک گولی ٹانگ اور دوسری بازو پر لگی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو سانول اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ اپنے زخموں کی پروا کئے بغیر کراہتا ہوا اٹھا تو اس نے اپنے برابر بچھی ہوئی چار پائی پر سوئے ماما اللہ رکھیو کی طرف دیکھا، اس کے اوسان خطا ہو گئے وہ ماما..... پکارتا بد نصیب اللہ رکھیو کے قریب آیا، اس کا پورا وجود لہو میں تر تھا اور وہ دم توڑ چکا تھا..... سانول کا اس بھری دنیا میں اور کوئی نہ تھا، ایک ماما تھا اسے بھی نبجانے کس ظالم نے ختم کر ڈالا تھا۔ سانول بچوں کی طرح دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس دوران آس پاس کے لوگ فائرنگ اور بعد میں سانول کے رونے کی آوازیں سن کر اس کے گھر میں جمع ہونے لگے پھر انہوں نے زخمی سانول کو گوٹھ کے ایک ڈاکٹر کو نیند سے بیدار کر کے اس کی مرہم پٹی وغیرہ کرنے کو کہا..... ڈاکٹر کی چھوٹی سی ڈسپنری اس کے ایک اوطاق نما کمرے میں تھی جس کا ایک دروازہ باہر بھی کھلتا تھا، اگرچہ یہ پولیس کیس تھا اور اس کی پہلے تھانے میں رپورٹ درج کروانا ضروری تھا مگر بہت سارے لوگوں کی موجودگی اور دباؤ کی وجہ سے ڈاکٹر نے مجبوراً سانول کی ٹانگ اور بازو کے زخموں کا معائنہ کیا، وہ اپنے کام میں خاصا ماہر تھا، اس نے بتایا کہ ٹانگ پر لگنے والی گولی گوشت چھاڑ کر نکل چکی ہے البتہ بازو میں لگنے والی گولی ابھی اندر موجود ہے، شکر تھا کہ دونوں لگنے والی گولیوں نے ٹانگ اور بازو کی ہڈیوں کو نقصان نہیں پہنچایا تھا، بہر طور اس نے تھوڑی کوشش سے بازو کی گولی نکال کر اس پر پٹی باندھ کر طاقت کی ڈرپ لگا دی۔ کچھ لوگوں نے تھانے جا کر رپورٹ لکھوا دی..... ماما اللہ رکھیو کی تدفین عمل میں لائی گئی تو سانول نے بیوہ چاچی اور ملوکاں وغیرہ کو بھی اس اندوہناک واقعے کی اطلاع پہنچانا ضروری سمجھا، وہاں تک یہ اطلاع لے کر جانے والے تین افراد تھے۔

وہاں کا تھنا نہ انچارج انسپکٹر جھٹل شاہ اس اطلاع پر فوراً حرکت میں آیا کیونکہ خالقو نامی قاتل اس کے لاک اپ سے فرار ہو چکا تھا، اس نے ازراہ تشویش بھنویں سکیڑ کر سوچا..... کیا یہ اسی مفور قاتل خالقو کی کارستانی تو نہیں۔

انسپکٹر جھٹل شاہ چند سپاہیوں کے ساتھ موبائل میں سوار ہو کر جائے وقوع پر پہنچا۔ لوگوں سے سوالات کئے..... پھر ”پیرا“ اٹھانے والے (کھوجی) کو بلایا گیا، نامعلوم قاتل

”کیوں اس بند کرو اپنی.....“ انسپکٹر جھٹل شاہ دھاڑا۔ ”اس رات جب خالقو تھا نے سے فرار ہو کر تمہارے ہوئل آیا تھا تو اس وقت تم بھی وہاں موجود تھے اور بعد میں تم نے خالقو کو ماما اللہ رکھو کے ہاں اسے اور اس کے بھانجے قتل کرنے کے لیے بھیجا تھا..... جب خالقو اپنا کام نہما کر تمہارے پاس واپس پہنچا تو تم نے خالقو سے چھکارہ پانے کے لیے اسے اپنے کسی ساتھی کے ساتھ روانہ کر دیا جس نے بعد میں راستے ہی میں خالقو کا خون کر ڈالا اور خود وہ خاموشی سے غائب ہو گیا۔“ انسپکٹر جھٹل شاہ کے پُر اعتماد لہجے اور حرف بہ حرف صورت حال کو بالکل درست خطوط پر بھانپتے پا کر آچر خان کا چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا مگر وہ پھر بھی بڑی ڈھنائی کے ساتھ انکار کرتا رہا۔

انسپکٹر جھٹل شاہ نے بڑی زہر خند مسکراہٹ کے ساتھ اس کے چہرے کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تم چاچا سکھیو کی بھتیجی ملوکاں سے زبردستی شادی کرنا چاہتے ہو اور اس مقصد کے لیے تم مختلف ذرائع سے ان پر دباؤ بھی ڈالتے رہے ہو حالانکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ملوکاں کی منگنی مقتول ماما اللہ رکھو کے بھانجے سانول سے طے ہو چکی ہے۔“

آچر خان کی حالت کا نو تو بدن میں لبو نہیں جیسی ہو رہی تھی، اس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ انسپکٹر جھٹل شاہ دورن خانہ اس کے خلاف اپنی تفتیش کا دائرہ بڑی کامیابی سے پھیلاتا رہا تھا تاہم آچر خان اب تک مطمئن تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ جھٹل شاہ ابھی تک اس کے خلاف کوئی ثبوت حاصل نہیں کر سکا ہے چونکہ وہ اپنے خلاف ایک ثبوت خالقو کو صفحہ ہستی سے مٹا چکا تھا اور دوسرے ثبوت یعنی بہرام کو کامیابی کے ساتھ فرار کروا چکا تھا۔

تب وہ خاصا پُر اعتماد نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”انسپکٹر سائیں! یہ بات درست ہے کہ میں ملوکاں سے شادی کا خواہشمند تھا مگر اس کا یہ مرکز مطلب نہیں ہے کہ میں اسے حاصل کرنے کے لیے خود کو کسی جنجال میں ڈال دوں..... مجھے بھلا لڑکیوں کی کیا کمی ہے..... جوان اور تندرست ہوں میں..... کماتا ہوں..... مجھے تو چند نکوں کے بدلے ہر کوئی اپنی لڑکی دے سکتا ہے۔“

”مگر ملوکاں جیسی چھو کر تیرے جیسے کالے بیل کو کوئی نہیں دے گا نا بابا.....!“ انسپکٹر جھٹل شاہ نے استہزاء سے انداز میں کہا پھر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے رول کو اس کی تھوڑی پر نکا کر بولا۔ ”دیکھو آچر خان..... اب تم مجھے بالکل سچ بتاؤ گے کہ تمہارا وہ دوسرا ساتھی جس

نے تمہارے کہنے پر خالقو کو قتل کیا، وہ کدھر گیا ہے اور اس کا نام کیا ہے؟“ آچر خان نے ایک نظر انسپکٹر جھٹل شاہ کی طرف دیکھا پھر یکدم کینچلی بدل کر کھرے لہجے میں بولا۔ ”دیکھو انسپکٹر صاحب..... میں اس گوٹھ کا ایک شریف آدمی ہوں اور میرا کسی بھی تھانے میں کوئی ریکارڈ نہیں ہے، جس کی گواہی پورا گوٹھ دے سکتا ہے، تم مجھے عدالت کے سپرد کرو، میں اب اپنی صفائی وہاں پیش کروں گا۔“

آچر خان کے بدلے ہوئے تیردیکھ کر انسپکٹر جھٹل شاہ کے تن بدن میں آگ سلگ اُٹھی اور اس نے آچر خان کا گریبان پکڑ لیا پھر اسے خشکیں نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ”تیرے کو بعد میں عدالت کے سپرد کروں گا پہلے ذرا سرکاری مہمان خانے کی ہوا تو کھا..... میں ابھی عدالت سے ریمانڈ لیتا ہوں پھر دیکھتا ہوں تیری زبان کس طرح فر فر چلتی ہے۔“ یہ کہہ کر انسپکٹر جھٹل شاہ نے قریب کھڑے دوسپاہیوں سے آچر خان کو لاک اپ کرنے کا حکم دیا۔

آچر خان کھر درے لہجے میں بولا۔ ”میں ابھی اور اسی وقت وڈیرے علی نواز سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”لے جاؤ اسے..... تم کیا منہ تک رہے ہو کھڑے.....؟“ انسپکٹر جھٹل شاہ نے آچر خان کی بات سنی اُن سنی کرتے ہوئے سپاہیوں سے کہا اور وہ چابی بھرے کھلونے کی طرح فوراً حرکت میں آئے اور آچر خان کو کھینچ کر سرے سے لے گئے۔

☆=====☆

ملوکاں کو جب ماما اللہ رکھو کی اندوہناک موت اور سانول کے زخمی ہونے کی خبر ملی تو وہ دیوانہ وار اس کے گھر کی طرف دوڑ پڑی..... سانول کے گھر میں لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا، کچے صحن کے وسط میں ماما اللہ رکھو کی کفن پوش لاش ایک چارپائی پر رکھی ہوئی تھی..... سانول زخمی ہونے کے باوجود ماما کی لاش کی چارپائی سے لگا پچوں کی طرح ہلکے ہلکے کر رہا تھا، اس کے بازو، رانگ پر پتی بندھی ہوئی تھی، چند ایک گوٹھ کے جوان اور بوڑھے اسے تسلی دینے میں مصروف تھے..... ملوکاں بھی رونے لگی..... جب وہ سانول کے قریب آئی تو سانول نے اس کی سسکیوں کی آواز سن کر سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھا تو یکدم چلا کر نفرت انگیز لہجے میں بولا۔ ”تت..... تھو..... ایک منحوس چھو کر ہے..... تھو ڈائن ہے..... تھو نے میرے ماہ کو کھالیا..... جا..... چلی جا یہاں سے..... چلی جا..... چلی جا.....“

ملوکان، سانول کی اس سنگدلانہ بے رخی پر ڈھسے گئی اور پھر پلو میں اپنا روتا سسکتا چہرہ چھپائے وہاں سے چلی آئی۔

ماما اللہ رکھو کو گوٹھ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا..... سانول اب بالکل تنہا رہ گیا تھا، وہ اپنے مرحوم ماما اللہ رکھو کی خالی چار پائی کی پائنتی لگانڈ حال سامیٹھا تھا..... ماما کی اس ناگہانی موت نے اسے بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا..... اپنے ماں، باپ کے بعد دنیا میں ماما ہی اس کے لیے وہ واحد ہستی تھی، جس سے وہ بے تحاشا انسیت رکھتا تھا اور اسے اپنے لئے ایک ٹھنڈی چھاؤں سمجھتا تھا..... ماما کی مشفقانہ باتیں اور ”چھورا..... چھورا.....“ کہہ کر محبت سے مخاطب کرنے کا انداز سانول کے دماغ میں بار بار گردش کر رہا تھا۔ سانول کو اپنا یہ گھر ماما کے بغیر قبرستان کی طرح ویران محسوس ہونے لگا تھا، اس نے ماما کے کپڑے، اس کی لاک، صدفی، اجڑک، ٹوپی اور جو توتوں کو بھی سنبھال کر رکھا تھا۔ غرض اسے اپنے ماما سے اس قدر محبت تھی کہ اس کی جدائی کا غم اس سے بھلائے نہیں بھول رہا تھا..... لوگ آخر کب تک اس کے ساتھ چپکے رہتے، غم روزگار اور غم جہاں کے مارے ہوئے لوگ ایک ایک کر کے اسے تنہا چھوڑ کر اپنے گھروں کو ہولے تھے، گھروں سے آیا ہوا کھانا بھی ویسے ہی پڑا ہوا تھا..... سانول کو اپنا ہوش نہ تھا، اسے بھلا کھانے پینے کا کیونکر ہوش رہتا، اس کا تو کام پر بھی جانے کو دل مائل نہیں ہو رہا تھا..... وہ گھر پر ہی پڑا رہتا۔ اب کون تھا اس کا جو اس کی پروا کرتا، ایک ماما ہی تو تھا جو ایک شفیق باپ اور محبت کرنے والی ماں کی طرح اس کی خبر گیری رکھتا تھا..... ہاں ابھی ایک ہستی ایسی زندہ تھی جسے سانول کے درد اور غم کا پوری طرح احساس تھا اور وہ ہستی ملوکان تھی جو اس وقت اپنی جھگی میں پڑی چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی، اسے سانول کے رویے پر دکھ ہوا تھا مگر پھر اس نے یہ سوچ کر اپنے دل نا صبور کو تشفی دی تھی کہ سانول کا اس میں کوئی دوش نہ تھا، وہ بے چارہ غم سے چور تھا، دل میں بسنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں، ان کی کوئی بات بھی بری نہیں لگتی، ان کی سنگدلی اور بے اعتنائی برداشت کی جاتی ہے اور ملوکان بھی سانول کے روکھے اور بے اعتنا رویے کو بیٹی چلی آئی تھی، یہ سب جاننے کے باوجود کہ سانول نے اس کی محبت کو کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا تھا، وہ بے شک اس سے شادی کرنے پر رضامند بھی ہو گیا تھا تو یہ سب ماما اللہ رکھو کی وجہ سے تھا، اس میں سانول کی اپنی مرضی کا ذرا بھی دخل نہ تھا اور ملوکان اس کی وجہ بھی جانتی تھی کہ سانول ابھی تک اپنی پہلی محبت سدھورا کو نہیں بھولا تھا، سانول نے سدھورا کو اکاٹھ بھلانے کی کوشش کی تھی اور اس کی بے وفائی پر اس نے اپنے دل میں سدھورا کے لیے نفرت کا جذبہ بھی

پیدا کرنے کی کوشش کی تھی مگر یہ سب وقتی اور عارضی ثابت ہوا تھا۔ کسی دل جلے یا من جلے نے صحیح کہا ہے کہ پہلی محبت کبھی دل سے فراموش نہیں ہوتی جسے اگر ایک دیوانہ اور فرزانہ انسان پالے تو پھر گویا اسے ساری دنیا کی خوشیاں مل جاتی ہیں، وہ اگر محبت کھودے تو پھر عمر بھر کا عذاب ہاتھ آتا ہے اور سانول اب اس عذاب سے دوچار تھا۔ ادھر ملوکان کا زخمی دل ”سانول..... سانول“ پکار رہا تھا، اس سے ملنے کو تڑپ رہا تھا مگر اب وہ کس کے پاس جاتی، پہلے تو ماما اللہ رکھو تھا تو وہ اس کے بہانے اپنے سنگ دل محبوب کا دیدار کر لیتی تھی اب..... اب کیونکر یہ ممکن تھا؟ ”نہیں مجھے ہر صورت میں سانول کے پاس جانا چاہئے۔“ اچانک اس کے دل مجبور میں بے قراری صدا ابھری اور وہ بے چین ہو گئی۔ اسی اثناء میں اس کی چاچی اور میراں تیار ہو کر کہیں باہر جانے لگیں، ملوکان نے پوچھا۔ ”چاچی! کدھر جا رہی ہے؟“

”دھیئے.....! بے چارے پٹ سانول کا غم ابھی تازہ ہے نا..... وہ اکیلا پن محسوس کر رہا ہوں گا، سو چال آؤں۔“

”چاچی! میں بھی چلوں تیرے ساتھ.....؟“ ملوکان نے قدرے جھجک کر کہا۔
”نہیں دھیئے.....! ابھی تیرا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے..... مجھے اس سے تیرے ہی سلسلے میں ضروری بات کرنی ہے۔“

ملوکان چپ ہو گئی پھر چاچی اور میراں کے جانے کے بعد ملوکان اپنی ماں عجیباں کی جھگی میں آ گئی، مانی عجیباں اپنے بیٹے خالقو کی موت کے بعد نیم پاگل سی ہو گئی تھی..... وہ اپنی بیٹی ملوکان کو دیکھ کر اسے جنونیوں کے سے انداز میں کانٹے کو دوڑتی تھی مگر اس بار وہ اسے دیکھ کر خاموش رہی تو ملوکان کو اس بے چاری پر ترس آ گیا اور پہلی بار اس نے اپنی ماں کو بڑے رنجور ہلچے میں پکارا تو بے اختیار عجیباں اس کے گلے لگ گئی اور دونوں ماں بیٹیاں رونے لگیں۔

☆=====☆=====☆

چاچی اور میراں چادریں سنبھالے سیدھی سانول کے ہاں پہنچیں تو وہ چونک پڑیں، انہوں نے دیکھا سانول اپنا چھوٹا موٹا سامان باندھنے میں مصروف تھا، اسے دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کہیں جا رہا تھا، اس کی جب ان دونوں ماں بیٹیوں پر نگاہ پڑی تو اس نے خاموشی سے اپنا سر جھکا لیا۔

”پت سانول..... خیر تو ہے..... شو کہیں جا رہا ہے؟“ چاچی نے تفکر آمیز لہجے میں پوچھا۔

سانول نے ہولے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”باؤ ماسی.....! میں یہ گھر..... یہ گوٹھ چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں..... اچھا ہوا تو آگئی..... میں خود یہ بتانے تیرے پاس آنے والا تھا۔“

اس کی بات سن کر چاچی یکدم پریشان سی ہو گئی اور اسی لہجے میں اس سے بولی۔
”پت.....! یہ کیا ہوا تجھے..... کیا تو ہمیں بھی چھوڑ کر چلا جائے گا..... اور..... اور وہ ملو کاں جو تیری راہ دکھ رہی ہے، وہ..... اس کا کیا ہوگا؟“

سانول نے ایک ویران سی نظر اس کے چہرے پر ڈالی پھر دل شکستہ سے لہجے میں بولا۔ ”ماسی.....! میں اب شاید اسے خوش نہ رکھ سکوں..... ماما کے مرنے کے بعد میرا اب اس سے کوئی ناتنا نہیں رہا ہے اور تو اچھی طرح جانتی ہے کہ ملو کاں سے شادی کرنے پر ماما نے ہی مجھے راضی کرنے کی کوشش کی تھی اور میں نے مجبوراً.....!“

”سانول.....! یہ کیا کہہ رہا ہے تو.....؟“ اچانک چاچی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”کیا تیرے ماما کے مرنے کے بعد تیرا اس سے کوئی تعلق نہیں رہا..... کیا یہ اس کی خواہش نہ تھی کہ تو ملو کاں سے شادی کر لے..... کیا تیرے اس فیصلے سے اس کی روح خوش ہوگی.....؟ نہیں سانول پت.....! یہ ظلم اس بے چاری پر نہ کر..... تو کیا نہیں جانتا کہ ہم پر اب تک جو مصیبتیں نازل ہوئی ہیں، وہ تیری اور ملو کاں کی وجہ سے ہوئی ہیں..... وہ بد بخت آچہ خان جواب تھانے میں بند ہے، اس نے ملو کاں سے شادی کرنے کے لیے یہ ساری گھناؤنی سازش کھیلی تھی، پہلے اس نے میرے شوہر کو قتل کروایا اور پھر بعد میں تجھے بھی ہلاک کروانے کی اس نے کوشش کی مگر خوش قسمتی سے تو بچ گیا اور تیرا ماما قتل ہو گیا..... اس طرح ملو کاں سے شادی سے انکار کر کے تو اپنے ماما کی قربانی ضائع کر دے گا۔“

”چاچی.....! یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟“ اچانک سانول نے تڑپ کر گلو گیر لہجے میں کہا تو چاچی نے پھر اسے ساری حقیقت تفصیل سے گوش گزار کر دی کہ کس طرح بد بخت آچہ خان نے اپنے مذموم مقصد کی خاطر یہ سارا گھناؤنا کھیل کھیلا تھا۔ ساری حقیقت سننے کے بعد سانول کو چپ سی لگ گئی، تب چاچی بڑی محبت سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے بولی۔

”سانول پت.....! کیا تو اپنے ماما سے اتنی ہی محبت کرتا ہے کہ اس غریب کے

گزرنے کے بعد تجھے تو اس کے وعدے کو پورا کرنے کا بھی یار نہ رہا..... نہیں سانول پت! اتنا کٹھور نہ بن..... غیرت مند لوگ تو اپنے بیٹوں کے قول کا مرنے کے بعد بھی پاس رکھتے ہیں..... ماما نے بھی زبان دی تھی اور یہ اسی کا صبر تھا کہ تیری اور ملو کاں کی شادی کر دی جائے..... تو خود سوچ تیرے اس طرح ملو کاں کو ٹھکرا کر جانے سے اس بے چاری کی کیا حالت ہوگی..... میں اسے جانتی ہوں وہ تو غریب جیتے جی مر جائے گی۔“

”نہیں ماسی نہیں.....! میں ایسا نہیں ہونے دوں گا، میں ماما کا وعدہ پورا کروں گا..... مجھے معاف کر دینا، بس دکھ اور پریشانی نے میرا دماغ چریا کر دیا تھا..... میں اب ملو کاں سے شادی کے لیے تیار ہوں۔“ سانول نے یکدم تڑپ کر کہا اور دونوں ماں، بیٹیاں خوش ہو گئیں۔

☆=====☆=====☆

ڈاکٹر فوزیہ اور ڈاکٹر جواد کی منگنی والا معاملہ سنگین دورا ہے پر پہنچ کر یکدم سنبھل گیا تھا اور اسے سلجھانے میں بلاشبہ ڈاکٹر جواد کی ماں ماجدہ خاتون کی معاملہ فہمی اور خوش اسلوبی کا دخل تھا۔ بہر طور قصہ مختصر..... دونوں کی منگنی ہو گئی اور شادی اور رخصتی وغیرہ کی تاریخ دونوں کی باہر اسٹڈی مکمل ہونے تک موقف رکھی گئی۔ یہ منگنی سے ایک دو روز پہلے کی بات تھی، ڈاکٹر جواد نے ڈاکٹر فوزیہ کو فون کیا تو فوزیہ نے پڑشوخ لہجے میں شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

”کیوں جناب.....! ہوش ٹھکانے آ گئے..... آخر تم آئی کوچنگ میں لے آئے۔“

”ظاہر ہے تم جو میری بات سمجھ نہیں پا رہی تھیں۔“

”وہ تو میں اب بھی نہیں سمجھ رہی..... کیا میں بچی ہوں؟“

”بچی تھیں تب ہی اتنی سی بات پر ناراض ہو گئی تھیں۔“ جواد نے شرارتی لہجے میں کہا۔ فوزیہ یہ جڑ کر بولی۔ ”او..... اچھا..... انا چور کو تو ال کوڈا انئے..... ناراضی کی ابتداء تم نے کی تھی کہ میں نے.....؟“

”اچھا کو تو الی صاحبہ.....! اب اس بندہ ٹاچیز کو معاف کرو اور اس کڑواہٹ کو یہیں دفن کرو..... آج موسم اچھا ہے اور اس گندے کے موقع پر پیزا ہٹ چلتے ہیں..... کیا خیال ہے؟“

سدھوراں کوڈا اکٹر فوزیہ اور ڈاکٹر جواد کی ذاتی چیپٹلش اور پھر فوراً ہی حالات معمول پر آ جانے کا بخوبی علم تھا لہذا وہ اب سنجیدگی سے سوچ رہی تھی کہ اسے ڈاکٹر فوزیہ سے خاموشی

بعد دلدار کی گونجدار آواز ابھری۔ ”پرویز.....! میں تیری یاری کو آج بھی نہیں بھولا ہوں،
 یہی وجہ ہے کہ میں آخری بار تجھے محض اسی دوستی کے ناتے سمجھانے آیا ہوں کہ اپنا دشمن نہ
 بن..... انسپکٹر یاور حیات کو تو نہیں جانتا جتنا میں اسے جانتا ہوں..... وہ تیرے بارے میں کیا
 فیصلہ کر چکا ہے، میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔“ وہ اتنا کہہ کر رکا۔ اس کی نظریں
 بدستور پرویز کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور پرویز مصلحتاً اپنی غیظ ناک پر بمشکل قابو کر کے اس
 کی طرف خاموشی سے دیکھے جا رہا تھا..... وہ ابھی اسے بولنے کا پورا پورا موقع دینا چاہتا
 تھا۔ دلدار نے لمحہ بھر توقف کیا اور پرویز کو اپنی طرف متوجہ پا کر دوبارہ کہنا شروع کیا۔
 ”پرویز.....! میں نہیں چاہتا کہ تُو بے موت مارا جائے کیونکہ تُو میرے لئے بہت اچھا
 دوست ثابت ہوتا آیا ہے پر نجاب نے کیوں اس بار تُو ایک عورت کے معاملے میں ہم سے دور
 ہو گیا ہے..... میں تجھے کھونا نہیں چاہتا اور اسی لئے آخری بار اور وہ بھی انسپکٹر یاور حیات کو
 بڑی مشکلوں سے راضی کرنے کے بعد ہی تمہیں سمجھانے آیا ہوں کہ اب بھی وقت
 ہے، ہماری بات مان لو کیونکہ انسپکٹر یاور حیات نے تجھے تھانے لے جانے سے پہلے ہی
 کاؤنٹر فائرنگ کر کے مارنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ دلدار یہ سنسنی خیز انکشاف کرنے کے بعد
 خاموش ہو گیا۔

پرویز کے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اسے غصے کی بجائے
 خوف کی سرسراہٹ محسوس ہوئی تھی اور وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔
 ادھر مکار دلدار نے اپنی بات کی اثر پذیری کو اس کے چہرے پر بھانپتے ہوئے
 دوبارہ اس سے کہا۔ ”پرویز.....! تیرے پاس اب سوچنے کے لیے بھی وقت نہیں ہے، تُو
 ہماری طاقت سے واقف نہیں ہے، تُو کیا سمجھتا ہے کہ تیرے مرنے کے بعد کیا ہم تیری حسین
 و جمیل بیوی سدھوراں کو چھوڑ دیں گے..... وہ تو خود ہی میرے رحم و کرم پر آ جائے گی۔ اس
 لیے تم دونوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ انسپکٹر یاور حیات کی ضد کے سامنے سر جھکا دو اور اپنی
 بیوی سدھوراں کو.....!“ اس نے دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

وہ انسپکٹر یاور حیات کی خصلت اور طاقت سے بخوبی واقف تھا، وہ وردی کے بھیس
 میں ایک جلاصفت پولیس افسر تھا اور اپنے ناجائز اختیارات کے بل بوتے پر وہ کچھ بھی کر
 سکتا تھا لہذا اس بھاری بھر کم ہاتھی کو طیش اور جوش سے زیر کرنے کی بجائے چوٹی بن کر اس کی
 سونڈ میں گھس کر مارنا چاہئے۔ یہ سوچ کر پرویز نے آنا فانا پُر جوش حکمت عملی کو مکارانہ خو میں
 بدلتے ہوئے اپنے چہرے پر دکھاوے کا خوف طاری کر لیا اور الجھن آمیز پریشانی سے اپنے

کے ساتھ دور ہو جانا چاہتے نیز اسے اب اپنی ہمدردیہ اور محسنہ پر اس قدر بوجھ نہیں بٹنا
 چاہتے کہ اس کی گھریلو زندگی بھی تلبت ہو کر رہ جائے مگر چونکہ ابھی تک انہیں پرویز کو تلاش
 کرنے میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی اس لیے سدھوراں کو اپنے شوہر کی گمشدگی یا فرار پر بھی
 پریشانی لاحق تھی مگر پھر ایک دن اس نے اپنی محسنہ سے گزارش کر ہی دی کہ وہ اسے اب اس
 کے اپنے گھر جانے دے کیونکہ گھر کو اتنا لمبا عرصہ خالی چھوڑنا مناسب نہیں..... دوسرے کیا
 خبر پرویز بھی کسی وقت اس سے دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش کرے تو پھر اسے وہ سمجھائے کہ
 وہ اپنی رضا کارانہ گرفتاری دیدے تاکہ بعد میں اس کی ضمانت یا عام معافی کی کوشش کی جا
 سکے۔

سدھوراں کی اس توضیح پر ڈاکٹر فوزیہ نے نفیہی انداز میں اپنے سر کو جنبش دی تھی۔

☆=====☆=====☆

عیاش صفت انسپکٹر یاور حیات، پرویز کو انسانیت سوز تشدد کی دھمکی دے کر اپنے
 گماشتے دلدار کے ساتھ کمرے سے جا چکا تھا، اس بار پرویز کے ہاتھوں، پیروں کو جکڑا نہیں
 گیا اور نہ ہی جاتے وقت انہوں نے کمرے کی جی گل کرنا مناسب سمجھا تھا۔

ان دونوں رذیلوں کے کمرے سے جاتے ہی پرویز کے دماغ میں راہ فرار کی
 تدبیریں تیزی سے ابھرنے لگیں لہذا اس نے بغور کمرے کا جائزہ لیا، کمرہ زیادہ بڑا نہ تھا،
 سینٹ کی سیدھی سپاٹ دیواریں تھیں اور ایک چار بائی چھ کا مستطیل نماروشندان تھا جو خاصی
 اونچائی پر نظر آ رہا تھا، جس پر ڈھلکن نمائش سے وار پٹ لگا ہوا تھا جبکہ روشندان کی چوٹی چوٹ
 پر آہنی سلاخیں گڑی ہوئی تھیں..... کمرے کا دروازہ بھی سنبھل مگر مضبوط پٹ سے بنا ہوا تھا۔
 پرویز اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کی طرف آ کر اس کی ناب گھما کر کھینچنے کی کوشش کی تو
 اسے حسب توقع بند پایا..... وہ تھوڑی دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا پھر اچانک اسے دروازے
 پر آہٹ نالی دی، وہ جلدی سے دوبارہ اپنی جگہ آ کر دیوار سے پشت ٹکا ئے بیٹھ گیا، دوسرے
 ہی لمحے دروازہ کھلا اور وہاں اسے دلدار نظر آیا، وہ تنہا تھا، اسے اکیلا دیکھ کر پرویز ایک لمحے کو
 چونکا مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس کی رگوں میں خون لاوے کی طرح گردش کرنے لگا۔

دلدار اپنے عقب میں دروازہ بند کر کے اس کی طرف نظریں گاڑے آگے بڑھنے لگا
 پھر ذرا اس کے قریب آتے ہی ڈرامائی انداز میں اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کھڑا ہو
 گیا، پرویز خونی نظروں سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورے جا رہا تھا، چند ثانیے

ہوٹ کانٹے لگا۔

پولیس مجھے گرفتار کر لے گی.....؟“

اس کی بات سن کر دلدار اسرار بھری مسکراہٹ کے ساتھ ایک آنکھ میچ کر بولا۔ ”ارے یار..... وہ سب ڈرامہ تھا۔ اپنا صاحب کوئی بیوقوف تھوڑا ہے کہ تجھے تھانے لے جائے۔ اس نے تو یہ معاملہ صرف اپنے تک ہی محدود رکھا ہے۔ باقی رہا سوال تیرے اذوں کا وہ بھی چل رہے ہیں البتہ اس کا ”چارج“ اب میں نے سنبھال لیا ہے۔ پر ٹو بے فکر ہو جا..... یہاں سے جانے کے بعد اپنا ہول بھی دوبارہ آرام سے کھول لینا اور اڈے بھی اپنے سنبھال لینا۔“ پرویز نے ہر طرح سے تسلی کرنے کے بعد بالآخر مطمئن ہو کر اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔ پھر اس مردود دلدار کے وہاں سے جانے کے بعد پرویز سنجیدگی سے اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچنے لگا۔ پرویز اچھی طرح جانتا تھا کہ دلدار اور انسپکٹر یاور حیات کو آسانی سے بے وقوف نہیں بنا سکتا ہے..... یہ ٹھیک تھا کہ وہ دونوں اپنی طاقت کے زعم میں اسے چھوڑ تو دیں گے..... مگر اس کی کڑی نگرانی بھی ساتھ ساتھ کرتے رہیں گے اور انہیں ذرا بھی اس کی طرف سے کسی چالاکی کا شبہ ہو تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے..... اور پھر سدھوراں کو ترنوالہ بنانے میں بھی دیر نہیں لگائیں گے۔ لہذا پرویز نے اب سوچ سمجھ کر آگے قدم بڑھانا تھا۔

تھوڑی دیر گزری تو دلدار دوبارہ کسی شیطان کی طرح نازل ہوا۔ اس بار پرویز نے دیکھا کہ اس کے مکروہ چہرے پر سنجیدگی کھنڈی ہوئی تھی..... چند ثانیے پرویز کو سپاٹ نظروں سے دیکھتا رہا پھر بالکل بدلے ہوئے لہجے میں اسے متنبہ کرتے ہوئے بولا۔ ”دیکھ پرویز.....! اپنا صاحب تجھے چھوڑنے پر راضی تو ہو گیا ہے مگر اس نے تجھے خبردار کرتے ہوئے پیغام دیا ہے کہ اگر تُو نے ذرا بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو پھر میں تجھے مارنے میں ذرا بھی دیر نہ لگاؤں گا۔ اس کے بعد ہمارا کام خود ہی آسان ہو جائے گا کیونکہ سدھوراں اکیلے رہ جائے گی اور خود ہی پکے ہوئے پھل کی طرح ہماری جھولی میں آکرے گی۔“

دلدار کے مکروہ لہجے سے پرویز کے رگ و پے میں ایک لمحے کو موت کی سرسراہٹ ابھری تھی مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس نے فوراً کہا۔ ”نہیں..... اب میں تم لوگوں کی طاقت سے اچھی طرح واقف ہو گیا ہوں..... میں نے پہلے ہی تم لوگوں سے بھاگ کر غلطی کی اور در بدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ سدھوراں بھی میری در بدری کی وجہ سے کب تک تنہا مصیبت جھیلے گی..... میں اب اسے ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کروں گا آخر کو وہ میری بیوی ہے..... اپنے لئے اور میری خاطر اسے اب میری بات ماننا ہی پڑے گی۔“

دلدار اپنی مکارانہ نظروں سے اس کے چہرے کو کھوجتا ہوا بولا۔ ”ہاں پرویز.....! اب کیا کہتے ہو ہماری بات مانتے ہو تو بولو..... ابھی میں انسپکٹر صاحب سے تمہاری گلو خاصی کرائے دیتا ہوں اور تمہارے جو اڈے سیل ہو چکے ہیں، وہ بھی چالو ہو جائیں گے۔“

”دلدار.....! یار یہ حقیقت ہے کہ میری اس دوسری بیوی نے مجھ پر نجانے کیسا جادو کر ڈالا تھا کہ اس کے حسن میں اندھا ہو کر اپنے یاروں کو بھی بھول گیا۔“ بالآخر پرویز نے کینچلی بدلتے ہوئے بڑے سراسیمہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”عورت کے بارے کسی نے صحیح کہا ہے کہ یہ عورت انسان کی عقل خط کر کے رکھ دیتی ہے پر..... اب میں کیا کر سکتا ہوں..... انسپکٹر تو مجھ پر اب بھروسہ نہیں کرے گا۔“

اس کی بات پر دلدار کے مکروہ چہرے پر جیسے شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی..... وہ گرم جوشی سے آگے بڑھا اور پرویز کو اپنے گلے سے لگاتے ہوئے بولا۔ ”ارے تُو گھبراتا کیوں ہے..... میں ہوں نا..... انسپکٹر کا پرانا نمک خوند..... بس تُو اپنی بیوی کو راضی کر لے.....“

”پر یار دلدارے..... اس کے لیے مجھے تھوڑی سی مہلت تو ملے گی نا..... آخر کو اسے سمجھانا پڑے گا..... بلکہ سدھوراں کو باقاعدہ ڈرانا دھمکانا پڑے گا۔ اب تو وہ ایک بچے کی ماں بن گئی ہے.....“ پرویز نے دل ہی دل میں دلدار اور انسپکٹر یاور حیات پر لعنت بھیج کر کہا۔

دلدار نے پُر سوچ انداز میں اپنا سر ہلا دیا۔ درحقیقت پرویز کو سدھوراں کی طرف سے فکر بھی لاحق ہونے لگی تھی کہ..... جب سے اسے میٹرٹی ہوم چھوڑ کر آیا تھا، اس کے بعد سے اسے اس کی کوئی خبر نہ ملتی تھی اور نہ ہی وہ دوبارہ اس بے چاری کی خیر خیریت معلوم کرنے گیا تھا۔

جب دلدار وہاں سے جانے لگا تو پرویز نے کسی خیال کے تحت اسے روک کر پوچھا۔

”یار دلدارے.....! میری ایک مشکل ہے.....؟“

”کیسی مشکل ہے۔ کھل کر بول..... میں تیرا پرانا دوست ہوں نا یار.....؟“

پرویز نے ایک بار پھر اندر ہی اندر اس کی مکروہ دوستی پر لعنت بھیجتے ہوئے دہرے دل سے چالاکی سے کہا۔ ”یار..... صاحب نے تو میرے خلاف پورے علاقے کی پولیس کو لگا دیا ہے..... اور میں جن اذوں پر کام کرتا تھا..... اسے بند کر دیا ہے..... کیا یہاں سے جاتے ہی

نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یعنی اس نے کہیں اور رہنے کی بجائے اپنے گھر میں ہی رہنے کو ترجیح دی تھی۔ اس طرح پرویز اس سے ملنے کسی بھی وقت آ سکتا تھا۔

پرویز نے خوشی اور تذبذب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دروازے پر دستک دی تو اندر سے فوراً ہی سدھوراں کی مترنم آواز ابھری۔ ”کون ہے؟“

”س..... سدھوراں.....! دروازہ کھول..... میں ہوں پرویز.....“

اور اگلے ہی لمحے دروازہ دھڑ سے کھل گیا۔ سامنے سدھوراں کا متغیر چہرہ جیسے صدیوں سے اس کا منتظر تھا۔ پرویز غراب سے اندر گھس گیا۔ اپنے شوہر کو زندہ سلامت پا کر اس بیچاری سدھوراں کے پیارے پر خوشی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔

”پپ..... پرویز..... یہ تم ہو..... مجھے یقین نہیں آ رہا.....“

”ہاں سدھوراں.....! یہ میں ہوں..... چل آ..... اندر تیرے سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔“ پرویز نے کہا۔ سدھوراں اس وقت کپڑے دھو رہی تھی۔

وہ دونوں اندر کمرے میں آ گئے تو اچانک پرویز کی نگاہ سامنے مسہری پر ایک ننھے منے بچے پر پڑی۔ وہ خوش ہو کر بولا۔ ”سدھوراں.....! یہ ٹھیک تو ہے..... اور..... اور..... تیری طبیعت کیسی ہے..... تجھے ابھی کام تو نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

پرویز کو بچے کی طرف سے خوش ہوتا پا کر سدھوراں کا ستا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔

”یہ بالکل ٹھیک ہے..... اور میں بھی ٹھیک ہوں.....“ پھر اس نے بچے کا نام اسے بتاتے ہوئے مزید کہا۔ ”تمہارے جانے کے بعد پہلوان جی اور بعد میں ڈاکٹر فوزیہ بھی آئے تھے پھر ڈاکٹر فوزیہ مجھے اپنے گھر لے گئی تھیں مگر میں چند دن وہاں رہنے کے بعد اس خیال سے دوبارہ ادھر آ گئی کہ تم میرے پاس ضرور آؤ گے..... کہیں گھر پر تالا پڑا دیکھ کر لوٹ نہ جاؤ.....“

”یہ تم نے بڑی عقلمندی کا کام کیا۔“ پرویز نے کہا۔ پھر اس نے بچے کی پیشانی کو دھیرے سے چوما۔ بچہ سو رہا تھا۔ پرویز بولا۔ ”بھئی اس بچے کا نام کچھ بھی ہو..... میں اسے ”کاکا“ کہوں گا.....“

سدھوراں کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی مگر پھر دوسرے لمحے متفکر لہجے میں پرویز سے بولی۔ ”پرویز.....! تم اب تمہیں نہیں جاؤ گے ناں..... تمہاری پیچھے تو پولیس لگی ہے ناں..... مگر تم بالکل بے فکر ہو جاؤ..... ڈاکٹر فوزیہ نے تمہاری قبل از وقت گرفتاری ضمانت کے لیے ایک ایک وڈے پولیس افسر سے بات رکھی ہے۔“

پرویز کے بہ ظاہر مستحکم لہجے پر دلدار خوش ہو گیا۔ پھر اس کے بعد پرویز کو خاموشی کے ساتھ انسپکٹر یاور حیات کے اس دور افتادہ علاقہ میں واقع نو تعمیر شدہ بنگلے سے روانہ کر دیا گیا۔ پرویز نے ٹیکسی پکڑی اور اپنے قیوم آباد والے مکان کی طرف روانہ ہوا۔

اب اس کے اندر زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ سرتاپا آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ اس کی رگ رگ میں خون لاوے کی طرح ابل رہا تھا۔ اس نے اب یہ پختہ ارادہ باندھ لیا تھا کہ اسے جیسے ہی موقع ملا..... تو ان دونوں شیطانوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ مگر..... اب وہ ہر قدم نہایت ہوشیاری کے ساتھ اور سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہتا تھا۔ اس کے پاس بہت مہلت تھی۔

جب ٹیکسی گورا قبرستان سے کالا پل کی طویل سڑک پر مڑی تو پرویز کو اچانک اپنے تعاقب کا احساس ہوا۔ اسے شاید یہ بات دیر سے معلوم ہوئی تھی کہ ایک ہرے رنگ کی ہائی روف مسلسل ذرا فاصلے سے تعاقب میں چلی آرہی تھی۔ پہلے تو پرویز نے اسے محض اپنے وہم سے محمول کیا مگر اچھی طرح تصدیق کرنے کی خاطر اس نے محمود آباد چورنگی سے ٹیکسی والے کو بائیں جانب مڑنے کا اشارہ دیا اور پہلے اعظم ہستی اور پھر منظور کالونی کے علاقہ میں بے مقصد ٹیکسی کو گھمانے کے دوران اس نے دیکھا کہ وہ ہرے رنگ کی ہائی روف مسلسل اس کے تعاقب میں ہے تو اس نے ایک گہری سانس لے کر ٹیکسی والے کو سیدھا قیوم آباد کا رخ کرنے کو کہا۔

قیوم آباد کے اسٹاپ پر ہی پرویز نے ٹیکسی کو رکنے کا کہا۔ پھر اسے اجرت دینے کے بعد وہ پیدل آبادی کی طرف بڑھ گیا۔

اپنی گلی کے کنارے پر بنے ایک کیمپن سے اس نے گولڈ لیف کے دو سگریٹ خریدے اور اسے پان بنانے کو کہا۔ سگریٹ سگا کر اس نے کن انکھیوں سے اپنے عقب میں دیکھا تو وہاں ہرے رنگ کی ہائی روف اس سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ پرویز نے ایک لمحے کے اندر انہیں تاڑا۔ ہائی روف کے اندر چار افراد موجود تھے۔ اس میں سے دو شخص اس کا ”سلائیڈنگ ڈور“ کھول کر نیچے اتر آئے تھے۔ پرویز کیمپن والے کو پیسے دیتا ہوا بہ ظاہر لائق سا آگے بڑھ گیا۔

اب اپنے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے وہ دھڑکتے دل کے ساتھ یہی دعا مانگ رہا تھا کہ اللہ کرے سدھوراں گھر پر ہی موجود ہو۔ پھر جب وہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ کر رکا تو اس کا دل خوشی سے دھڑکا۔ دروازے پر تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سدھوراں

اس کی بات پر پرویز کے ہونٹوں پر بڑی زہر خند مسکراہٹ ابھری اور پھر وہ اسی لہجے میں سدھوراں سے بولا۔ ”میرے پیچھے کوئی پولیس ویس نہیں لگی۔۔۔۔۔ یہ سب اس کمینے شیطان دلدارے کی بدمعاشی تھی۔ انہوں نے اپنے مکروہ مقصد کی خاطر یہ سارا ڈرامہ رچایا تھا۔ اب میری بات غور سے سن۔۔۔۔۔“

پھر پرویز نے اسے اب تک کے حالات سے آگاہ کیا پھر بولا۔ ”دیکھو سدھوراں! تجھے اب ذرا ہمت سے کام لینا ہوگا۔۔۔۔۔ ہمارے ارد گرد بھوکے بھیڑیوں کا جمگھٹا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ اس وقت بھی دشمنوں کے کچھ کتے باہر ہماری نگرانی کر رہے ہیں۔ ہمیں بہت جلد یہ علاقہ بلکہ یہ شہر ہی چھوڑ دینا ہوگا۔۔۔۔۔“ پرویز نے اپنی بات مکمل کر تو بے چاری سدھوراں کا دل دھک سے رہ گیا۔

☆=====☆=====☆

زمیندار رحیم بخش، گوٹھ رمضان پور کا ایک معتبر شخص تھا۔ سارنگ نے اس کی اوطاق میں پناہ لے رکھی تھی جبکہ اس کی بھابی اللہ وسائی اور فرید کو اندر حویلی کے ملازموں والے زمان خانے میں رکھا گیا تھا۔ زمیندار رحیم بخش ایک نیک طینت اور خدا ترس انسان تھا۔۔۔۔۔ وہ جمعرات کے جمعرات اپنی اوطاق میں اللہ واسطے لنگر (خیرات وغیرہ) کرتا رہتا تھا۔ نیز مصیبت کے ماروں کے بھی کام آتا تھا۔ ایسے نیک شخص کی شہرت بھی نیک ہوتی ہے۔ ایک مقامی آدمی کے مشورے پر ہی سارنگ نے ادھر کا رخ کیا تھا۔ پھر بہت جلد ہی سارنگ کو معلوم ہو کہ چند گھروں پر مشتمل قریبی گھوٹھوں میں تھر سے آئے ہوئے قافلوں میں ایک کارواں سائیں بخش کا بھی تھا۔ یہ معلوم ہوتے ہی زمیندار رحیم بخش نے فوراً اپنے دو آدمیوں اور ایک تیل گاڑی کا بندوبست کیا پھر سارنگ اور بھابی اللہ وسائی وغیرہ کو اس میں سوار کروا کر روانہ کر دیا۔

یہ لوگ علی الصباح زمیندار رحیم بخش کی اوطاق سے روانہ ہوئے تھے۔ سڑک پار کرنے کے بعد دھوپ چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ فضا میں جس اور گرمی کا عنصر غالب تھا۔۔۔۔۔ سارنگ اور بھابی اللہ وسائی کے دل و دماغ کی عجیب کیفیات ہو رہی تھی۔ سارنگ کے چشم تصور میں بار بار میراں کا گلنار چہرہ رقصاں تھا جو بے چاری جانے کب سے اس کی راہ تک رہی ہوگی۔ پھر اسے اپنی ماں عجیباں، باپ مٹھل، بہن ملوکاں بھی یاد آنے لگے اور مسرور دل سے سوچنے لگا کہ یہ سب لوگ اسے دیکھ کر کتنے خوش ہوں گے۔ ادھر بھابی اللہ

وسائی کو اگرچہ صرف اپنا شوہر خالقو ہی نہیں اپنی ساس اور نندیں بھی یاد آ رہی تھیں۔ مگر اپنے آلی موالی شوہر خالقو کو یاد کر کے ایک عجیب سا دکھ محسوس کر رہی تھی۔ اسے وہ عبرت انگیز گھڑیاں یاد تھیں جب گھر سے نکلنے وقت ایک پراسرار بیماری کی وجہ سے نہ صرف قافلے سے علیحدہ کر دیا گیا تھا بلکہ اس کے شوہر خالقو نے اسے بری طرح دھتکار دیا تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ اس کا دیوار سارنگ اس کے بعد اس کے بچے کے لیے رحمت کا فرشتہ بن گیا تھا اور اس کے دل نے یہ گورانہ کیا تھا کہ اپنی بھابی اور معصوم ننھے منے بھتیجے کو تھر کے پتے ہوئے ویران ریگزار میں بھٹکنے کو چھوڑ دے۔

اللہ وسائی کو اب جہاں اپنوں کے عنقریب ملنے کی خوشی ہو رہی تھی وہاں اسے یہ پریشانی بھی لاحق تھی کہ نجانے اس کا شوہر خالقو اسے قبول بھی کرتا ہے یا نہیں۔

”کیا سوچ رہی ہو۔۔۔۔۔ بھابی۔۔۔۔۔ کیا تجھے خوشی نہیں ہو رہی کہ اب ہم بہت جلد اپنوں سے ملنے والے ہیں؟“ سارنگ نے اس کے چہرے کے پریشان کن تاثرات کو بھانپتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا۔

اللہ وسائی جلدی سے اپنی آنکھوں میں اتری ہوئی نمی کو اجرک نما چادر کے پلو سے پونچھتے ہوئے بولی۔ ”ہاں ادا۔۔۔۔۔! مجھے بھلا کیسے نہیں خوشی ہوگی۔۔۔۔۔ ساس ماں، بہن ملوکاں، پپو اور چاچا سکھو، میراں یہ سب مجھے یاد آتے ہیں، میں انہیں کیسے بھلا سکتی ہوں۔۔۔۔۔“

”۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ ادا خالقو۔۔۔۔۔؟“ سارنگ نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اللہ وسائی کے چہرے کا چھپا ہوا دکھ آرزوگی کی صورت میں نمایاں ہو گیا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے اداس لہجے میں بولی۔ ”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں وہ بھی یاد تو آتا ہے۔۔۔۔۔ مگر پتہ نہیں اب مجھے قبول کرتا بھی ہے کہ نہیں۔۔۔۔۔“

”کیسے نہیں کرے گا تجھے قبول۔۔۔۔۔“ سارنگ تنک کر حوصلہ افزا لہجے میں بڑی رساں سے بولا۔ ”تو اس کی بیوی ہے، اس کے بچے کی ماں ہے۔۔۔۔۔ اور ویسے بھی اب کون سا تجھے کوئی بیماری ہے۔۔۔۔۔ میں ہوں نا۔۔۔۔۔ مت دل چھوٹا کر۔۔۔۔۔ میں سمجھاؤں گا ادا خالقو کو۔۔۔۔۔ اب پہلے والے حالات نہیں رہے۔۔۔۔۔ مجھے یقین ہے یہ لوگ سب اب سکھی ہوں گے بلکہ بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔۔۔۔۔ تو دیکھنا ہمیں دیکھ کر وہ لوگ سب کتنا خوش ہوں گے۔۔۔۔۔“

بچاری کو تو اب دکھائی بھی کم دینے لگا تھا۔ مگر اپنی ملوکاں کے منہ سے ”سارنگ“ اس کی ہانتوں تک پہنچ گیا تھا، جو تپ کر کپکپاتے ہوئے اٹھنے لگی۔

”میزاپٹ..... سارنگ.....؟ کدھر سے لوٹاؤ.....“ مائی عجیبیاں کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

سارنگ آہستگی سے ملوکاں کو علیحدہ کرتے ہوئے ماں کی طرف بڑھا اور اس سے لپٹ گیا۔ ”اور امڑ گودی.....! کیسی ہے تُو۔ یہ تجھے کیا ہو گیا ہے.....“

”ہائے پٹ.....! تو کدھر تھا..... تجھے دیکھے ہوئے تو میری آنکھیں ترس گئی تھیں۔“

عجیبیاں زار و زار روتے ہوئے لرزاں لمبے میں بولی۔ اسی اثناء میں ملوکاں بھی بھائی کے قریب آگئی اور اس سے لپٹ کے رو پڑی۔ سارنگ اپنی بہن کو اس طرح رنجور خاطر ہوتے روتا دیکھ کر پریشان سا ہو گیا پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا..... جھکی کے باہر کھڑے سانول نے پکارا۔ ”بابا..... اب میں چلتا ہوں.....“

سانول کی آواز سن کر ملوکاں چونک سی گئی..... سارنگ کو بھی یاد آیا کہ باہر وہی بھلا مانس جو ان ابھی تک کھڑا تھا جو انہیں یہاں تک لایا تھا۔ بھابی اللہ وسائی..... اپنی ساس عجیبیاں کو سنبھالے ہوئے تھی۔ ننھے منٹھو کو ملوکاں نے اپنی گود میں بھر لیا تھا۔ فرید والبتہ ایک طرف خاموش کھڑا تھا۔

”ادا..... یہ سانول..... تمہارے ساتھ آیا ہے.....“ اچانک ملوکاں نے بھائی سے پوچھا۔

سارنگ چونکا، وہ بولا۔ ”تُو اسے جانتی ہے.....؟“

”ہاؤ ادا.....!“ ملوکاں اتنا کہہ کر شرما سی گئی۔ تب پھر مائی عجیبیاں نے بتایا کہ سانول اس کا ہونے والا بہنوئی ہے..... اب تو سارنگ کو بڑی شرمندگی ہوئی۔ فوراً باہر لپکا اور ایک طرف خاموشی سے سر جھکائے سانول کے گرجوشی سے گلے لگ گیا۔ اسے یہ سیدھا سادا اور شریف النفس نوجوان اچھا لگا تھا جو اس کا ہم عمر تھا۔

سارنگ، سانول کو لئے اندر آ گیا۔ اندر..... کیا دیکھتا ہے بھابی اللہ وسائی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اور اب صورت حال بدل گئی تھی۔ اب عجیبیاں اور ملوکاں بھابی اللہ وسائی کو سنبھال دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ سارنگ کو حیرت کو جھکا لگا۔ اُسے دیکھ کر اللہ وسائی روتے ہوئے اس کی طرف بڑھی۔ ”ادا سارو.....! بابا گزر گیا۔ میرا سر کا سامین خالقا..... اس دنیا میں نہیں رہا۔“

سارنگ کی تسلی بخشی پر بھابی اللہ وسائی کے دل کو ذرا ڈھارس ہوئی۔ ان بچاروں کو کیا معلوم کہ وقت نے ان سے اب تک کتنا خراج وصول کیا تھا.....؟ خالقو اپنے اعمالوں کی سزا بھگت کر اس جہان سے کوچ کر گیا تھا اور چاچا سکھیو بھی اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ بہر طور..... انہی سوچوں اور باتوں کے درمیان سفر جاری رہا۔ مین شارع کو پار کرنے کے بعد کلر اور سیم زدہ زمین کا سلسلہ اختتام کو پہنچا تو چھدری جھڈریوں والا چٹیل میدان شروع ہوا۔ پھر مختصر سے ایک کیکر اور آسریں کے گنجان جنگل کو پار کرنے کے بعد کھیتوں کے سلسلے شروع ہوئے کہ انہیں دور سامنے کچے گھروں کی بے ترتیب قطاریں دکھائی دینے لگیں۔ ان کے دل خوشی کے مارے بے طرح دھڑکنے لگے۔ پھر سب سے پہلے جس گوٹھ کی حدود میں داخل ہوئے وہاں سانول رہتا تھا..... اتفاق سے دور ایک قریبی کھیتوں میں بے دلی کے ساتھ کام میں مصروف تھا اور سب سے پہلے ان لوگوں نے اس سے ہی مٹھل اور چاچا سکھیو کے بارے میں پوچھا تو سانول چونک کر انہیں نکلنے لگا۔ پھر گاڑی بان نے سانول کو سارنگ اور اللہ وسائی کے بارے میں بتایا کہ سارنگ مٹھل ہاری کا بیٹا ہے اور اللہ وسائی اس کے بڑے بیٹے خالقو کی بیوی ہے۔ سانول نے فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ان سے کہا کہ وہ مٹھل اور چاچا سکھیو کو اچھی طرح جانتا ہے۔ مگر سر دست اس نے سارنگ اور بھابی اللہ وسائی کو چاچا سکھیو اور مٹھل کی موت کے بارے میں نہیں بتایا۔ اب سانول بھی ان کے ساتھ نیل گاڑی میں سوار ہو گیا تھا۔

قصہ مختصر..... سانول انہیں لے کر جھگیوں قریب پہنچا..... پھر گاڑی بان اور زمیندار کا شکریہ ادا کر کے سانول نے انہیں روانہ کر دیا۔ اگرچہ اس نے روایتاً ان سے کھانے پینے کا پوچھا تھا مگر انہوں نے شکریے کے ساتھ معذرت کر لی تھی اور لوٹ گئے تھے۔

سب سے پہلے سارنگ نے دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی جھگی میں قدم رکھا تو اسے پوری جھگی میں عجیب سی سوگوار ویرانی سی محسوس ہوئی..... جھگی کے بوسیدہ صحن میں اس کی بوڑھی ماں عجیبیاں حقہ پینے اور کھانے میں مصروف تھی۔ سارنگ اپنی ماں کو پہلے تو پہچان نہیں پایا تھا، جو پہلے سے کہیں زیادہ ضعیف اور ہڈیوں کا ڈھانچا بن چکی تھی۔ سارنگ کا دل ماں کی حالت پر کڑھ سا گیا۔ تب پھر اچانک رسوئی میں کام کرتی ہوئی سارنگ کی بہن ملوکاں کی نظر سب سے پہلے..... اپنے بھائی پر پڑی اور بے اختیار خوشی سے چلائی۔

”ادا سارنگ.....“ پھر وہ دیوانہ وار خوشی سے دوڑتی ہوئی سارنگ سے لپٹ گئی۔

”سارنگ“ کا نام سن کر حقہ جمائے بیٹھی عجیبیاں بھی ایک لمحے کے لئے چونک گئی..... اس

سارنگ کے دل کو جیسے گھونسل لگا اور پھر ملوکاں نے رفتہ رفتہ اپنے بھائی سارنگ کو باپ اور بھائی کی اندوہناک موت کے بارے میں بتا دیا۔۔۔۔۔ سانول تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر لوٹ گیا تھا۔ جھگی میں سوگواری چھائی رہی۔ اسی اثناء میں ملوکاں چاچی اور میراں کو بھی اپنی جھگی میں لے آئی۔ سب نے مل کر مرنے والوں پر آنسو بہائے اور پھر ان کی مغفرت کی دمانیں کیں۔ مرنے والوں پہ صبر آہی جاتا ہے کیوں کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے، جس کا ہر شخص نے ذائقہ چکھنا ہے۔

سارنگ کو دیکھ کر میراں کے دل کی دنیا جیسے دوبارہ آباد ہو گئی تھی۔ اس کا بچھا بھسا رہنے والا گل فلکار چہرہ اب دوبارہ بہار کی طرح کھل اٹھا تھا۔ خود سارنگ بھی اس کیفیت بہاراں سے گزر رہا تھا۔ میراں کا رخ روشن دیکھے جیسے صدیاں بیت گئی تھیں۔ مائی عجیباں کو اب عقل آگئی تھی اور ویسے بھی اب عمر کے ایسے دور سے گزر رہی تھی کہ عقل ٹھکانے نہ یا نہ ہو، زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ بہر طور۔۔۔۔۔ میراں اور سارنگ کی بات چلی کر دی تھی۔ مگر اب سب سے پہلے ملوکاں کو رخصت کرنا تھا۔

پھر سانول اور ملوکاں کی شادی کا دن آ پہنچا۔ سہیلیاں سکھیاں گانے لگیں۔ تنگ وتار یک جھگی میں خوشیوں کے شادیانے بجنے لگے۔ خوشیاں منانے اور شادیانے بجانے والے کتنے ساہلہ دل ہوتے ہیں۔ انہیں یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ خوشیاں تھوڑی غم بہت ہے۔

☆=====☆=====☆

انسپکٹر جھٹل شاہ کی اپنی سی پوری کوشش تھی کہ بد بخت آچر خان کا رابطہ وڈیرے علی نواز سے نہ ہو مگر باوجود کوشش کے ایسا نہ ہو سکا۔۔۔۔۔ لاک اپ میں ہونے کے باوجود آچر خان کا ایک ملاقاتی کسی طرح آچر خان سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو گیا بس پھر کیا تھا، اسی دن وڈیرے علی نواز کا ایک خاص آدمی چند ساتھیوں سمیت تھانے آن پہنچا۔

”انسپکٹر سائیں۔۔۔۔۔ ہمیں سائیں بھوتار نے بھیجا ہے، وہ آپ کو سلام کہتا ہے، اس کا ایک آدمی آپ نے پکڑ رکھا ہے آچر خان۔۔۔۔۔!“

”ہاں تو میں کیا کروں بابا! چھوڑ دوں اسے۔۔۔۔۔؟“ انسپکٹر جھٹل شاہ طنز یہ لہجے میں وڈیرے کے حواری کی بات کاٹ کر بولا۔

وہ حواری قدرے جزبہ سا نظر آنے لگا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”ہاں۔۔۔۔۔ وڈیرے سائیں نے اس کی ضمانت بھیجی ہے۔“

”مجرم قتل کے جرم میں مطلوب ہے، اس کی ضمانت صرف عدالت ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔“ انسپکٹر نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”پرانسپکٹر سائیں اٹل کا جرم ابھی ثابت تو نہیں ہوا ناں۔۔۔۔۔؟ آپ اپنی تفتیش جاری رکھیں، آپ کو کون منع کر رہا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے قریب کھڑے آدمیوں میں سے ایک کو مخاطب کیا۔ ”اڑے جانو۔۔۔۔۔! آگے آؤ۔“

اس کے حکم پر ملکہ شخص نے اپنی قمیض کی اندرونی صدری کی تھیلی انما جیب سے ایک موٹا اور ذرا بڑا لفافہ نکال کر اسے فوراً میز پر انسپکٹر کے سامنے رکھ دیا۔

”یہ کیا ہے۔۔۔۔۔؟“ انسپکٹر جھٹل شاہ نے لفافے پر پراچتی سی نظر ڈال کر پوچھا۔ حواری اپنے ہونٹوں پر مکارانہ انداز کی مسکراہٹ بکھیر کر بولا۔ ”یہ کچھ نوٹ بھوتار سائیں نے آپ کی خدمت میں بھیجے ہیں، اسے قبول کر لیں۔“

”تم مجھے رشوت دے رہے ہو؟“ انسپکٹر جھٹل شاہ نے اس کا اشارہ سمجھ کر گھورتے ہوئے کہا۔

”نانا سائیں نا۔۔۔۔۔! یہ رشوت نہیں ہے، یہ تو ضمانت ہے صرف پچاس ہزار ہی تو ہیں۔“

اس کی بات سن کر انسپکٹر جھٹل شاہ کو جیسے کرنٹ لگا اور وہ غصے سے بھناتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر کڑک دار لہجے میں بولا۔ ”کھڑے ہو جاؤ۔۔۔۔۔!“

وڈیرے کا خاص آدمی جس کا نام یار خان تھا، یکدم گڑ بڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”یہ لفافہ اٹھاؤ اور یہاں سے فوراً دفع ہو جاؤ ورنہ رشوت دینے کے الزام میں تمہیں بھی اندر کر دوں گا سمجھے تم۔۔۔۔۔؟“ انسپکٹر جھٹل شاہ نے ہونٹ بھیجنے کر کہا۔ اس کے چہرے تناؤ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے غصے پر بمشکل قابو پائے ہوئے ہے۔

”مگر سائیں بھوتار نے تو یہ روپے۔۔۔۔۔!“

”تم نے سنا نہیں۔۔۔۔۔؟ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔۔۔۔۔ حرام کھانے والے دوسرے پولیس افسر ہوتے ہیں۔ میں ان میں سے نہیں ہوں۔“ انسپکٹر جھٹل شاہ نے بدستور گرم لہجے میں کہا تو وڈیرے کے حواری نے خاموشی سے لفافہ اٹھایا اور پھر ایک نگاہ انسپکٹر جھٹل شاہ کے چہرے کی طرف ڈالتے ہوئے اپنے دانت بھیجتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

وڈیرے علی نواز کے آدمیوں کے تھانے سے رخصت ہوتے ہی انسپکٹر جھٹل شاہ نے فوراً محرر نبی بخش کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اسے آچر خان کے خلاف چالان تیار کرنے کا

حکم صادر کیا۔

انسپکٹر جھٹل شاہ صحیح معنوں میں قانون کا رکھوالا تھا، دیانتدار اور فرض شناس..... وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا تھا، اگرچہ دریا میں رہتے ہوئے مگر مچھوں سے بیر نہ لینے کا محاورہ اسے بھی معلوم تھا مگر ایسے مگر مچھوں سے وہ منمننا اچھی طرح جانتا تھا۔

وڈیرے علی نواز کے خاص آدمی یار خان کو گئے ابھی ذرا ہی دیر گزری تھی کہ اچانک باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری پھر چند لمحوں بعد ہی ایک بھاری بھر کم اور رعب دار آدمی جتن اٹھا کر اندر داخل ہوا۔ یہ وڈیرے علی نواز تھا، اس کے چہرے پر روایتی کرنٹکی اور آنکھوں میں رعونت کھنڈی ہوئی تھی، اس نے بے داغ کڑکڑاتی ہوئی سفید شلوار قمیض زیب تن کر رکھی تھی، سر پر شیشے کے کام والی سرخ ٹوپی اور کاندھوں پر اجرک نے اس کی شخصیت کو مزید بارعب بنا رکھا تھا، اس کی بغل میں ہولشتر کی پٹی بھی جھول رہی تھی۔

اس کے ہمراہ چھ سات بندوق بردار حواری تھے، ان میں یار خان بھی تھا جواب کینہ تو ز نظروں سے انسپکٹر جھٹل شاہ کو استہزائیہ انداز میں تکتے جارہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”اب بولو..... ذرا..... ہمارے بھوتار سائیں کے آگے.....“

انسپکٹر جھٹل شاہ، وڈیرے علی نواز اور اس کے بندوق بردار حواریوں کو دندانہاتے ہوئے اندر داخل ہوتے دیکھ کر ذرا بھی مرعوب نہ ہوا، وہ اپنی جگہ لا پروا انداز میں بیٹھا رہا۔

”اڑے بابا.....! تم نے ہمارے آدمی (یار خان) کو کیوں واپس کر دیا؟“ وڈیرے نے جھٹکے دار لہجے میں انسپکٹر جھٹل شاہ سے کہا۔ انسپکٹر نے ابھی تک اسے بیٹھنے کو نہیں کہا تھا تاہم وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے غصے سے اردلی کو مخاطب کر کے بولا، جو وڈیرے اور اس کے آدمیوں سمیت گھبرایا ہوا انداز آگیا تھا اور اس کے ہمراہ تین چار پولیس والے بھی در آئے تھے۔

”محمد بخش! تم کو ابھی تک دروازے پر ڈیوٹی سنبھالنی نہیں آئی ہے۔“ پھر وہ ساتھ کھڑے پولیس والوں سے بولا۔ ”کیا میں تم لوگوں کو بھی تنہا ہی ڈیوٹی سمجھاؤں.....؟“

اردلی محمد بخش اور دیگر پولیس والے نظریں چرانے لگے تو وڈیرے علی نواز دانت پیستے ہوئے انسپکٹر سے بولا۔ ”انسپکٹر.....! تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا.....؟“

”وڈیرے علی نواز.....! یہ تمہانہ ہے، تمہاری اوطاق نہیں..... تمیز سے بات کرو، میں ہوں ذرا اور قسم کا تھا نیدار.....! سمجھے تم.....!“ انسپکٹر جھٹل شاہ کو بھی طیش آگیا۔

وڈیرے علی نواز اس کے جیرے پر اپنی سنسناتی ہوئی نظریں مرکوز رکھتے ہوئے بولا۔

”انسپکٹر.....! یہ پورا علاقہ ہماری اوطاق ہے اور ہم جب چاہیں اپنی اوطاق سے تم جیسوں کو نکال باہر کر سکتے ہیں۔“ اس کے واضح الفاظ پر انسپکٹر جھٹل شاہ کو بھی غصہ آگیا۔

”وڈیرے علی نواز.....! اپنے آنے کا مقصد بیان کرو، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”وقت تو ہمارے پاس بھی نہیں ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وڈیرے علی نواز کرسی کھینچ کر براجمان ہو گیا پھر ذرا معتدل لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ”بیٹھو بابا بیٹھو..... تم سے آرام سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”میں سن رہا ہوں..... تم بات کرو۔“

”انسپکٹر.....! آچر خان کو تم نے کس جرم میں لاک اپ کر رکھا ہے؟“ وڈیرے نے پوچھا۔

”وہ دہرے قتل کی واردات میں ملوث پایا گیا ہے۔“

”کوئی ثبوت ہے اس کا تمہارے پاس.....؟“

”مقتول خالقو کا پیرا اس کے ہوٹل تک پایا گیا ہے جو اللہ رکھیو کو قتل کر کے بھاگا تھا، شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعد میں ثبوت مٹانے کی خاطر آچر خان کے ہی ایک گناہم ساتھی نے اس کے کہنے پر خالقو کا بھی قتل کر دیا۔“

”ہونہہ.....! شواہد.....“ وڈیرے علی نواز استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ”انسپکٹر.....! تم کس دنیا میں رہتے ہو بابا.....! صرف پیرا ملنے سے کیا ہوتا ہے، اچھا چلو چھوڑو تم اپنی تفتیش جاری رکھو، میں آچر خان کی تحریری ضمانت دیتا ہوں، اسے چھوڑ دو اور جب بھی اس کی تمہیں ضرورت پڑے، وہ تمہانے آجائے گا ورنہ مجھے دوسری صورت میں اوپر والوں سے بات کرنا پڑے گی اور تم نے تو ابھی تک عدالت سے ریمانڈ بھی نہیں لیا ہے۔“

اس کی بات سن کر انسپکٹر جھٹل کے چہرے پر تذبذب کے آثار ابھرے پھر وہ بولا۔

”وڈیرے علی نواز.....! تم مجھے قانون پڑھانے کی کوشش مت کرو..... میں نے ابھی آچر خان کا چالان تیار کیا ہے، عدالت سے ریمانڈ بھی لے لوں گا۔“

”اڑے بابا انسپکٹر صاحب.....! ہم نے کہا نا تم اپنی تفتیش جاری رکھو جیسے ہی آچر خان کے خلاف ثبوت تمہارے ہاتھ لگا، ہم خود اسے کان سے پکڑ کر ادھر حاضر کر دیں گے..... اب کم از کم تمہیں ہماری آمد کا تو خیال کرنا ہی پڑے گا نا.....“ وڈیرے نے متحمل لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا اور پھر انسپکٹر جھٹل شاہ نے چند ثانیے کچھ سوچنے کے بعد سپاہی کو

اپنا سر جھکا لیا۔

”کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی سائیں.....؟“ ملوکاں نے بولے سے پوچھا۔

سانول اسی طرح جھکے جھکے سر کوفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ماما یاد آ رہا ہے، آج وہ ہوتا تو کتنا خوش ہوتا، تیرے سے شادی میں نے اس کے کہنے پر ہی کی تھی۔“ اس کے لہجے میں اداسی کھنڈی ہوئی تھی مگر ملوکاں اس کی بات سن کر اپنا دل موس کر رہ گئی پھر وہ شکوہ کناس لہجے میں بولی۔

”کیا مجھ سے شادی کرنے میں تیری اپنی مرضی شامل نہ تھی.....؟“

”نہیں.....! یہ بات نہیں ہے دراصل میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا پر ماما.....!“ اتنا کہہ کر وہ رکا پھر جیسے فوراً ملوکاں کی دلجمعی غرض سے چار پائی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”چلو اندر چلتے ہیں۔“

☆=====☆=====☆

دویرے علی نواز کی ضمانت پر رہائی پاتے ہی آچر خان کا دماغ جیسے یکدم آسمان پر پہنچ گیا تھا، وہ اب اکڑ کر چلنے لگے تھا مگر جب اسے ملوکاں کی سانول سے شادی کا علم ہوا تو جیسے اس کے پورے وجود میں انتقام کی آگ سی بھر گئی۔

اس نے ملوکاں کی سانول سے شادی کو اپنی انا اور غیرت کا مسئلہ بنا لیا بس پھر کیا تھا، وہ اسی رات اپنی دونالی بندوق سنبھالے تاریکی میں خاموشی کے ساتھ اور تنہا سانول کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ادھر سارنگ اپنی بہن ملوکاں کو رخصت کرنے کے بعد چپکا نہیں بیٹھا تھا..... حالات نے اسے محتاط اور بے جگر بنا ڈالا تھا، اسے مردود آچر خان کی چیرہ دستیوں کا بخوبی علم ہو چکا تھا اور اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ آچر خان ضمانت پر آج ہی رہا ہوا تھا، وہ جانتا تھا کہ آچر خان اس کی بہن ملوکاں سے شادی کرنے کے لیے کیسی کیسی گھناؤنی سازشوں کے تانے بانے بنتا رہا تھا اور اس نے کس طرح اس کے لالچی بھائی خالق کو اپنا آلہ کار بنایا تھا جو بعد میں خود بھی آچر خان کی بربریت کا نشانہ بن کر مکافات عمل کا شکار ہو گیا تھا چنانچہ اب سارنگ، آچر خان سے غافل نہیں رہنا چاہتا تھا لہذا جب اس نے دیکھا کہ آچر خان بھی آج کے دن دن رہا ہوا ہے تو سارنگ نے اس موذی کی ٹوہ لینا شروع کر دی تھی، اس کی چھٹی حس کی خطرے کا الارم بجارہی تھی..... رات ہوتے ہی وہ کلہاڑی سنبھالے بطور محافظ اپنی بہن

آچر خان کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔

”بہت مہربانی انپکٹر صاحب.....! تم نے ہماری عزت رکھ لی۔“ یہ کہتے ہوئے وڈیرا علی نواز اٹھ کر اس سے مصافحہ کرنے لگا۔

☆=====☆=====☆

شادی کا ہنگامہ تھا تو ملوکاں، سانول کی دلہن بن کر اس کے گھر آ گئی۔

ماما اللہ رکھو کے بغیر ملوکاں کو یہ گھر ویران ویران سا محسوس ہوا تھا، ایک سو گواریت سی چھائی ہوئی تھی، سانول کی دلہن بننے کے بعد ملوکاں کو یوں لگا جیسے اس کی برسوں کی آرزو پوری ہو گئی ہو..... سانول کی صورت میں اسے ایک مضبوط سہارا مل گیا تھا اور وہ اب اس کے ساتھ ساری زندگی بتانے کی آرزو رکھتی تھی۔

وہ دلہن بنی کوٹھری میں ایک صاف ستھری رلی بچھی چار پائی پر گٹھڑی بنی بیٹھی تھی اور اپنے سانول کے آنے کی شدت سے منتظر تھی پھر دفعتاً اس کی دم بخود سماعتوں نے کسی کے قدموں کی چاپ سنی، اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگا مگر یہ کیا..... آنے والا ایک تھکی تھکی سی سانس خارج کر کے ساتھ والی چار پائی پر خاموشی سے بیٹھ گیا تھا۔

ملوکاں نے سر نہ ہڑ رکھا تھا..... کوٹھری میں لائٹیں روشن تھیں، چند لمبے کوٹھری میں اسرار بھرا سناٹا طاری رہا پھر اس کے بعد دوسری چار پائی پر چرچرانے کی آواز ابھری اور ملوکاں عجیب سی الجھن کا شکار ہو گئی کیونکہ اب اس کی منتظر سماعتوں میں کسی کے واپس جانے کے قدموں کی آواز ابھری تھی۔

ملوکاں نے بے چین سی ہو کر ذرا گھونگھٹ اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا تو سانول باہر جا رہا تھا، وہ اجنبیہ کا شکار ہو گئی، چند ثانیے وہ اسی طرح خاموشی سے بیٹھی رہی پھر جب خاصی دیر تک سانول دوبارہ اندر نہ آیا تو وہ پریشان سی ہو گئی تب وہ شرم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے چار پائی سے اٹھی اور کوٹھری سے نکل کر صحن میں آ گئی..... سامنے شکستہ صحن کے وسط میں بچھی کھری چار پائی پر سانول سر جھکائے گم صم سا بیٹھا تھا..... آسمان پر نکلے طباق چاند کی روشنی میں ملوکاں، سانول کی طرف بڑھی پھر دیرے سے اس کے کاندھے پر اپنا حنائی ہاتھ دھرتے ہوئے اسے پکارا۔ ”سانول.....؟“

سانول نے جو پاؤں لٹکائے چار پائی پر گم صم سا بیٹھا تھا، دیرے سے اپنا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو ملوکاں کو اس کا چہرہ اداس سا دکھائی دیا، اس نے کچھ کہے بغیر دوبارہ

ملوکاں کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

لہذا اس نے آچر خان کی ٹانگ پکڑ لی اور اسے مروڑنے لگا، آچر خان ایک ٹانگ پر نہ پڑنے لگا، سانول نے اس کی ٹانگ پکڑ کر اسے زوردار جھٹکا دیا، آچر خان کو اپنی ٹانگ جوڑے سے بھتی ہوئی محسوس ہوئی، اس کے حلق سے ہلکی کراہ نکل گئی، سانول نے اسے پھر سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور جونیوں کے سے انداز میں آچر خان پر تازہ توڑ لاتوں اور ملکوں کی بارش کر دی..... آچر خان کے حلق سے غراہٹ آمیز کراہیں خارج ہونے لگیں، مار کھاتے کھاتے اچانک اس کا داؤ چل گیا اور اس نے لیٹے لیٹے سانول کے پیٹ پر لات رسید کر دی پھر وہ جلدی سے اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑا، ادھر باہر مطمئن ہو کر واپس لوٹتے ہوئے سارنگ کو بندوق چلنے کی دوسرے آواز سنانی دی تو وہ ایک لمحے کو اپنی جگہ ٹھٹک کر رکا اور پھر تیزی کے ساتھ واپس دوڑا..... پھر وہ جیسے ہی سانول کے گھر کے دروازے کے قریب پہنچا تو اس نے کسی کو اچانک دروازہ کھول کر باہر نکلتے دیکھا پھر ابھی وہ سنبھل بھی پایا تھا کہ ایک بیولہ اس سے ٹکرا گیا، یہ آچر خان تھا، اس نے کلباڑی بدست سارنگ کو دیکھا تو اسے دھکا دے کر گلی میں دوڑ لگا دی پھر اس کے عقب سے سانول غصے میں پھرا ہوا نمودار ہوا۔

دونوں ایک دوسرے کو پہچان چکے تھے۔ ”سارنگ.....! اس مردود کو پکڑو، یہ جانے نہ پائے۔“ سانول نے ہانپتی ہوئی پُر جوش آواز میں کہا۔ پھر دونوں آچر خان کے پیچھے دوڑ پڑے۔

☆=====☆

دونوں نے جلدی جلدی اپنا مختصر سا بوریا بند لپیٹا، اس کے بعد پرویز نے سدھوراں سے کہا۔ ”سدھوراں.....! تم ادھر ہی رہنا، دروازے پر مت آنا، میں ابھی لوٹا ہوں۔“

”تم..... تم کہاں جا رہے ہو اب؟“ سدھوراں نے کسی خیال کے تحت تفکر سے پوچھا۔

”میں ابھی آجاتا ہوں..... تم بالکل پریشان مت ہونا۔“ پرویز نے اسے تسلی دی۔

”آؤ دروازہ بند کرلو۔“ یہ کہہ کر وہ گھر سے باہر نکلا۔

گلی کے اختتام پر میدان سا تھا جس کے سرے پر قطار در قطار سبزی اور گوشت وغیرہ کی دکانیں تھیں..... پرویز بغور اس پاس کا جائزہ لیتے ہوئے گلی سے نکلا تو اسے میدان کے وسط میں وہی سبز رنگ کی بائی روف کھڑی نظر آئی جو انسپکٹر یاور حیات کی رہائش گاہ سے بدستور اس کے تعاقب میں یہاں تک آ پہنچی تھی..... اس میں سوار چاروں افراد اب باہر اتر کر

ادھر سانول اور ملوکاں بے خبر اپنی کوشری میں سو رہے تھے، رات اپنے پچھلے پہر میں داخل ہو چکی تھی، اچانک صحن کی ایک دیوار پہ سایہ لہرایا، یہ آچر خان تھا، اس کی کمر سے بندوق جھول رہی تھی، وہ جنگلی..... بلے کی طرح چند ثانے دیوار پر دبکا اندر صحن میں گھورتا رہا پھر میدان صاف دیکھ کر وہ اندر کود گیا، چند ثانے وہ دم بخود اپنی جگہ کھڑا رہا پھر سامنے والی کوشری کی جانب دبے پاؤں بڑھنے لگا..... کوشری کے دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحے کو رکا اور اپنی کمر سے بندوق اتار کر ہاتھ میں تھام لی پھر دوسرے ہاتھ سے اس نے دروازے کو ذرا اندر کی طرف دھکیلا..... دروازے کا ایک پٹ کھلتا چلا گیا، سامنے لائین کی مدہم لو میں اس نے چار پائی پر سانول اور ملوکاں کو بے خبر سوتے پایا تو جیسے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی، اس نے قہر آلود نظروں سے دونوں کی طرف دیکھا پھر یکدم بندوق دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر سیدھی کر لی۔

ادھر سارنگ اپنی کلباڑی سنبھالے سانول کے گھر کے باہر آن موجود ہوا اور گہری نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا، اسے وہاں کوئی مشکوک بات محسوس نہ ہوئی تب اس نے خاموشی کے ساتھ واپس لوٹنے کا ارادہ کیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ آچر خان ملک الموت کی صورت میں اندر قدم رکھ چکا تھا اور جو اپنی بندوق تانے سانول کے سینے کا نشانہ لئے ہوئے تھے، معانجانے کس طرح ملوکاں کی آنکھ کھل گئی، وہ آچر خان کو تو نہ پہچان سکی تاہم اس نے بیولے کی شکل میں کسی کو سانول پر بندوق تانے دیکھا تو اس کی چیخ نکل گئی..... سانول نے بھی فوراً آنکھیں کھول دیں، ادھر آچر خان نے بندوق کی لبلبی دبا دی، ادھر ملوکاں ایک ہذیبانی چیخ کے ساتھ سانول کی ڈھال بن گئی، دم بخود فضا میں ایک دھماکہ ابھرا اور ملوکاں لہو لہان ہو گئی، سانول فوراً خون میں لت پت ملوکاں کو اپنے اوپر سے ہٹا کر بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ چار پائی سے اٹھا اور آچر خان پر جست لگا لی..... آچر خان نے سنبھل کر سانول کا نشانہ لیتے ہوئے دوسرا فائر کیا، ایک اور کان پھاڑ دھماکا ہوا مگر اس وقت تک سانول، آچر خان کے سر پر پہنچ چکا تھا اور اس نے بڑی پھرتی کے ساتھ آچر خان کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بندوق کی نال اوپر کر دی تھی نتیجتاً کارتوس کے مہلک چھرے چھت کی چوبی کڑیوں میں پیوست ہو گئے..... سانول نے ایک زوردار گھونسا آچر خان کے جڑے پر رسید کیا، آچر خان کو اپنی داڑھ لپٹی ہوئی محسوس ہوئی مگر وہ بھی اتنی آسانی سے ڈھنسنے والا کہاں تھا، اس نے درد کی پروا کئے بغیر سانول کے پیٹ پر لات رسید کرنی چاہی مگر سانول پر اس وقت خون سوار تھا

کھڑے اس کی طرف دیکھ رہے تھے، پرویز یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ آیا یہ لوگ ہنوز ادھر ہی موجود تھے یا دفعان ہو چکے تھے تاہم پرویز اب جلدی واپس گھر لوٹ کر انہیں کسی تشکیک میں مبتلا نہیں کرن چاہتا تھا چنانچہ وہ بظاہر ان کی طرف سے لا پرواہ ہو کر ایک سبزی کی دکان پر پہنچا اور بلکی پھلکی خریداری کر کے وہ واپس اپنے گھر کی طرف لوٹ گیا۔

گھر آ کر اس نے سدھوراں کو بتایا۔ ”سدھوراں..... دشمن ابھی تک ہم پر نظر رکھے ہوئے ہے، یہ لوگ جب تک یہاں سے دفع نہیں ہو جاتے، ہم یہاں سے نکل نہیں سکتے۔“ سدھوراں کے چہرے پر گہری تفکیر کے آثار نمودار ہو گئے پھر اس نے اسی لہجے میں پرویز سے پوچھا۔ ”پرویز..... آخر کون لوگ ہیں یہ..... اور..... تم.....“

پرویز اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”یہ سارا چکر پولیس کا نہیں ہے سدھوراں.....!“ یہ کہہ کر پرویز نے اسے ساری حقیقت تفصیل سے بیان کر دی۔

سدھوراں بولی۔ ”پرویز..... ہمیں اس سلسلے میں ڈاکٹر فوزیہ سے ضرور مشورہ کر لینا چاہئے، مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ہماری پوری مدد کریں گی کیونکہ ایک بڑے پولیس افسر سے ان کی اچھی خاصی جان پہچان ہے۔“

پرویز اس کی بات سن کر چند ثانیے کسی پُر سوچ خاموشی میں مستغرق رہنے کے بعد بولا۔ ”نہیں سدھوراں..... اس طرح حالات مزید خراب ہو جائیں گے، میں اس کہنے ولد ار اور انسپکٹر یاور حیات کے خفیہ گٹھ جوڑ سے اچھی طرح واقف ہوں..... وہ دونوں پھر بھی ہمیں چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ شہر چھوڑ کر اندرون سندھ کے کسی دور پرے کے شہر میں چلے جائیں۔“

پرویز کی بات سن کر سدھوراں نے خاموشی اختیار کر لی مگر وہ پرویز کے اس اقدام سے پوری طرح متفق نہ ہوئی تھی۔

وقت، اندیشناک لمحوں کی اسرار بھری دھمک دیتا ہوا گزرنے لگا پھر تین چار گھنٹے اسی طرح گزر گئے تو پرویز گھر سے باہر نکلا، اس وقت رات کے آٹھ بجنے والے تھے، وہ سیدھا میدان کی طرف آیا تو اس نے سکون کا سانس لیا..... سبز رنگ کی وہ ہائی روف اب وہاں موجود نہ تھی پھر پرویز نے اچھی طرح تسلی کرنے کے لیے پورے محلے اور آس پاس کے علاقے کا ایک چکر لگایا، اس کے بعد اس نے ایک نیکی پکڑی اور اپنے گھر لوٹ آیا، اس کے بعد دونوں نے اپنا مختصر سا بور یا بستر سمیٹا، پرویز نے اپنا پستول قبضے میں کیا..... سدھوراں نے بچے کو اٹھایا اور اس کے بعد یہ دونوں گھر کو تالا لگا کر نیکی میں آ بیٹھے،

سدھوراں بچے کو گود میں لئے غنیمتی سیٹ پر بیٹھی جبکہ پرویز ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا پھر پرویز نے نیکی والے کو اٹھارہ اسکوائر چلنے کا کہا۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں سے مختلف کوچز اور لاریاں اندرون سندھ کی طرف چلتی ہیں اور یہاں ان کا آخری اسٹاپ تھا۔ اس کے بعد یہ ہمیں بغیر رکے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتی ہیں۔ یوں تو کینٹ اور صدر سے بھی لگژری کوچز چلتی تھیں مگر پرویز نے دانستہ ادھر کا رخ نہیں کیا تھا بلکہ اول تو اس کا ارادہ کسی لگژری کوچ میں سوار ہونے کا ہی نہیں تھا، وہ درحقیقت کسی عام سی مسافر لاری میں سوار ہونا چاہتا تھا، پرویز کا ارادہ جامشورو کے راستے دادو سے سہون کی طرف نکلنے کا تھا جہاں اس کا ایک دور پرے کا رشتہ دار رہتا تھا، وہ کھاد اور اناج کا کاروبار کیا کرتا تھا..... نیکی قیوم آباد کا چوک کر اس کر چکی تھی، پرویز بظاہر خاموش مگر ارد گرد سے محتاط ہو کر بیٹھا ہوا تھا، اسے بار بار یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی ان کا تعاقب کر رہا ہو، پسینہ سیٹ پر موجود سدھوراں کے دل میں بھی طرح طرح کے پُر اندیش خیالات اُٹھ رہے تھے..... بچہ اس کی گود میں ہمک رہا تھا۔ سدھوراں اپنے دل میں یہی دعائیں مانگ رہی تھی کہ خدا کرے وہ بچہ اور شوہر کے ساتھ جلد از جلد یہاں سے بخیر و عافیت نکل جائیں۔ نیکی کراچی کی گنجان شاہراہوں سے ہوتی ہوئی اپنی منزل کے قریب پہنچنے لگی تو ایک قدرے ویران جگہ پر اچانک عقب سے ایک گاڑی تیزی کے ساتھ ان کی نیکی کو کر اس کرتی ہوئی آگے کو نکلی اور پھر دوسرے لمحے ڈرا آگے جا کر ان کا راستہ روک کر سڑک پر ترچھی کھڑی ہو گئی، ڈرائیور نے فوراً بریک لگا دیئے۔ پرویز بھی بری طرح چونک کر اس سڑک پر کھڑی ترچھی گاڑی کو دیکھنے لگا، وہ سبز رنگ کی ہائی روف تھی، نیکی کے مائزرات کے سانے میں زور سے چرچرائے اور وہ ایک جھٹکے سے رک گئی، پرویز کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی، اس کی نظریں ہائی روف پر جم کر رہ گئیں، جب اس نے چار افراد کو بیک وقت ہائی روف سے نیچے اترتے دیکھا تو اس نے بھی جلدی سے اپنا پستول نکال لیا، وہ چاروں مسلہ نظر آ رہے تھے، نیکی ڈرائیور بھی بے چارہ اس اچانک صورت حال پر پریشان سا ہو گیا تھا، پرویز نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پستول سیدھا کر کے وند اسکرین سے ہی ان چاروں کا نشانہ لے کر یکے بعد دیگرے دو تین فائر جھونک مارے، وند اسکرین کا شیشہ کرچیوں کی صورت میں ٹکڑھ گیا، پستول سے شعلے ابھرے، چار افراد میں سے دو تیار کر گئے باقی یکدم واپس ہائی روف کی طرف آڑ لینے کو دوڑے، نیکی ڈرائیور خوف زدہ ہو کر اپنی طرف کا دروازہ کھولے بھاگ اٹھا، پرویز بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر سرک گیا اور پھر اس نے ایک جھٹکے سے نیکی آگے بڑھا

دائیں بائیں کا دروازہ کھول کر نیچے ریگ گئے تھے، پرویز نے ان پر باری باری دو فار جھونک دیئے مگر کوئی گولی نہ لگائی، پرویز نے بڑی پھرتی سے سامنے نظر رکھتے ہوئے اپنی جیب سے فاضل راؤ نڈنکا لے اور پستول کا میگزین فل کرنے لگا، اس دوران دشمنوں نے بیک وقت دوستوں سے برست داغے، ایک گولی جھاڑیوں کو چیرتی ہوئی پرویز کی ران میں پیوست ہو گئی، پرویز کو یوں لگا جیسے کسی نے گرم سلاخ اس کی ران میں گھسیڑ دی ہو، اس کے حلق سے چیخ خارج ہو گئی، سدھوراں ہراساں ہو گئی۔

”سس..... سدھوراں.....! ٹو بچے کو لے نکل جا..... میں دشمنوں کو روکے ہوئے ہوں۔“

سدھوراں دبل گئی۔ ”نہیں پرویز.....! میں تجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔“ سدھوراں نے دکھ کے کرب ناک احساس کے ساتھ کہا۔

پرویز جھلا کر ہوا۔ ”سدھوراں.....! مجھے کچھ نہیں ہوگا..... وقت ضائع مت کرورنہ کچھ نہیں بچے گا..... دشمن تجھے اور تیرے بچے کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

ٹھیک اسی وقت دوبارہ گولیوں کی بھیاں تڑتڑاہٹ ابھری اور پرویز کے حلق سے اذیت ناک چیخیں خارج ہو گئیں، اس کا دایاں شانہ دشمنوں کی گولیوں سے چھلنی ہو گیا تھا۔ سدھوراں، پرویز کو لہو لہان دیکھ کر چلا اٹھی۔

پرویز نے اپنی اذیت ناک تکالیف پر قابو پاتے ہوئے تین چار جوبائی فار داغ دیئے۔

”سدھوراں.....! تہ..... تجھے بچے کی قسم، بھاگ جا میری قربانی ضائع مت کر..... جا..... جا۔“ پرویز نے بمشکل سدھوراں سے کہا تو سدھوراں کے سینے میں دھواں سا بھرنے لگا، اس نے ایک گہری اور دکھ بھری گویا آخری نگاہ اپنے زخمی شوہر پر ڈالی اور پھر وہ آنسوؤں بھرے غمناک چہرے کے ساتھ بچے کو سینے سے لگائے تارکی میں دوڑ پڑی۔

پرویز اب زمین پر گر چکا تھا اور مسلسل دشمنوں پر فائرنگ کئے جا رہا تھا پھر اچانک وہ بے دم سا ہو کر زمین پر ڈھیرا سا پڑ گیا، پستول اس کے ہاتھ میں ہی دبا رہ گیا تھا۔ ادھر دونوں دشمنوں نے یہ سمجھا شاید پرویز مر چکا ہے پھر وہ دونوں فائرنگ روک کر اپنے دونوں ہاتھوں میں رائفلیں تانے محتاط روی کے ساتھ اس کی طرف بڑھنے لگے، وہ دونوں جیسے ہی پرویز کے قریب پہنچے، پرویز کے بے حس و حرکت وجود نے غیر محسوس جنبش لی اور اس نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پستول سے ان دونوں پر تلے اور تین چار فائرنگ کر ڈالے۔ تاروں

دی، عقب میں گولیوں کی بھیاں تک پوچھا رسائی دی مگر پرویز نیکی کو نکال لے جانے میں کامیاب ہو گیا، وہ اب اندھا دھند نیکی کو دوڑائے چلا جا رہا تھا، ارد گرد بے مکانوں کا سلسلہ اب بہت پیچھے رہ گیا تھا، بائی روف بھی مسلسل تعاقب میں دوڑی چلی آ رہی تھی، وہاں سے اکا دکا گولیاں بھی چلائی جا رہی تھیں، سدھوراں، پرویز کی ہدایت کے مطابق بچے سمیت سیٹ پر لیٹ گئی تھی، دونوں گاڑیاں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی ویران علاقے میں آ گئی تھیں۔ یہ سپر ہائی وے سے پرلی طرف کا ایک نیم پنڈہ ذیلی راستہ تھا، اب عقب سے متواتر فائرنگ ہونے لگی وفتا نیکی کا پچھا شیشہ دھماکے سے ٹوٹ گیا، عقبی سیٹ پر اپنے بچے کو سینے سے پیچھے دبا رکھی ہوئی سدھوراں کے حلق سے بے اختیار چیخ خارج ہو گئی، شیشوں کی ٹوٹیلی کرچیوں کی بارش نے اسے یکدم بوکھلا سا دیا تھا۔

”تم ٹھیک تو پہچانناں سدھوراں.....؟“ معا پرویز نے نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔

”ہاں.....! میں ٹھیک ہوں۔“ سدھوراں نے لرزتی آواز میں کہا۔

تب پھر اچانک نیکی کا پچھا ٹائر ایک دھماکے سے پھٹا، شاید پیچھے آنے والوں کی مسلسل فائرنگ کی کسی بھولی بھٹکی گولی کا یہ شاخسانہ تھا، ٹائر کے فلیٹ ہوتے ہی نیکی کا توازن بگڑ گیا اور وہ ایک طرف کو جھک گئی۔ پرویز پریشان ہو گیا، اس نے بمشکل گاڑی قریب کی خود رو جھاڑیوں میں روکی اور سدھوراں کو باہر اترنے کا کہا پھر وہ بڑی پھرتی کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ سامنے عقب میں اسے بائی روف کی ہیڈ لائٹس نظر آئی جو آندھی طوفان کی طرف دوڑتی ہوئی قریب تر آ چکی تھی اور اگلے ہی لمحے اس کے ٹائر زور سے مع خراش آوازیں چرچرائے تھے، پرویز نے اپنی گاڑی کی آڑ سے نشانہ لے کر فار جھونک مارا، بائی روف کی وند اسکرین ایک زوردار چھٹا کے سے ٹوٹی تھی، پرویز کو اگلی سیٹ میں صرف دو افراد کے ہیولوں کی جھلک دکھائی دی تھی تاہم اس کے فائر کرنے سے پہلے ان دونوں نے فوراً اپنے سر نیچے جھکا لئے تھے، اس دوران سدھوراں اپنے بچے کو سینے سے لگائے باہر نکل آئی تھی، پرویز کے پاس محدود تعداد میں فاضل راؤ نڈن تھا اس لیے اس نے دشمن کے سامنے ڈنرے رہنے کی بجائے فرار کی حکمت عملی پر عمل کیا اور پھر سدھوراں کا ہاتھ پکڑے تارکی میں دوڑتا چلا گیا۔

چند قدموں کے فاصلے پر یہ گنجان جھاڑیوں کا ذخیرہ تھا، وہ فوراً سدھوراں کو لئے اس کے عقب میں آ گیا، آرمیسر آتے ہی اس نے بائی روف کی طرف دیکھا، وہ دونوں دشمن

بائیں چنانچہ وہ بے چادی شکست خوردہ انداز میں رک گئی اور ہراساں ہر نی کی طرح متوحش نگاہوں سے اپنے عقب میں دیکھنے لگی تو اسے تاروں کی مدہم روشنی میں ایک رائفل بدست شخص اپنی طرف دوڑ کر آتا ہوا نظر آیا۔

سدھوراں اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی، اس کا دل خوف سے بری طرح دھڑ دھڑا رہا تھا، اتنے میں رائفل بدست دشمن اس کے قریب آ کر رک گیا، وہ اب قہر آلود نظروں سے سدھوراں پر اپنی رائفل تانے اسے گھور رہا تھا، سدھوراں کا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزہ بر اندام تھا۔

”چلو میرے ساتھ..... اگر تُو نے ذرا بھی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو تیرے شوہر پرویز کی طرح تجھے اور تیرے بچے کو بھی گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔“ وفتعا دشمن نے سفاک لہجے میں اسے حکم دیتے ہوئے کہا اور بے چاری سدھوراں، پرویز کے اس دنیا سے کوچ کر جانے پر بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو دی..... اسے روتا دیکھ کر دشمن غصے سے اس کے قریب آیا اور اس کے بال اپنی منہی میں جکڑ کر جھک دیتے ہوئے بولا۔ ”یہ رونا دھونا چھوڑ اور چل میرے ساتھ ورنہ.....؟“

سدھوراں خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی۔

دونوں تاروں بھری مدہم روشنی میں دم بخود ہونٹوں کی طرح آگے بڑھ رہے تھے۔ ہائی روف کے قریب پہنچ کر رائفل بدست نے اسے ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی نشست پر سوار کرایا اور پھر گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆=====☆=====☆

سانول اور سارنگ نے تاریک گلی کے اختتام پر ہی آچر خان کو پکڑ لیا۔ ”سارنگ.....! اس مردود کو لے چلو واپس..... ملو کاں کی حالت نازک ہے، اللہ سائیں خیر کرے۔“ سانول نے دکھ سے بھری بانہی ہوئی آواز میں کہا اور پھر آچر خان کو دبوچے یہ دونوں واپس گھر پہنچے تو ملو کاں اس جہان فانی سے کوچ کر چکی تھی، سارنگ نے اپنی بہن کو خون میں لت پت مردہ حالت میں دیکھا تو وہ غم و غصے سے پاگل ہو گیا تب اس نے آچر خان کو فرش پر دکھا دیا اور غضب ناک انداز میں اپنی کلباڑی بلند کر لی۔

مارے دہشت کے آچر خان اپنی جگہ بے حس و حرکت پڑا رہ گیا مگر سانول نے فوراً آگے بڑھ کر سارنگ کا کلباڑی والا ہاتھ پکڑ لیا۔

کی مدہم روشنی میں دشمنوں کو پرویز سے اس جان لیوا حرکت لی بالکل توقع نہ تھی نتیجتاً ایک نے تو خود کو فوراً بجالیا جبکہ دوسرے کا پیٹ چھلنی ہو گیا اور وہ بھیانک آواز نکال کر زمین بوس ہو گیا جبکہ اس کے دوسرے ساکھی نے پرویز پر پورا برست فائر کر دیا، پرویز حلق سے آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔

اس کی روح نفسِ معصی سے پرواز کر چکی تھی۔

☆=====☆=====☆

سدھوراں اپنے بچے کو سینے سے لگائے ایک ویرانے میں دوڑی چلی جا رہی تھی، اس کی کوئی منزل نہیں تھی، کوئی پناہ نہیں تھی بس صرف ایک اندھی سمت تھی اور وہ تھی۔ اس کے سر کی چادر کھسک چکی تھی اور پاؤں جوتوں سے بے نیاز ہو چکے تھے، اس کی سانس بے تحاشا پھولی ہوئی تھی، وہ دوڑتے دوڑتے بے حال سی ہو رہی تھی لیکن اس نے دوڑنا ترک نہیں کیا تھا، جب ایک مقام پر وہ گرتے گرتے پکی تو اس کا دم بے دم ہو چکا تھا، وہ گر پڑنے کے ڈر سے ڈرا رک گئی اور اپنی سانسیں بحال کرنے لگی، اس نے عقب میں دیکھا تو اسے پڑ ہول تاریک سناٹے کے سوا کچھ نہ دکھائی دیا، حواس ذرا بحال ہوئے تو اس نے راستے کا تعین کرنے کی سعی کرتے ہوئے سوچا کہ وہ جس اندھی سمت میں دوڑ رہی تھی، وہ اسے ویرانوں کی طرح بھٹکا سکتی تھی چنانچہ اس نے بڑی اور پختہ سڑک کا تعین ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی سمت تبدیل کی اور پھر سیدھے رخ پر دوڑنے کی بجائے اس نے اب تیز تیز قدموں سے اپنی بائیں سمت چلنا شروع کر دیا پھر وفتعا اسے اپنے عقب میں گولیوں کے برست چلنے کی خوفناک گرج سنائی دی، اس کے حلق سے غیر ارادی چیخ خارج ہو گئی اور پھر اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک بار پھر اندھا دھند دوڑنا شروع کر دیا تب اسے چانک یہ جاں گسل احساس ہوا کہ کوئی اس کے تعاقب میں دوڑا چلا آ رہا تھا جو یقیناً اس کے دشمن کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اچانک اسے اپنے عقب میں کسی کی بانہی ہوئی بلند غراہٹ سے مشابہہ للکار سنائی دی۔

”رک جاؤ لڑکی.....! ورنہ میں گولیوں سے تمہارا وجود چھلنی کر دوں گا..... تم میرے نشانے پر ہو۔“ اس آواز کے ساتھ ہی عقب سے دوبارہ گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری اور سدھوراں کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آن اٹکا اور وہ اس ڈر سے رک گئی کہ تعاقب میں آنے والے دشمن کہیں اسے اور اس کے معصوم بچے کو اپنی بربریت کا نشانہ نہ

ایک لمحے کو سدھوراں کے جی میں یہ جارحانہ خیال ابھرا کہ وہ فوراً اس کی رائفل پر قبضہ جمانے کی کوشش کرے مگر وہ اپنے معصوم بچے کی وجہ سے اس جارحانہ اور خطرناک خیال سے گزریاں رہی چنانچہ سردست اس نے خود کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ بالکل ہاتھ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اسے کہاں اور کس کے پاس لے جایا جا رہا تھا، بچہ اس کی زنجیر بنا ہوا تھا اور خود سدھوراں کی اپنی عزت اس کے لیے خطرہ بنی ہوئی تھی، وہ دل ہی دل میں آنکھیں موندے اللہ سے اس مشکل گھڑی سے نجات پانے کی دعائیں کرنے میں مصروف ہو گئی، عزت اور بچہ.....! اس وقت دونوں ہی اس کی مجبوری تھے۔

ہائی روف پوری رفتار سے دوڑی چلی جا رہی تھی، وہ اب ویران اور بنجر علاقے سے نکل کر شاہراہ عام پر آ کر ٹریفک کے روشن سیلاب میں دوڑنے لگی پھر مزید گھٹنے بھر کی مسافت کے بعد ہائی روف ایک متمول علاقے میں داخل ہو گئی، یہاں ہر سو گہرا سناٹا طاری تھا، سدھوراں اس علاقے کو پہچان کر دھک سے رہ گئی، یہی تو وہ نو تعمیر شدہ مکانات اور بنگلوں کا علاقہ تھا جدھر اس شیطان صف انسپکٹر یا در حیات کی نئی رہائش گاہ تھی۔

ہائی روف ایک نو تعمیر شدہ بنگلے کے گیٹ پر پہنچ کر رک گئی، دشمن نے جلدی جلدی دو تین بار ہارن بجایا تو ذرا ہی دیر بعد ایک چوکیدار نے گاڑی اور گاڑی والے کو پہچان کر گیٹ وا کر دیا، ہائی روف ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور اندر داخل ہو گئی، سدھوراں کی کپٹنیاں اندیشناک وسوسوں کے مارے سائیں سائیں کرنے لگیں اور دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح دھڑکنے لگا۔

ہائی روف اندر پور ٹیکو میں جا کھڑی ہوئی۔

اس بد معاش قاتل نے ایک بار پھر ہارن بجایا اور پھر سدھوراں کو درشت لہجے میں اترنے کا کہہ کر خود بھی اپنی طرف کا دروازہ کھولے نیچے اتر آیا، ناچار سدھوراں بھی لرزتی کانپتی ہوئی نیچے اتر آئی، مسلح چوکیدار بد معاش کے قریب آیا تو اس نے چوکیدار سے پوچھا۔
”صاحب کیا کر رہا ہے۔“

”وہ تو آرام کر رہے ہیں۔“ چوکیدار نے کھردرے لہجے میں کہا۔

بد معاش کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”اچھا ٹھیک ہے..... اس چھو کمری کو پچھلے کمرے میں لے جا کر بند کر دو..... میں صاحب سے ملتا ہوں جب تک.....“

چوکیدار نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر سدھوراں کو بازو سے پکڑ کر بنگلے کے بعد ترین

”نہیں سارنگ.....! اس مردود کے غلیظ خون سے اپنے ہاتھ مت خراب کر.....“
”نہیں سانول.....! اس کتے نے میری معصوم بہن کا قتل کیا ہے، میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا، تو پرے بٹ جا بھرا.....!“ سارنگ شدت غیظ و غضب سے دھاڑا مگر سانول نے سارنگ کے ہاتھوں سے کسی طرح کلباڑی چھین لی۔

”بوش کر سارنگ.....! ہم اسے پولیس کے حوالے کر دیں گے، کیا اس کو مار کر تو پھانسی چڑھے گا؟“ سانول نے ایک بار پھر اسے سمجھایا اور پھر غصے سے آچر خان کو گھورتے ہوئے گریبان سے کھینچ کر کھڑا کر دیا اور وہ اسے تھانے کی طرف لے چلے۔

تھانے پہنچے تو ڈیوٹی پر متعین ایک سپاہی نے آچر خان کو اس حالت میں دیکھا اور پھر سانول اور سارنگ کی زبانی آچر خان کے قتل کی واردات میں رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر فوراً حرکت میں آیا اور اپنے دو ساتھی سپاہیوں کی مدد سے پہلے آچر خان کو جھکڑیاں لگا دیں پھر ایک سپاہی تھانے کے احاطے میں ہی بنے کوارٹر میں محو استراحت انسپکٹر چھٹل شاہ کو خبر دینے چلا گیا۔

ذرا دیر بعد سانول اور سارنگ، انسپکٹر چھٹل شاہ کے سامنے اپنے بیانات قلمبند کروانے لگے۔ ”اب اس مردود کو پھانسی کے پھندے سے کوئی نہیں بچا سکتا، میں خود کل عدالت لے جا کر اس کا ریمانڈ لے کر رہوں گا۔“ بیانات مکمل کرنے کے بعد انسپکٹر چھٹل شاہ نے دانست پیٹے ہوئے کہا۔

☆=====☆=====☆

وہ بد معاش، سدھوراں کویر غمال بنائے اپنی ہائی روف میں اڑا جا رہا تھا۔

سدھوراں اپنے بچے کو سینے سے لگائے مضطرب سی برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھی، اپنے شوہر پرویز کے قتل کا سن کر اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہے چلے جا رہے تھے، اس کا چہرہ غم و اندوہ کی تصویر بنا ہوا تھا، وہ بار بار کن آنکھوں سے اپنے ساتھ بیٹھے دشمن کو دیکھ رہی تھی اور اس کے دل میں اس کے خلاف نفرت کی چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں کیونکہ اسے اس کی زبانی اس کر بناک حقیقت کا علم ہوا تھا کہ اس بد بخت نے اس کے شوہر پرویز کو قتل کر دیا ہے اور غم و اندوہ میں مبتلا ہونے کے باوجود سدھوراں کا دل اس مردود خونخوار قاتل کے لیے نفرت و انتقام کے مارے جل رہا تھا۔ سدھوراں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے قاتل اس مردود کا خون پی جائے، دشمن کی رائفل اس کے قریب ہی سیٹ کے ساتھ کی ہوئی تھی۔

کراچی کے بارے میں سن رکھا تھا کہ وہ بڑا مہربان شہر ہے، اس کی آغوش وسیع تھی جس کی بھائی میں کھو کر انسان سب کچھ بھول جایا کرتا ہے۔ پھر وہ کراچی جانے کے ارادے سے ایک مسافر لاری میں سوار ہو گیا۔

لگ بھگ کوئی دو تین گھنٹوں کے بعد وہ کراچی جیسے بھرے پُرے شہر میں داخل ہو چکا تھا، یہاں آ کر اسے عجیب سا احساس ہونے لگا، اسے یوں لگا جیسے یہاں اس کا کوئی اپنا بھی موجود تھا، کوئی ایسا اپنا شخص، ایک ایسی ہستی جسے اس نے دل سے چاہا تھا، ایک بے چینی تھی جو اسے بے کل کئے دے رہی تھی، وہ پھر جیسے بے سرو سامانی کے عالم میں بے مقصد مصروف شاہراہوں میں آوارہ گردی کرنے لگا۔

☆=====☆=====☆

سدھوراں کی اچانک آنکھ کھلی، کمرے کے روشن دان سے سورج کی تیز روشنی اندر داخل ہو رہی تھی، وہ ٹپ کر یکدم اٹھی، قریب ہی لیٹے اپنے سوتے ہوئے بچے کو اٹھایا تو وہ کسما کر جاگ اٹھا اور رونے لگا، سدھوراں نے اسے فوراً سینے سے لگا لیا۔

سریا اس کے قریب ہی رکھا ہوا تھا، بچے کو دودھ پلانے کے دوران اس نے کمرے کے بعد دروازے کی طرف دیکھا، تھوڑی دیر اسی طرح گزر گئی تھی کہ معاً دروازے پر آہٹ ہوئی، سدھوراں کا دل یکبارگی زور سے ہلکے لگا، وہ فوراً اٹھی تو اس کے ہاتھ میں سریا تھا، وہ جلدی سے لپک کر کاٹھ کباڑ کے بیچ میں چھپ کر بیٹھ گئی اور اوٹ سے اس نے دروازے کی طرف نظریں جمادیں، اس نے نہایت آہستگی سے اپنے بچے کو فرش پر ڈال دیا تھا، وہ معصوم ان کڑے حالات سے بے خبر اپنے ننھے منے ہاتھوں، پیروں کو ہلا جلا رہا تھا، سدھوراں نے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ آہنی سریا مضبوطی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا پھر اچانک اس نے دیکھا کمرے کا دروازہ ہلکی جڑ چاہٹ کے ساتھ کھل گیا اور دوسرے ہی لمحے وہ ایک شخص کو اندر آتا دیکھ کر بری طرح ٹھک گئی، یہ دلدار تھا، وہی منہوس شخص جس نے اس کی اچھلی بھلی زندگی کو اجاڑ کر رکھ دیا تھا اور ہستی بہستی زندگی کڑے موسموں کی زد پر آچکی تھی، دلدار تھا، وہ حیرت اور الجھن آمیز متلاشی نظروں سے دائیں بائیں گردن موز کر دیکھنے لگا۔

پھر جب وہ مزید اندر آیا تو سدھوراں ہمت کر کے محتاط روی سے کاٹھ کباڑ کی آڑ لیتی ہوئی اچانک اس کے عقب میں نمودار ہوئی اور اپنے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے

گوشتے میں ایک استور نما کمرے میں لے آیا اور پھر اسے اندر بند کر دیا۔

اندھ گھپ اندھیرا تھا، سدھوراں کو یہاں وحشت سی ہونے لگی، اس نے کسی طرح اپنے ایک ہاتھ کی مدد سے سوچے بورڈ کو ٹوٹا اور کمرے کی بتی جلا دی، کمرے میں جانے کیا کیا کچھ کباب کھرا ہوا تھا، سدھوراں کا ویسے ہی تھکن سے برا حال تھا، وہ وہیں گندے فرش پر ایک خالی کونے میں بچے کو لے کر بیٹھ گئی، بچے نے رونا شروع کر دیا، سدھوراں نے ایک ممتا بھری پریشان کن نگاہ اپنے روتے ہوئے بلکان بچے پر ڈالی اور پھر اسے اپنے سینے سے لگا لیا، اس کے دل و دماغ میں طرح طرح کے پریشان کن وسوسے سر اٹھانے لگے، وہ اس منہوس بچے کو پہچان چکی تھی، یہ اس مردود اور عیاش انسپکٹر یاور حیات کا ہی بگڑا تھا جہاں وہ پہلے بھی ایک بار قید ہو چکی تھی، اس وقت اس کے ہمراہ پرویز بھی تھا پھر وہ دونوں انسپکٹر یاور حیات اور دلدار کی قید سے فرار ہو گئے تھے، پرویز کا خیال دل میں آتے وہ رنجوری ہو گئی اور فرط غم سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ اپنے بچے کی خاطر جینا چاہتی تھی اور چاہے جیسے بھی حالات ہوں، وہ ان سے بے دھڑک ٹکرا جانے کے لیے خود کو تیار کر چکی تھی، بچہ سو چکا تھا، سدھوراں نے گہری نظروں سے اس پاس کا جائزہ لیا پھر وہ اٹھ کر دروازے کی طرف آئی، اسے ہلکا سا کھینچ کر دیکھا تو حسب توقع اسے باہر سے بند پایا، وہ ایک گہری سانس لے کر واپس پلٹی، ننھے سے بچے کو اس نے زمین پر لٹا دیا تھا، خود وہ کاٹھ کباڑ سے کوئی کتہہ ڈھونڈنے لگی، جلد ہی اسے ایک سریا نما ایک میڑھی میڑھی سلاخ نظر آ گئی، اس نے لپک کر اسے کھینچ کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لی، اب وہ کسی کے اندر آنے کی منتظر تھی۔

کافی دیر گز گئی کوئی اندر نہ آیا تو سدھوراں اپنے بچے کے قریب ہی بیٹھے بیٹھے سو گئی۔

☆=====☆=====☆

ملوکان کی تدفین کو آج آٹھواں روز تھا، سانول کو اب اپنے بھائیں بھائیں کرتے گھر سے وحشت سی ہونے لگی تھی بلکہ اس کا تو اب پورے گوٹھ سے ہی دل اچاٹ ہو چکا تھا، اب تو ماما اندر رکھو رہا تھا اور نہ ہی ملوکان.....! سانول کا یہاں کوئی بھی تو نہ رہا تھا سوائے غناک اور دکھ بھری یادوں کے جو بروقت اس کی آئینی تہائیوں میں اسے دستی رہتی تھیں۔ پھر ایک دن یوں ہوا سانول نے اپنا مختصر سا سامان سمیٹا اور خاموشی سے اس گوٹھ کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

وہ شہر جانے والی شاہراہ پر آن کھڑا ہوا تھا، اس وقت صبح صادق تھی، سانول نے

اس نے سانول کو دیکھ لیا تھا، پہلے تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس نے نیکیسی والے کو رکنے کا کہا اور پھر خود جلدی سے اتر کر دور جاتے ہوئے سانول کو دیوانہ وار پکارتی ہوئی فٹ پاتھ پر دوڑ پڑی، ادھر سانول بھی رک گیا، اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے اس کی پچھڑی ہوئی، صدیوں سے پچھڑی ہوئی کائنات دوڑی چلی آ رہی ہو۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے، سانول کو سدھوراں سے جو شکوہ تھا، کڑے حالات کی مجبوری نے دونوں پچھڑے ہوئے دلوں کو بالآخر سمجھوتے پر مائل کر دیا تھا، سانول نے نیکیسی والے کو کرایہ دے کر فارغ کیا، سدھوراں نے جلدی جلدی اسے اپنے خطرناک حالات کے بارے میں آگاہ کیا تو سانول کو پھر یہ شہر بھی نامہربان محسوس ہونے لگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد دونوں نے ہمیشہ کا ساتھ نبھانے کے لیے اس شہر کو خیر باد کہنے کا آخری فیصلہ کر لیا۔

وہ دونوں اب نامعلوم منزل کی طرف بڑھ چکے تھے، انہیں یقین تھا کہ وہ نامعلوم منزل ان کے لیے خوشیوں اور راحت کا باعث ہوگی جہاں پھر کوئی غم، کوئی خوف اور ڈر نہ ہو گا، بس خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی اور وہ ہوں گے۔

☆=====ختم شد=====☆

ہوئے پہنچے سرینے کی بھرپور ضرب اس کے سر کے پچھلے حصے پر رسید کر دی، دلدار کے حلق سے وحشانہ چیخ ابھری اور وہ لڑکھڑاسا گیا، اس نے ڈمگاتے قدموں سے اپنا خون آلود سر تھام لیا مگر سدھوراں پر تو اس وقت ہسٹریائی جنون سوار تھا، وہ انتقام کے جذبے سے مغلوب ہوئی جا رہی تھی، اس نے پھر اوپر تلے تین چار ضربات کے ساتھ دلدار کا سر کھول کر رکھ دیا۔ دلدار کے ہوئے شبیر کی طرح زمین پر ڈھیر ہو گیا، اس کے سر کا کچھ مرگل چکا تھا، سدھوراں کا جنون کم ہوا تو اس نے فوراً موقع سے فائدہ اٹھایا اور لپک کر اپنے بچے کو گود میں لے لیا پھر دلدار کے بے سدھ پڑے کپڑوں کی تلاشی لی تو حسب توقع اس کی جیب سے ایک سیاہ نال والا خوفناک پستول نکل آیا، آتشیں ہتھیار کے ہاتھ میں آتے ہی سدھوراں کا دل اور بڑھ گیا، وہ ایک ہاتھ سے اپنا بچہ سنبھالے اور دوسرے ہاتھ میں پستول لئے کمرے سے نکلی تو ٹھٹھک کر رک گئی، سامنے بنگلے کے وسیع احاطے میں اسے انسپکٹر یاور حیات سادہ لباس میں آتا ہوا دکھائی دیا، اس کے ہمراہ رات والا وہی بد بخت قاتل بھی تھا جس نے پرویز کا قتل کیا تھا، اس کی کمر سے ابھی تک رائفل جھول رہی تھی، وہ دونوں سدھوراں کو دیکھ کر چونک کر کے پھر جیسے ہی اس بد معاش قاتل نے اپنی رائفل سنبھالنے کی کوشش کی، سدھوراں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پستول سے دو تین تلے اوپر فائر کر ڈالے، تینوں گولیاں اس قاتل بد معاش کے سینے میں پیوست ہو گئیں اور وہ کریمہ انگلیز چیخ کے ساتھ زمین بوس ہوتا چلا گیا۔ انسپکٹر یاور حیات کے چہرے پر یکایک موت کی زردی چھا گئی، سدھوراں نے اسے لاکار۔ ”خبردار.....! اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ تیرا بھی یہی حشر کروں گی۔“

اس نے یکدم اپنے ہاتھ فضا میں بلند کر دیئے، اس اثناء میں دھماکوں کی آوازیں کر چوکیدار بھی وہاں آ گیا تو سدھوراں نے اسے بھی دھماکا کر دونوں کو دیوار کے ساتھ لگ جانے کا حکم دیا، وہ دونوں سدھوراں کا بلا چوں چراں حکم ماننے پر مجبور تھے پھر سدھوراں نے ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی اور بنگلے کے گیٹ کو باہر سے بند کر دیا پھر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کو ایک طرف پھینکا اور دیوانہ وار اپنا بچہ سنبھالے دوڑ پڑی پھر جلدی ہی اسے ایک نیکیسی مل گئی، وہ اس میں سوار ہو گئی، نیکیسی والے کو اس نے فی الحال یہاں سے نکلنے کا حکم دیا۔

نیکیسی والا کوئی بھلا مانس تھا، وہ اس کی مجبوری سمجھ کر اپنی نیکیسی کو دوڑاتا ہوا مصروف شاہراہ پر لے آیا، دفعتاً سدھوراں کی نگاہ فٹ پاتھ کے کنارے ایک شخص پر پڑی تو جیسے وہ دوبارہ زندہ ہو گئی۔